چہرے کا نور، دل کا سرور

بچے یہ تحفہ پاکر نہال ہو جاتے ہیں۔ رُوح افزا انہیں جی جان سے عزیز ہے

بے مثل ذائقے اور بے مثال تاثیر والا رُوح افزا بچوں اور بڑوں کو یکساں مرغوب ہے۔
یہ دل کو ٹھنڈک اور رُوح کو راحت پہنچاتا ہے۔ رُوح افزا ہماری ثقافت کا آئینہ دار مشرقی روایات کا حصہ اور ذوقِ لطیف کے حامل ہر شخص کا پسندیدہ مشروب ہے۔

پوٹھوہار کے حُسن سے کون انکار کرسکتا ہے!
بلاشبہ ہم بھی اسی حُسن کا ایک حصّہ ہیں۔
آپ کی خدمت
ہماری عظمت
راول ہوٹل
مکمل ایئرکنڈیشنڈ
فون: ۷۰۱۲۱۰، ۵ لائنیں
Rawal Hotel
ہوٹل اسکوائر مری روڈ
راولپنڈی

پاکستان آرڈیننس فیکٹریز

دفتر مینیجنگ ڈائریکٹر مین فیکٹری واہ کینٹ

ٹینڈر نوٹس

زیر دستخطی کو (نام نہیں) حسب ذیل آئیٹموں کی فراہمی کے لیے سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں جو کہ ۸ رجون ۱۹۸۲ء کو بوقت گیارہ بجے جنرل مینجر پروڈکشن پلاننگ اینڈ کنٹرول / ریننز کے دفتر میں کھولے جائیں گے۔

نمبر شمار	تفصیل	مطلوبہ تعداد
(۱)	ایگزاسٹ فینز (اے) سویپ ۴۶۰ ایم ایم (۱۸") (بی) آر پی ایم ۔ ۲۸۰۰ کم از کم	(۱۰)
(۲)	واٹر کولر ۵۰ ۔۱ لٹرز جو کہ حسب ذیل پر مشتمل ہو (اے) کنڈیشننگ یونٹ ۔ ریفریجریشن سسٹم ہرمیٹیکلی (HER MATICAILY) سربمہر معہ فری ان (FREON) ۱۲ ریفریجریٹر ۔ (بی) تھرموسٹیٹ مع ایڈجسٹمنٹ ۴۵ ایف سے ۶۵ ایف تک (۲۰ سی سے ۱۸ سی تک)	(۱)
(۳)	بریکٹ فینز (اے) سویپ ۶۱۰ ایم ایم (۲۴")	(۸)
(۴)	ائر کنڈیشنرز (ونڈو ٹائپ) (کولنگ گنجائش ۱۸۰۰۰ بی ٹی یو گھنٹہ ۲ یونٹس ریورسیبل سائیکل رکھتے ہوں)	(۶)
(۵)	سیلنگ فینز (اے) سویپ ۱۲۲۰ ایم ایم (۴۸")	(۶)

نوٹ:۔ تمام ایکوپمنٹ ۲۲۰ / ۲۳۰ وولٹس ۵۰ سائیکلز / سیکنڈ اے سی پر کام کرنے کے قابل ہونے چاہئیں۔

شرائط: (۱) ٹینڈرز سربمہر لفافوں میں ارسال کیے جائیں جن کے اوپر واضح الفاظ یعنی بڑے حروف میں ٹینڈر مورخہ ۸ رجون ۱۹۸۲ء کو کھولے جائیں گے کہا (۲) ایکوپمنٹ لازمی طور پر متذکرہ بالا تصریحات کے مطابق ہونے چاہئیں (۳) پیش کشیں ٹینڈر کھلنے کی تاریخ سے کم از کم ۶۰ دنوں کے عرصے تک قابل عمل ہونی چاہئیں۔ (۴) ایکوپمنٹس کی قیمتیں ایف او آر واہ کی اساس پر ہونی چاہئیں اور مقامی کرنسی میں درج کی جائیں (۵) پیش کش کو بلا اظہار وجہ منظور یا مسترد کرنے یا ٹینڈر کو ایک سے زیادہ ٹھیکیداران میں تقسیم کرنے کا اختیارات محفوظ ہیں۔ (۶) سب سے کم قیمت پیش کش کو منظور کرنا ضروری نہیں۔ (۷) ٹینڈرز کے ہمراہ پیش کردہ پروڈکٹ کا ٹیکنیکل ڈیٹا شیٹس / السٹریٹڈ پمفلٹس آنے چاہئیں۔ (۸) دو سالہ رننگ کے لیے مینٹی ننس سپیئرز بہر صورت آئٹم کی ترتیب سے قیمتیں درج کی جائیں (۹) ساخت ملک مینوفیکچررز نام اور برانڈ اگر ہو تو ہر ایک آئیٹم کے سامنے درج کیا جائے (۱۰) الیکٹریکل ایکوپمنٹ ٹراپیکل کنڈیشنز کے تحت ایک معتدل ٹیمپریچر آف ۱۲۰ ایف تک کام کرنے کے لیے موزوں ہونے چاہئیں۔

عبدالحلیم

پی آئی ڈی سی اسلام آباد ۱۸۱/۳۶۳   جنرل مینجر پروڈکشن پلاننگ اینڈ کنٹرول / ریننز

بانی: حکیم محمد یوسف حسن

ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی

جلد ۵۸ ********* شمارہ ۶۵۵

جون سنہ ۱۹۸۲ء

مدیر ـــــ سلطان رشک

قیمت ـــــ پچیس روپے

مراسلت کیلئے!

۸، محمدی مارکیٹ نرنکاری بازار راولپنڈی - فون ۷۰۱۹۱-۷۰۴۸۹-۷۳

فہرست

سلطان رشک

معاشرے کی رہنمائی اور راست سمت کی نشاندہی ادیب کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری شعر، افسانے اور ادب کی کسی بھی صنف کے حوالے سے پوری کی جا سکتی ہے۔ رہنمائی سے ہماری مراد مجموعی کردار سازی اور اجتماعی مفاد کی نگہداشت ہے اور راست سمت سے ہمارا مطلب نظریات کی پرورش اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت ہے۔ یہاں کہہ لیتے ہیں کہ پاکستانی ادیب اور دانشور موجودہ بین الاقوامی حالات و مسائل میں اپنا کردار کیسے متعین کرتے ہیں مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ ادیب نہ جانے کن اداسیوں، کن سوچوں اور کن مشکلات میں بکھرا ہوا ہے کہ اس نے اپنے کمرے کے دریچے بند کر لئے ہیں تازہ ہوا کا گذر مشکل ہو رہا ہے، نئی دانش اور اس کے اثرات کے تحت ہمارا ادیب تخلیقی محاذ پر اتنا پُرکس، باخبر اور ترو تازہ نہیں جتنا اُسے ہونا چاہیئے —— یہ بات تشویشناک بھی ہے اور افسوسناک بھی اس کے ساتھ ساتھ ابہام پسندی اور نامانوس علامت نگاری کا رُجحان بڑھ رہا ہے

ادیبوں کی نئی نسل اپنے مقام اور مرتبے اور حقوق سے آگاہ بھی ہے اور اُس کے لئے واویلا بھی کرتی ہے ذرائع ابلاغ کی آسانیوں نے انہیں جلد شہرت کے رستے پر بھی لگا دیا ہے مگر نئی نسل اُس ریاض اور مشقِ مطالعہ سے نہیں گذر رہی جس میں مبادیاتِ فن کی عبادت سمجھ کر سیکھا اور پڑھا جاتا ہے اور یہی بات اُن کے تابناک مستقبل کے راستے میں بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ سینئر ادیب سمتوں اور راستوں کا تعین کر کے رہنمائی کا فریضہ ادا کریں اور نئی نسل اپنے حقوق کے ساتھ فرائض بھی پہچانے۔

سالنامہ ۸۲ء

آپ کے مطالعے کے لئے حاضر ہے کوشش کی گئی ہے کہ "نیرنگِ خیال" اپنی تابندہ روایت کو برقرار رکھنے، زندگی کو حسن بخشنے والا اور زندگی کے کام آنے والا ادب پیش کر سکے مرصلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

اشاعت میں باقاعدگی

۱۹۸۱ء میں نیرنگِ خیال کے بارہ شمارے شائع ہوئے اور امسال اب تک چھ۔ ہم عجز و فخر کے ساتھ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جبکہ بڑے تجارتی شہروں سے شائع ہونے والے ادبی رسالے بھی اپنی باقاعدگی برقرار رکھنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ ہمارا باقاعدگی کی طرف لوٹ آنا ہماری محنت آپ کی توجہ اور صرف اللہ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ دُعا کیجئے ہم اس کام کو اسی دیانتداری اور محنت سے کرتے رہیں۔

ضمیر نمبر

ہم نے اُردو کے باکمال مزاح نگار ادیب اور شاعر ضمیر جعفری پر ایک پُروقار نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا ہوا ہے اور ہم عملاً اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ بہت سا مواد کتابت ہو گیا ہے ہمیں توقع ہے کہ ہم اس نمبر کی اشاعت کی حتمی تاریخ کا اعلان جلد کر سکیں گے۔

اظہارِ تشکر

اس خصوصی شمارے کو جن ادیبوں اور شاعروں کی زرنگار تحریروں سے مزین کیا گیا ہے ہم اُن میں سے ہر ایک کے فرداً فرداً ممنون ہیں اُن کا تعاون اور اُن کی بصیرت ہمارے راستے کی مشعل اور ہماری کامیابی کی ضمانت ہے

نہ ہے مجھ میں تابِ مقال ہی نہ بلند میرے خیال ہی
کہ ہو وصفِ رحمتِ بیکراں میں کہاں یہ اَوجِ ظرف کہاں
مرا حوصلہ نہ مجال ہی

بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ

یہ نبیؐ پاک کا نام ہے کہ درود جس پہ مدام ہے
یہی نام راحتِ قلب ہے یہی زندگی کا پیام ہے
یہ پیام جس کو مٹا سکا نہ زمانہ، وقت نہ سال ہی

حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ وآلہ

کہیں شاخِ کُن فیکون ہلی چمنِ جہاں کی کلی کھلی
یہ ظہورِ قدس کی منزلت کہ جسے نگاہِ کرم ملی
نہ اُسے کمال کی خواہشیں نہ ہے کوئی خوفِ زوال ہی

بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ

شہِ دیں شہنشہِ انبیا وہ محمدؐ احمدؐ و مصطفےٰ
دلِ پاک مہبطِ نورِ حق تھی کی صفت بشری بقا
انھیں مرتضیٰ ہی سمجھ سکے انھیں پا سکا تو بلال ہی

کشف الدجیٰ بجمالہ
صلوا علیہ وآلہ

غالبِ خستہ کے بغیر ......

کرنل محمد خان

۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تو جناب حکیم محمد سعید نے ایک سالم شام ہمدرد مرزا نوشہ کی نذر کی۔ اس تقریب کے مقرر جناب سید ضمیر جعفری تھے جنہوں نے حسبِ معمول غالب پر ایک حسین و جمیل مقالہ پڑھا۔ کرنل محمد خان کے ذمے کلماتِ افتتاحیہ تھے جو درج ذیل ہیں۔ (ادارہ)

غالب نے کہا تھا

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

لیکن اگر آج غالب آ کر دیکھیں تو انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ سچ مچ نہ ہوتے تو آج بیسیوں کام بند ہوتے۔ ایک تو یہیں پنڈی میں شامِ ہمدرد کا کام اٹک جاتا۔ پشاور سے چاٹگام تک تمام یونیورسٹیوں اور ادبی انجمنوں کا بازار سرد ہو جاتا جو ہفتے ہفتے کی لمبی تقریبیں منا رہے ہیں اور وہ محض اس لیے کہ آج سے ایک سو سال پہلے ایک شخص بنام غالب ہو گزرا ہے۔ دلی میں لالہ بھائیوں کا کام رک جاتا جو ہندی پرست ہونے کے باوجود اردو پرست غالب کی برسی منا رہے ہیں۔ اور تو اور لندن، نیویارک، روم اور ماسکو بھی زار زار رو رہے ہیں کہ غالبِ خستہ کے بغیر ان کے کام بھی چالو نہیں رہ سکتے۔

میرے خیال میں مرزا کا یہ شعر دنیا کی عظیم ترین کسرِ نفسی ہے ورنہ آپ سب جانتے ہیں اور غالباً غالب بھی جانتے تھے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو ہماری ادبی متاع سے ایک کوہِ نور کم ہو جاتا۔ مرزا نہ ہوتے تو ہمارے ادبی ارتقا کو اقبال تک پہنچنے کے لیے ایک اور صدی کی ضرورت ہوتی۔ غالب کے بغیر شاید حالی حالی نہ ہوتے اور اقبال اقبال نہ ہوتے اور بعد میں ان تمام چھوٹے بڑے شاعروں اور ادیبوں کا کام بھی ایسا رواں نہ ہوتا جن کا قلم غالب کے کلام سے نادانستہ کسبِ فیض کرتا ہے ——— اور غالب کے بغیر اس خاکسار کا کاروبار تو شروع ہونے سے پہلے ہی ٹھپ ہو جاتا کہ ہماری تحریروں کا نصف سے زیادہ خام مال غالب کے کارخانے سے آیا ہے۔

بلکہ میں سوچتا ہوں کہ فقط ادبی انجمنوں، شاعروں اور ادیبوں ہی کی غالب کے بغیر نہیں بنتی بلکہ عام شرفا کا بھی مرزا کے بغیر گزارا نہیں۔

مثلاً اس شریف النفس زن مرید شوہر کا جو اپنی جارحیت پسند بیوی سے پٹ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اوپر سے احباب آ گئے اور اپنے ہمدم کی تازہ مرمت کے آثار دیکھ کر پوچھنے لگے کہ یہ جمالیات کے حسنِ التفات کا نتیجہ تو نہیں؟ شوہر موصوف جواب میں کچھ تو اپنی جوانمردی کا بھرم رکھنا چاہتا تھا اور کچھ زنانے خانے میں جھانک کر معلوم کر چکا تھا کہ محترمہ نہ صرف دروازے سے کان چپکائے کھڑی ہیں بلکہ اپنے پاؤں کا ملبوس بھی اٹھا رکھا ہے۔ چنانچہ حضرت شوہر نے مسکرا کر غالبِ خستہ کا سہارا لیا اور یہ کہہ کر اپنا خون اپنی گردن پر لے لیا کہ "نہیں دوستو"

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اور مولانا [illegible] کا بھی غالب کے بغیر گزارا نہ تھا جس کا داخلہ ناکسی میں عدم کر رکھا تھا اور سرِ منبر سے تنبیہ کی تھی کہ اگر فوری اپیل قطعی تو [illegible] کی تو تکفیر [illegible]

سوال پوچھتے ہی وہ مریض کا پروانۂ راہداری تھما دیں گے۔ مذہب بیچارہ ڈر گیا تو یہ کسے بھی کہتا کہ میں نے یہاں غالب کھول کر سامنے رکھ دیا۔ اتفاقاً اس کی نگاہ ایک شعر پر پڑی اور وہ اپنا جواب پڑھنے لگا۔ زاہد نے قصیدے کے خلاف ہی ... پر پڑی دیکھی تو حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"میاں صاحب قبر کا خوف نہیں کیا؟"

زاہد کے جواب کے کچھ آزردہ الفاظ بہت واضح تو نہ تھے لیکن تجربے سے سمجھ میں آ سکتے تھے۔ پھر یوں کہہ رہا تھا

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

اور سچ پوچھیں تو خود ہمارے حکیم صاحب کا بھی غالب کے بغیر گزارا نہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے غالب نے چند صدری نسخے چھوڑے ہیں جو خاصے مشہور ہیں مثلاً جراحتِ دل کا نسخہ، غمِ الفت کا نسخہ کہیں غالب کا خاص الخاص اور مجرب آزمودہ نسخہ وہی ہے جو دافعِ غم ہے۔ اس مرض سے ہمیں تو حکیم صاحب معاجین کھلا کر ہی شفا بخش دیتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرض کچھ کہنہ اور پیچیدہ ہو جائے تو خاص حالات میں آپ چیدہ مریضوں کو غالب کے نسخے سے بھی استفادہ کراتے ہیں۔ رہا وہ نسخہ تو غالب کے اپنے الفاظ میں سنیے

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب — اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

سامعین! غالب فقط شراب کا شاعر ہی نہیں، وہ زندگی کا مفسر بھی ہے۔ غالب کے یہاں ہائے ہائے کرنے والا شاعر مجبور ہی نہیں، بلکہ خود وہ بھی ہے جو تلخیِ اوقات کا مقابلہ تو کرتا ہے، شکوہ نہیں کرتا — اور اس غریب کے پیٹ کا یہ حال اس قدر دراز ہے کہ اسے مرنے کا وقت بھی نہیں چنانچہ غالب کی زبان میں مرتے بھی کچھ مانگتا ہے تو یہ:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ — رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

غالب کے متعلق یہ چند الفاظ ازراہِ امتثال لکھے گئے ہیں ورنہ مجھے اپنے اختتامی کلمات اس شام کے مقرر تک محدود رکھنے تھے۔ ضمیر جعفری کو آپ بحیثیت شاعر جانتے ہیں۔ میں بھی انہیں شاعر کے طور پر جانتا ہوں لیکن مانتا صرف نثر نویس کے طور پر ہوں۔ آج آپ نے بنفسِ نفیس ضمیر کی نثر ضمیر کے منہ سے سنی۔ کیا آپ کو محسوس نہیں ہوا کہ اس نثر میں ایک نرالا حسن، ایک نرالا نشہ ہے؟ کیا سنتے ہوئے آپ کے دل نے آہستہ سے آپ سے یہ نہیں کہا کہ یہ بھی میرے دل میں ہے؟

سامعین! اگلے روز ضمیر کے ساتھ ایک شام منائی گئی اور مجھے ضمیر کی نثر کے متعلق تین چار جملے کہنے کا اتفاق ہوا۔ اگر اجازت ہو تو دوہرا دوں۔

"ضمیر کی نثر پڑھنے یا سننے کی عجیب تاثیر ہے۔ بچے پڑھیں تو یوں محسوس کرتے ہیں جیسے پریوں کے پروں پر بیٹھے تاروں میں تیر رہے ہوں۔ جوانوں پر یہ اثر ہوتا ہے گویا کسی مہوش کی شعلوں میں لپٹی ہوئی جوانی کا تماشا کر رہے ہوں اور خواتین کو ضمیر کی نثر یوں لگتی ہے جیسے شنیل کے تھان پر انگلیاں پھیر رہی ہوں۔"

گھوڑا اور شاہین

ضمیر جعفری

"نیرنگ خیال" کے سالنامہ (۱۹۸۲ء) کے لیے مضمون لکھنا ہے۔ سلطان رشک نے دو روز کی مہلت دی ہے۔ ہم خیالات کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ وقت کم۔ توفیق اس سے زیادہ کم۔ گھوڑا خیالات کا ہو یا حالات کا، اگر آپ اُسے بحرِ ظلمات میں بھی ڈال دیں تو وہ کہیں نہ کہیں پہنچ جاتا ہے۔ لیجئے ایک گھوڑا سامنے آ گیا۔ مگر گھوڑے سے پہلے تھوڑی سی تمہید آئے گی۔ جس طرح گھوڑے سے پہلے اُس کی گردن آتی ہے یا لیڈر سے پہلے اُس کا جلوس آتا ہے۔

ہم نے جب صحافت میں قدم رکھا تھا تو ہمارے اُستاد نے "خبر" کی اہمیت پر ہمیں ایک طویل لیکچر دیا تھا۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ جب کوئی خبر لکھو تو اس میں اپنی طرف سے کوئی "ملاوٹ" نہ کرو۔ یہ ہدایت تو صحافی کے کردار ۔۔۔ "معاشرے میں اُس کے رول" سے متعلق تھی۔ صحافت کے فنی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے فرمایا ۔۔۔ "خبر کا لازمی عنصر ۔۔۔ "خبریت" ہے۔ "خبریت" کے بغیر خبر کو یوں سمجھو جیسے انسانیت کے بغیر انسان ۔۔۔ میدہ نکلی ہوئی گندم کا آٹا"۔

خبر کے ضمیر کو مزید روشن کرتے ہوئے آپ نے مثال دی ۔۔۔ "اگر کوئی کتا ۔۔۔ کسی آدمی کو کاٹ جائے تو یہ کوئی خبر نہ ہوئی۔ ہاں اگر کوئی آدمی ۔۔۔ کسی کتے کو کاٹ لے تو یہ خبر ۔۔۔ "خبریت" سے لبریز ہوگی۔"

"خبریت" میں اتنی شور بور خبر تو آج تک ہماری نظر سے نہیں گزری البتہ کچھ روز ہوئے رائٹر کے حوالے سے ایک خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ کہ ایتھوپیا (حبشہ) میں ایک گھوڑے نے ایک شیر کو کاٹ کھایا ۔۔۔ بلکہ مار بھی ڈالا۔

ہم شیر اور گھوڑے دونوں کے نیاز مند ہیں۔ شیر سے ڈرتے ہیں اور گھوڑے سے پیار کرتے ہیں۔ للٰذا ۔۔۔ اسی خبر پر جہاں خوشی ہوئی کہ ایک زیر دست (گھوڑے) نے ایک زبردست (شیر) کو مار ڈالا ۔۔۔ وہاں اس بات پر تعجب بھی ہوا کہ گھوڑے نے جو ایک نیرک جانور ہے شیر سے پنجہ آزمائی کا فیصلہ کیوں کیا؟ ۔۔۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ہمارے سرد و گرم چشیدہ فلسفی اور دوست ۔۔۔ لالہ مصری خان بھی تشریف لے آئے۔ مسئلہ اُن کے سامنے رکھا گیا تو فرمایا

"ہاتھیوں کو تو گھوڑے شکست دیتے آئے ہیں مگر شیر کے ساتھ گھوڑے کی ہاتھا پائی کی بے شک یہ پہلی مثال ہے۔ لیکن ہمیں گھوڑے کی برتری پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔"

گھوڑے کو وہیں روک کر آپ مجھ سے کہا ۔۔۔ انس خان (وہ پیار سے مجھے اسی نام سے بلاتے ہیں) ذرا کاغذ پنسل تو دینا۔ کاغذ پنسل جیسا کہ گئے تو کاغذ پر گھوڑے کی تصویر بناتے ہوئے بولے:

"یہ دیکھو! ۔۔۔ گھوڑا کھُر سے کانوں تک ذہانت ہی ذہانت نظر آتا ہے۔ سکندرِ اعظم کے گھوڑوں نے پورس کے ہاتھیوں

کو اپنی زیرکی ہی سے مارا تھا۔ ورنہ گھوڑوں کے پاس نہ جسم ان سے زیادہ تھا۔ نہ اسلحہ ـــ میں تو کہوں گا کہ اگر جانوروں کی کوئی اپنی [illegible] ریاست ہوتی تو گھوڑا اس ریاست کا وزیرِ خارجہ ہوتا ـــــ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا ـــ "فدا خبر کا لب لباب تو بتاؤ؟"

لب لباب یہ تھا کہ ادیس ابابا کے جنوب مغربی علاقے میں ایک گھوڑا کہیں سے گزر رہا تھا۔ کہ ایک شیر سے اس کی [illegible] چار ہو گئیں جو چار بکروں کو ہلاک کرنے کے بعد اب ایک گدھے پر جھپٹنے والا تھا۔ اس پر گھوڑے کو طیش آ گیا اس نے جھٹ ایک "کوکا" مار کے جنگل کے بادشاہ" کو گردن سے جا پکڑا اور آن کی آن میں "بادشاہ سلامت" کی شہ رگ اپنے دانتوں سے کاٹ کے رکھ دی۔

"یہی اس کی فاش غلطی تھی" ـــ لالہ مجھے درمیان میں ٹوکتے ہوئے بولے؛

"گھوڑے کی؟" میں نے پوچھا

"نہیں" لالہ بولے ـــ "شیر کی غلطی"

"وہ کیسے؟"

"وہ یوں ـــ کہ گھوڑا طبعاً سخت آفریا پرور جانور ہے۔ گدھے اور گھوڑے میں ذات پات کا نہیں ـــ حالات کا فرق ہے۔ میری دانست میں گدھا ـــ ایک پسماندہ گھوڑا ہوتا ہے ـــ اس وقت جس گھوڑے کا لبِ لباب تم نے بیان کیا ہے مجھے پکا یقین ہے گدھے کی ہمدردی کے جذبے کے تحت شیر سے بھڑ گیا ورنہ احمق گھوڑا بھی اتنا گدھا نہیں ہوتا کہ خواہ مخواہ شیر کے جبڑوں میں جا کر ہاتھ ڈال دے"

جرح و تعدیل کرنا لالہ مصری خان کی عادت ہے۔ یہاں آپ نے ایک دوسرے رُخ سے سوال پوچھا ـــ "گھوڑے پر اس وقت کوئی آدمی تو سوار نہ تھا؟"

"جی نہیں" ـــ میں نے عرض کیا ـــ "خبر اس بارے میں خاموش ہے۔ قیاس ہے کہ جیسے شیر خالص تھا۔ اسی طرح گھوڑا بھی محض گھوڑا ہوگا۔ سوار کو چلو وہ گرا بھی سکتا تھا۔ مگر کون گھوڑا ہوگا جو منہ میں لگام ڈالے اور پشت پر کاٹھی اٹھائے شیر سے جا الجھے۔"

"غلط"۔ لالہ مصری خان گرج کر بولے۔ "یہ دلیل میں کبھی نہ مانوں گا۔ گھوڑا تو گھوڑا ہے میں نے انسانوں کو دیکھا ہے کہ طیش میں آتے ہیں تو لگام اور کاٹھی سمیت لڑ پڑتے ہیں ـــ اصل وجہ اس کی ہم سے پوچھو؟"

"بتائیے"

"یہ گھوڑا" لالہ بولے ـــ "جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے "ہمدردی کے مشن" پر شیر کے مقابلے میں گیا تھا۔ اس کی پشت پر اگر اس وقت کوئی آدمی سوار ہوتا تو وہ گھوڑے کو اس مشن پر ہرگز نہ جانے دیتا کہ دوسرے کی ہمدردی کرتے کرتے آدمی اپنی جان جوکھوں میں ڈال دے"

اتنا کہہ کر لالہ مصری خان اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے فرمایا ـــ "اگر وہ گھوڑا مجھے مل جائے تو میں شہر شہر اس کو نمائش [illegible] لیے گھوڑا ختم ہو گیا۔ اب کیا کیجیے؟

خدا مسبب الاسباب ہے۔ ہم گھوڑے کی [illegible] کے ساتھ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

نیرنگِ خیال راولپنڈی

سکندر شاید اب تک زندگی کے کئی میدانوں میں کامزن ہو چکے ہیں۔ جس میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ ان کی ترقی کی رفتار ہمیشہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے قدم کو زیادہ عرصے تک کسی میدان میں آمادہ نہیں رہنے دیتے۔ اقبال نے شاید انہیں کے بارے میں کہا ہے

ع تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا

یہ کوئی بندھا ٹکا اصول تو نہیں کہ جیسا کسی آدمی کا نام ہو ویسا ہی اُس کا کام ہو۔ اور ویسی ہی اس کی شخصیت بھی ہو۔ اور محض نام کسی فرد کی زندگی کا تمام راستہ ہی تبدیل کر ڈالے — نام آخر نام ہی تو ہوتا ہے۔ کوئی "انجن" تو نہیں ہوتا کہ کسی شخص کی زندگی کو کھینچ کر کسی پٹڑی پر لا کر ڈال دے — تاہم اس قسم کے اتفاقات بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ ایک آدمی کا نام اُس کی شخصیت یا اُس کے مستقبل کو متاثر کر گیا ہو — بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اُس نام کے ساتھ کوئی خاص روایت وابستہ ہو گئی ہو — سکندر ایسی قسم کا ایک نام ہے۔

سکندر — کے ساتھ عظمت و شوکت، خوش قسمتی اور بلند اقبالی کا تصور — یونان کے نامور فاتح شہنشاہ سکندرِ اعظم کی نسبت سے قائم ہوا تھا۔ اور آج تک اس کو — "جھنڈے والا نام" (FLAG NAME) سمجھا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں صوبہ پنجاب کی سیاست میں سر سکندر حیات خان کو جو مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ اُس سے کون واقف نہیں۔ خود پاکستان کے ایک صدرِ مملکت کا نام سکندر مرزا تھا۔ موصوف اگرچہ آخر میں معزول ہوئے مگر کچھ عرصے تک تو اُن کا آفتابِ اقبال انتہائی بلندی پر چمکتا رہا۔ دوام کا پٹہ تو کوئی بھی لکھوا کر نہیں لاتا۔ اصل سکندرِ اعظم کے بارے میں بھی ہمیں معلوم ہے کہ وہ اچھی خاصی روانی اور جولانی میں چلا جا رہا تھا کہ دریائے بیاس کے کنارے پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ بیاس زمانے میں بھی آتنا ہی کچھ دریا ہو گا جتنا آج کل ہے۔ یہاں سے پلٹا تو راستے میں بیماری نے آلیا۔ اور پھر راہیِ ملکِ عدم ہو گیا۔

بادشاہت اور اقتدار کا سنگھاسن ہی نہیں — "سکندر" کے نام کو ہم نے ایک مرتبہ محبت کے آسمان پر بھی چمکتے دیکھا تھا۔ یہ ایک پرانا واقعہ ہے۔ اب یہ بھی یاد نہیں آرہا کہ یہ واقعہ کس شہر میں واقع ہوا تھا۔ واقعہ زیادہ مشہور ہو تو مقام پیچھے رک جاتا ہے — غرض آموں سے ہوتی ہے نہ کہ پیڑ گننے سے۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ ایک شہر میں ایک خوش شکل مسلمان نوجوان پر جس کا نام سکندر بخت تھا۔ اُسی شہر کی ایک پری چہرہ ہندو لڑکی فریفتہ ہو گئی بلکہ — دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی — اور اس زور کی لگی ہوئی کہ شہر میں ہندو مسلم فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ دل کے چین نے شہر کا امن و سکون غارت کر دیا۔ عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ہمیں یاد ہے جب ان دونوں کے عشق کا چرچا چل نکلا تو دونوں طرف کے لوگ بھی لٹھ لے کر میدان میں نکل آئے کہ — تم ہوتے کون ہو ہماری اجازت کے بغیر عشق کرنے والے! ~

جزیۂ شباب دو!
عشق کا حساب دو!

نتیجہ — عشق سے "دستبرداری" — یہ دست برداری بھی سکندر بخت کی خوش بختی کی دلیل تھی۔ ورنہ اگر عشق بہت شدت پکڑ جائے تو اس کا انجام عموماً "خودکشی" کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

دُور کی مثالیں جانے دیجیے سکندر کو بھی چھوڑیئے ایک اور لفظ ہے۔ "ساغر" یہ لفظ ذہن میں جب آتا ہے ہنستا اور چھلکتا ہوا آتا ہے۔ اردو زبان کے ایک ممتاز شاعر — ساغر نظامی کی ساری شاعری۔ اُن کے تخلص کی وجہ سے چھلک اٹھی تھی۔ شاعر تو خیر شاعر ہوا۔ ہم نے ایک ڈاکٹر کی شخصیت پر بھی اس لفظ کا "خاطر خواہ" اثر دیکھا ہے۔ لائلپور کے ایک روزنامہ میں ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں مقامی ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کے ایک ممتاز معالج ڈاکٹر ولی محمد ساغر صاحب کا تذکرہ لکھتے ہوئے اُن کے سراپا کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"خوش مزاج فرد۔ ہنستا ہوا چہرہ"

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ساغر خوا مے خانے میں ہو — یا کسی شفاخانے میں — اس کا چہرہ ہمیشہ ہنستا ہوا ہوگا۔

ہسپتال میں اہلکاروں کی ایک تنظیم بھی موجود ہے۔ سینکڑوں اہل کار — اس تنظیم کے رکن ہیں۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ یونین کے صدر کا کیا نام ہے! — رائے محمد اقبال! یعنی "رائے" اور "اقبال" دونوں چیزیں ان کے نام کا حصہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگوں کی "رائے" اور اپنے ذاتی اقبال ہی کی بدولت اس بلند منصب تک پہنچے ہیں!

مکمل تفصیلات کے لئے رجوع فرمائیں

اسلام آباد :
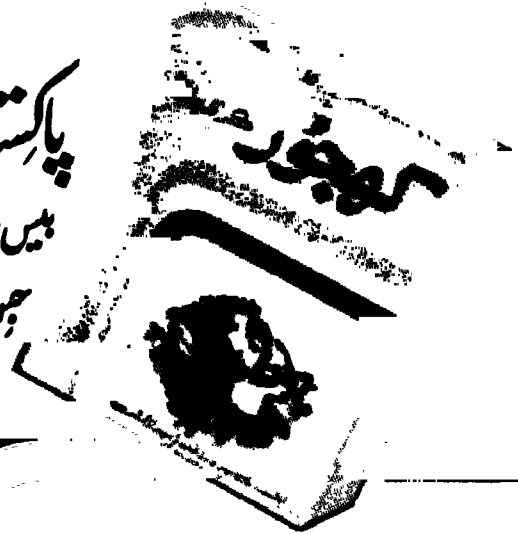
راولپنڈی :
بائیو گیس سیکشن

فیض احمد فیض

سید ضمیر جعفری

پروین سید فنا

کرنل محمد خان

قتیل شفائی

سلیم احمد

رئیس امروہوی

انور سدید

میرزا ادیب

میجر جنرل محمود الحسن

رفعت سلطان

جمیل آذر

اکرام اعظم

فارغ بخاری

محشر بدایونی

جمیل یوسف

صمد انصاری

پرتو روہیلہ

احمد ظفر

اختر ہوشیار پوری

عطا حسین کلیم

کرم حیدری

اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

حکیم محمد یوسف حسن

جوش ملیح آبادی
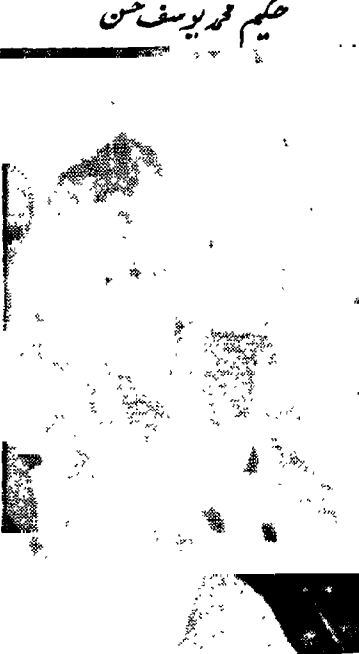
فراق گورکھپوری

احسان دانش

رئیس امروہوی

قطعہ تاریخ وفات

جناب فراق گورکھپوری

جوشؔ و فراقؔ محفلِ اہلِ سخن میں تھے
ہمراز و ہم مزاج و ہم افکار و ہم مذاق

دونوں تھے اپنے شیوۂ دیدہ وری میں فرد
دونوں تھے اپنے فنِ سخن گستری میں طاق

نظم و غزل میں دونوں یگانہ بحسنِ ذوق
اربابِ نظم و اہلِ غزل کا ہے اتفاق

اللہ ری تجلیِ روح و صفائے قلب
بُراقؔ ان کی فکر تھی اور ذہن تھا براق

جوشؔ و فراقؔ آج میسر کہاں رئیسؔ
(پھر کون ہو امربیٔ جوشِ غمِ فراق)
۱۹۸۲ء

شان الحق حقی

قطعہ تاریخ وفات جناب احسان دانش
شاعر نغز گو و مصنف " جہانِ دانش"

وہ خود تھا روح و رواں ادب کا ادب تھا روح و روانِ دانش
وہ رونقِ بزمِ شعرِ اردو ، وہ کوکبِ آسمانِ دانش
عدم سے اُبھرا ابد میں ڈوبا ، نگاہِ نظارہ بیں میں لیکن
" جہانِ آباد ہے اندھیرا ، بجھا چراغِ جہانِ دانش

۱۹۸۲ء

تاریخ وفات جناب فراق گورکھپوری

فراق اپنے فن میں طاق، شاعرِ محبت ہے
بے گماں بالاتفاق ، شاعرِ محبت ہے
زندگی میں بھی یکتا تھا ، غزل میں نام اُس کا
سالِ مرگ بھی " فراق شاعرِ محبت" ہے

تاریخ وفات حضرات فراق و جوش

دونوں کا سوز ایک ہے از وجہ یکدلی
سالِ فراق و جوش وصالِ فراق و جوش

۱۹۸۲ء

سید عطا حسین کلیم

یادِ رفتگاں

اپنی تازہ تصنیف "یادوں کے زخم" میں سید عطا حسین کلیم نے ان یکتائے روزگار ہستیوں کو یاد کیا ہے جن کے دم سے علم و ادب کی محفلیں آباد تھیں۔ ممتاز مزاح نگار سید محمد جعفری مرحوم پر لکھا ہوا مرثیہ نذرِ قارئین ہے۔ (ادارہ)

سید محمد جعفری

وقت کی راہوں پہ رختِ جاں اٹھا کر چل دیا — جو زمانے کو ہنساتا تھا رُلا کر چل دیا

علم و فن کی آبرو بھی، نازشِ دوراں بھی تھا — وہ بڑا شاعر تو تھا ہی، اک بڑا انساں بھی تھا

اس کے فن کی عظمتوں کا اک جہاں شیدا ہوا — طنز گو ایسا زمانے میں کہاں پیدا ہوا

علم اس کا بحرِ بے پایاں، فراست بے مثال — بے کراں اس کی وفا، اس کی محبت لازوال

حاملِ خُلقِ پیمبر، عاشقِ دینِ مُبیں — دولتِ ایماں سے مالا مال، فرخندہ جبیں

پنجتن کا والہ و شیدا، پرستارِ حسینؑ — جاں نثارِ فاتحِ خیبرؑ، عزادارِ حسینؑ

حضرتِ سجادؑ کے غم کو بنایا زندگی — سوزِ جعفرؑ سے کیا روشن چراغِ آگہی

اسوۂ عباسؑ سے درسِ وفا لیتا رہا — زیست کی کشتی فراتِ عشق میں کھیتا رہا

دل کی تابانی سے مہر و مہ کو شرماتا گیا — ماتمِ شبیرؑ سے سینے کو گرماتا گیا

بحرِ ہستی میں مثالِ ناخدا بن کر رہا — زندگی بھر مشعلِ راہِ وفا بن کر رہا

کوئی دم مہکا گلستاں میں چمن دکھلا گیا — شاخِ ہستی پہ گُلِ معنی کِھلا، مرجھا گیا

موجِ نکہت کی طرح گلشن سے رخصت ہو گیا — شاعری کا طالعِ بیدار آخر سو گیا

خسروی

"بیادِ جوشؔ"

قطعہ

ناصح، کبھی دیکھی بھی وہ غنچہ دہنی ہے
جس کے لئے بھونروں سے عنادل کی ٹھنی ہے

وہ نیلگوں آنچل سے جھلکتا ہوا مکھڑا
نیلم میں جڑی جیسے کہ ہیرے کی کنی ہے

پلکوں کے جھپکنے میں ہیں تتلی کی اُڑانیں
اَبرو کی کمانوں میں دھنک جیسے تنی ہے

آنکھوں میں ہیں ڈورے کہ رگِ گل میں ہے صہبا
گالوں کی وہ رنگت کہ گلابوں پہ بنی ہے

بتخانہ میں ہر سمت ہے آوازِ انا الحق
ایسے میں کِسے حوصلۂ بُت شکنی ہے؟

ہیں انفس و آفاق ترے در کے بھکاری
بس ایک جنوں ہے کہ جو تجھ سے بھی غنی ہے

ہر لفظ کے پردے سے نکلتا ہے نیا لفظ
لفظوں سے مگر صورتِ معنٰی بھی بنی ہے؟

ہم یاد میں اس لعلِ شکر ریز کے ہیں گُم
لب دوز تصور میں وہ شیریں سخنی ہے

ہے سادہ و پُرکار بہت واعظِ خوشگو
افکار کا محتاج ہے لفظوں کا دھنی ہے

بس خسروؔی اب جوشؔ کا وہ مصرعہ پڑھے جا
"کیا گلبدنی، گلبدنی، گلبدنی ہے"

مقالات
مضامین

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

جمیل مظہری، نیاز اور نگار

جمیل مظہری (مرحوم) علامہ وحشت کلکتوی (مرحوم) کے تلامذہ ارشد میں تھے اپنے استاد کی طرح جمیل مظہری کو بھی نیاز و نگار سے خاص لگاؤ تھا اور نیاز بھی وحشت و جمیل مظہری دونوں سے تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ علامہ وحشت کلکتوی، نیاز کے ہم عمر اور ہم عصر تھے اور کلاسیکی غزل گو کی حیثیت سے ایسے بلند مرتبے پر فائز تھے کہ نگار سے اُن کی قربت کوئی اہم واقعہ قرار نہیں پاتی البتہ جمیل مظہری نے اپنے فکر و فن کی بدولت جس تیزی سے اور جتنی کم عمری میں نیاز کے دل میں اپنی جگہ بنائی وہ حیرت انگیز ضرور ہے وجہ یہ ہے کہ تنقید کے باب میں نیاز کا قلم ہمیشہ بے باک رہا ہے اور انہوں نے جس کسی کے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے بے لاگ لکھا ہے۔ جمیل مظہری کا نام بحیثیت ادیب و شاعر سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء سے منظرِ عام پر آیا ہے اس وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ انیس سال تھی اس اعتبار سے وہ عمر میں نیاز فتح پوری سے بہت چھوٹے تھے عمر و سال کے اس تفاوت کے باوصف، علم و فکر کی بنیاد پر نیاز اور جمیل مظہری کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی اس کا اندازہ بعض تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے سنہ ۱۹۵۱ء میں جب "شکست و فتح" کے نام سے جمیل مظہری کا طویل افسانہ دوسری بار چھپا تو نیاز فتح پوری نے اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"جمیل مظہری نہ صرف صوبۂ بہار بلکہ پورے ملک کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جو ادب و زبان کی خدمت کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں اور جن کے قلم سے کبھی درجہ دوم کی چیز نہیں نکلتی" ع[1]

اس کے دو سال بعد جب جمیل مظہری کی نظموں کا مجموعہ "نقشِ جمیل" منظرِ عام پر آیا تو نیاز نے اب کے بار قدرے تفصیل سے تبصرہ کیا اور جمیل مظہری کو اپنے عہد کا نمائندہ شاعر قرار دیا۔ تبصرہ کی چند سطریں دیکھیے۔

"جمیل مظہری ملک کے ان مخصوص شعراء میں سے ہیں جو اُردو شاعری میں اس وقت نہ صرف استادانہ بلکہ مرشدانہ حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی شاعری ایک مستقل دبستان کی حیثیت رکھتی ہے .... مظہری نے سب سے پہلی نظم (مالن کی بیٹی) سنہ ۱۹۲۴ء

ع[1] نگار دسمبر سنہ ۱۹۵۱ء ص ۴۶

کہی تھی جبکہ ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی لیکن کمسنی میں بھی اُن کی شاعرانہ پختگی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ آپکو اُس نظم کے دو شعروں سے ہو سکتا ہے

چمن چمن کے پروتی جاتی ہے دھاگے میں شگفتہ کلیوں کو
دھاگا جو الجھ جاتا ہے کبھی ماتھے پہ شکن پڑ جاتی ہے
بچپن کا تقاضا ہے شوخی شوخی کا نتیجہ ہے غیرت
جُھک جاتی ہیں آنکھیں شرم سے خود ہونٹوں پہ ہنسی سی آتی ہے

اس رنگ سے ہٹ کر مفکرانہ انداز میں ان کی آخری نظم "دھارے" کے عنوان سے نظر آتی ہے جس کا آخری بند یہ ہے

میں ان دھاروں میں کیونکر ناؤ اپنی چھوڑ دوں آخر
انہیں آنکھوں سے دیکھا ہے جنہیں گرداب میں جاتے
میں دھاروں کا نہیں سیلاب کا قائل ہوں اے ساقی
یہ سب دھارے سمٹ کر کاش ایک سیلاب بن جاتے

اس مجموعے میں جتنی نظمیں مختلف ابواب کے تحت شائع کی گئی ہیں وہ اپنے عنوانات کے لحاظ سے ہر طرح مکمل ہیں اور بعض بعض بہت بلند" [1]

نیاز فتح پوری تاثراتی نقاد ہیں اور سب جانتے ہیں کہ ان کی تنقید کا خاص میدان غزل ہے غزل کو وہ تخلیقی ذہن کا نقطۂ عروج مانتے ہیں غزل کے فنی لوازم، اس کے حسن و قبح پر اُن کی نظر جتنی گہری تھی کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ انہوں نے شاعری اور شعراء کے بارے میں ناقدانہ حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے اس میں زیادہ حصہ غزل اور غزل گو شعراء سے متعلق ہے خواہ وہ نگار کا "اردو شاعری نمبر" (۱۹۳۵ء) ہو یا ۱۹۴۱ء کا "شعراء کا خود نوشت نمبر" خواہ نیاز کی "انتقادیات جلد اول و دوم" ہوں، ان سب میں شامل تحریریں غزل ہی کے ارد گرد چکر لگاتی ہیں سچ یہ ہے کہ نیاز کے ناقدانہ جوہر غزل، غزل گو شاعر اور غزل کے مجموعے ہی پر قلم اٹھاتے ہوئے کھلتے ہیں چنانچہ جمیل مظہری کے مجموعۂ غزل "فکر جمیل" پر بھی انہوں نے ان کی دوسری تخلیقات کے مقابلے میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے اور اظہارِ خیال میں سارے نکاتِ سخن کا احاطہ کیا ہے چند سطریں دیکھیے۔

"جمیل مظہری، حضرت وحشت کلکتوی کے بڑے مشہور و ممتاز شاگرد ہیں، اپنے اسلوب بیان کی ندرت اور خیالات کی رفعت کے لحاظ سے وہ ایک خاص مرتبے کے مالک ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں روشِ عام سے ہٹ کر کہتے ہیں ان کی شاعری محض پا افتادہ جذبات و زبان کی شاعری نہیں بلکہ حسن ذہن و فکر اور تعبیر بالغ کی شاعری ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت صرف وہی ایک ایسے سخن گو ہیں جن کو "دبستان غالب" کا صحیح نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ فن کے لحاظ سے بھی وہ بڑے پختہ کار شاعر ہیں لیکن کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے اگر وہ اپنے بعض شعروں پر نظر ثانی کر لیتے تو بہتر ہوتا" [2]

---

[1] نگار اپریل ۱۹۶۰ء ص ۴۴

اس کے بعد نیاز نے جمیل مظہری کے بعض اشعار میں زبان و بیان کی بعض کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے بعض الفاظ و محاورات اور تراکیب کے معنی و مصرف کو محلِ نظر بنایا ہے لیکن آخر آخر وہ اس قسم کی دو چار کمزوریوں سے صرف نظر کر کے خود لکھتے ہیں کہ

"یہ تسامحات سب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں جب اُن کے یہ اشعار ہماری نگاہ نہیں بلکہ دل کے اندر سے گزر جاتے ہیں ؎

امیدیں چھین لیں اُس نے تو پھر گلہ کیا ہے
قرار مانگ رہے تھے قرار دے تو دیا

اگرچہ جبر ہے یہ بھی مگر غنیمت جان
کہ ایک جذبۂ بے اختیار دے تو دیا

ابھی دنیا حقیقت کا تحمل کر نہیں سکتی
ابھی نیچی نگاہوں میں چھپائے رہتے ورنہ ازاپنا

ہیں رہ گئے بزم میں نیم بسمل
مگر تیری آنکھوں نے فرصت نہ پائی

میں ہوں کیا اور مری قسمت کیا ہے
اس تبسم کی ضرورت کیا ہے

اس قسم کے اشعار سے اُن کا کلام بھرا پڑا ہے اور ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جمیل مظہری کتنا بلند پایا شاعر ہے اور اس کا ذوقِ شعر و سخن کس قدر لطیف و پاکیزہ ہے۔ [۱]

جمیل مظہری کے بارے میں نیاز کی رائے جان لینے کے بعد جی چاہتا ہے کہ نیاز کے بارے میں علامہ جمیل مظہری کی رائے بھی معلوم کی جائے ۱۹۶۳ء میں جب میں نے نیاز نمبر نکالنے کا ڈول ڈالا اور اُس کی اطلاع مظہری صاحب کو ہوئی تو وہ بوجہ اُس وقت کوئی مقالہ تو نہ لکھ سکے لیکن ارشد کاکوی کے نام ایک خط کے ذریعے وہ نیاز کے فکر و فن کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتے تھے نہایت اختصار کے ساتھ سب کچھ کہہ دیا لکھتے ہیں کہ

"نیاز فتح پوری کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ

"آخر زگیاہ باغ اُدیم"

اور مجھ ہی پر کیا منحصر ہے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۰ء تک کے عرصے میں اسلامی ہندوستان کا ہر وہ جوان یا نوجوان جسے ادب کا کچھ ذوق رہا ہو اس کی ذہنیت کی تعمیر میں نیاز کے قلم نے معمار کا کام کیا ہے غالب نے اس برصغیر میں جس نئے ذہن کی داغ بیل ڈالی تھی سرسید نے جن کی تعمیر کے سلسلے میں نیو کھودی اور شبلی نے جس پر چند دیواریں اٹھائیں اس کو اقبال، ابوالکلام، نیاز اور جوش نے ایک چوتھائی صدی کے اندر ایک قصرِ رفیع بنا دیا [۲]

یہی نہیں ۲۴ رمئی ۱۹۶۶ء کو علامہ نیاز کی وفات کی خبر جب اخبار کے ذریعے جمیل مظہری تک پہنچی تو انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں بڑے درد بھرے انداز میں لکھا کہ

---

[۱] نگار اپریل ۱۹۶۰ء ص ۴۵

[۲] نگار پاکستان نیاز نمبر حصہ دوم ص ۱۶۳ بابت مئی جون ۱۹۶۳ء

"عظیم ترین ادبی حادثے کی اطلاع ناگہانی طور پر ملی نیاز صاحب کی موت ایک عہد کی موت ہے ایک ادارے اور ایک تحریک کی موت ہے اس موت نے صرف آپ ہی کو یتیم نہیں کیا بلکہ تمام ادیبوں اور شاعروں اور مفکروں کو یتیم بنا دیا جن کے سروں پر حضرت نیاز مرحوم کا سایہ بمنزلۂ شفقت پدری تھا۔ میں بھی ان بدنصیبوں میں سے ایک ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس محرومی پر خود ماتم کروں یا آپ کو صبر دلاؤں"[1]

ان سطروں کے ساتھ چند الفاظ بطور قطعۂ تاریخ بھی ارسال فرمائے۔ انہیں بھی دیکھتے چلیے کہ یہ نیاز کے بارے میں یل مظہری کی عقیدت کا مظہر بھی ہیں اور ادبی تاریخ کا جزو بھی ؎

مبارک ہو خلد بریں کا سفر   فدائے محمد نگہبان نیاز
ترا ایک مستقل تھا دبستان فکر   ہوا بند اب وہ دبستان نیاز
ترا خون دل پی کے پنپی تھی جو   وہ کشت ادب ہے بیابان نیاز
تعجب ہے کیا ہو اگر خلد میں   تیرے سوز دل سے چراغان نیاز
تھی کل شب سے تاریخ رحلت کی فکر   پشیماں تھی طبع پریشان نیاز
کہ ناگاہ ہاتف کی آئی صدا   لکھو بزم غالب میں مہمان نیاز
(۱۳۸۹ھ)

نیاز کی معرفت، جمیل مظہری ماہنامہ نگار کے بھی بہت قریب رہے۔ ابتداءً نگار میں چھپنے کی وجہ سے جمیل مظہری کے کا اعتبار قائم ہوا آخر آخر جمیل مظہری کا نام نگار کی رونق اور وقعت کا وسیلہ بن گیا نگار میں جمیل مظہری کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوئیں اور گاہے گاہے مقالات نے جگہ پائی۔ بعض پرچوں میں جمیل مظہری اور ان کی تخلیقات کو موضوع بنا کر سروں نے بھی مضامین لکھے۔

نگار کی فائلوں کی چھان بین کرتے ہوئے مجھے جمیل مظہری کا نام اوّل اوّل مارچ ۱۹۴۵ء میں نظر آتا ہے۔ "عشق ناتمام" کے ان سے نو شعر ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے مثنوی کے فارم میں مختصر سی نظم کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن کیفیت کے اعتبار سے غزل کی تعریف میں آتے ہیں صرف پہلا اور آخری شعر دیکھتے چلیے

وہ زندگی عجیب تھی نہ ہجر تھا نہ وصل تھا   کہ دونوں کا مسئلہ نزاع عشق و عقل تھا
بُرا ہو عقل کا کہ عشق کے مزے نہ آ سکے   نہ تم فریب کھا سکے نہ ہم فریب کھا سکے

اسی سال یعنی ۱۹۴۵ء کے نگار میں "بعد المشرقین" کے عنوان سے بارہ اشعار کی نہایت خوبصورت اور پُرجوش نظم ہے۔ مغرب کی فعال اور متحرک زندگی کا مشرق کی منفعل و مضمحل زندگی کا مقابلہ کرکے اہل مشرق کو غیرت دلائی گئی ہے اور اس کا احساس دلایا گیا ہے کہ قوموں کو عظمت و ترقی کی نعمتیں تفکر و تامل اور سعی و عمل سے میسر آتی ہیں۔ دعا و تعویذ یا بے عملی و ہم پرستی سے قومیں برباد و تباہ ہو جاتی ہیں چند منتخب شعر دیکھیے اندازہ ہو جائے گا کہ کس قسم کا قطعہ ہے اور کتنا زوردار ہے۔

عبث جنون ہے تقلید اہل مغرب کا   کہ تم میں ان میں ہے تفریق بادشاہ و غلام
وہ ایک وہ کہ حقیقت میں ہیں خدائے عمل   وہ ایک تم کہ سراسر ہو بندۂ اوہام

---

[1] نگار پاکستان بابت جولائی ۱۹۶۶ء ص ۷

وہ ایک وہ ہیں کہ کھینچے ہوئے ہیں وقت کی باگ
وہ ایک تم ہو کہ اپنی بھی چھوڑ دی ہے لگام
وہ ایک وہ کہ ہواؤں سے لے رہے ہیں خراج
وہ ایک تم کہ مزاروں پہ کر رہے ہیں سلام
وہ ایک تم کہ صدائے ضمیر سے غافل
وہ ایک وہ کہ ستاروں سے کر رہے ہیں کلام
وہ ایک تم کہ سزاوار و احتیاج طلب
وہ ایک وہ کہ خداوندِ نعمت و انعام

اسی سے مشرق و مغرب کا فرق ظاہر ہے
کہ یہ گدائے سرِ رہ ہے وہ مسافر ہے

جون ۱۹۴۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر محفوظ الحق نے صرف چھیالیس سال کی عمر میں وفات پائی پروفیسر محفوظ الحق عربی، فارسی، اسلامی تاریخ اور عمرانیات پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ انگریزی بھی اعلیٰ درجے کی جانتے تھے اور لکھتے بھی تھے مراں کے فارسی دیوان داراشکوہ کی مشہور کتاب مجمع البحرین اور عمر خیام کی رباعیات کے سلسلے میں انہوں نے جو کام کیا ہے وہ ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا ان کی ناگاہ وفات سے دنیائے علم و ادب کو جو صدمہ پہنچا تھا اسے نیاز فتح پوری اور جمیل مظہری جیسے صاحبان علم و فن ہی محسوس کر سکتے تھے چنانچہ جمیل مظہری نے "تعزیت" کے عنوان سے ایک درد انگیز طویل نظم لکھی۔ یہ نظم چونکہ نیاز کے جذبات کی بھی ترجمان تھی اس لیے انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۶ء کے نگار میں مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع کی۔

"پروفیسر محفوظ الحق بنگال کے ان چند اہل علم میں سے تھے جن کے نقوش فضل و کمال کبھی محو نہیں ہو سکتے پروفیسر موصوف نے آخری دم تک علم و ادب کی جیسی خاموش خدمت انجام دی ہے گو اس کا علم عوام کو نہ ہو خواص کو ہے اور اس لیے ان کا سانحہ ارتحال واقعی موت العالم کا حکم رکھتا ہے۔"

جناب جمیل مظہری نے یہ نظم ان کی یاد میں لکھی ہے جو بزم احباب کلکتہ کے جلسے میں انہوں نے پڑھ کر سنائی تھی۔ چونکہ پروفیسر محفوظ الحق سے میں بھی رابطۂ محبت رکھتا تھا اس لیے میں دل کی تمام ترانذوہگینیوں کے ساتھ اسے نگار میں شائع کرتا ہوں اور جناب جمیل مظہری کا ممنون کہ انہوں نے مجھ کو اس کی اشاعت کی اجازت دی

"نظم کی خوبیوں کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ جو چیز داد کی حد سے گزر جائے اس کی داد خاموشی ہی سے دی جا سکتی ہے" [۱]

نظم کا پہلا شعر یوں ہے اور کُل چونتیس ۳۴ اشعار ہیں

رہِ عدم کا مبارک تمہیں سفر محفوظ
بھلا سکیں گے تمہیں ہم نہ عمر بھر محفوظ

۱۹۴۸ء میں اسی طرح کی ایک طویل نظم علامہ جمیل مظہری نے مہاتما گاندھی کے قتل پر بھی لکھی تھی اس نظم میں ستاون اشعار ہیں اور اسے مہاتما پر لکھی جانے والی اردو نظموں میں بہترین نظم کہہ سکتے ہیں کہ یہ گاندھی کی شخصیت و کردار کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے پہلا اور آخری شعر اس جگہ نقل کیا جاتا ہے۔

یہ کیا ہوا کہ اندھیرا سا چھا گیا اکبار
اداس ہو گئیں سڑکیں اجڑ گئے بازار
ہوائیں شہر و بیاباں میں خاک اڑائیں گی
مگر کہیں بھی نشانِ جبیں نہ پائیں گی [۲]

---

[۱] نگار اکتوبر ۱۹۴۶ء ص ۵۶

[۲] تفصیل کے لیے دیکھئے نگار اپریل ۱۹۴۸ء

اپریل ۱۹۵۲ء کے نگار میں جمیل مظہری کی ایک نظم "نوائے جرس" کے نام سے چھپی ہے اس میں تین مصرعوں کے بند ہیں اور اس کی معنوی حیثیت جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ایک مجاہدانہ نغمے کی سی ہے۔ آغاز کا بند یہ ہے

نظامِ مہر و ماہ کے مزاجداں بڑھے چلو　　ہیں ابر و باد و برق تم سے سرگراں بڑھے چلو

ہنسی اور تشنہ لبی کے قافیوں میں بغیر مطلع کی ایک غزل ۱۹۵۳ء کے نگار میں بھی نظر آتی ہے آٹھ شعر کی غزل کا پہلا اور آخری شعر درج کیا جاتا ہے ؎

مجھ سے ممکن نہ ہوا تیرے تبسم کا جواب　　ہنس دیا زخمِ جگر میری ہنسی پہ اے دوست

ایک وارفتہ صحرائے تحیّر ہے جمیل　　اور تیرا لطفِ تبسم ہے اُسی پر لے دوست

اس بحر اور اسی ردیف میں قافیہ بدل کر پانچ شعر کی ایک غزل مارچ ۱۹۶۲ء کے نگار میں بھی چھپی ہے مطلع و مقطع اس طور پر ہیں ؎

آستیں میری ہے اور دیدۂ تر ہے اے دوست　　اب مرے اشک کا قطرہ بھی گہر ہے اے دوست

ہو نہ رحمت تو اچٹتی سی نظر سوئے جمیل　　یہ گدا سائلِ یک زخمِ جگر ہے اے دوست

ستمبر ۱۹۶۳ء کے نگار میں بھی ایک نظم جمیل مظہری کی نظر آتی ہے۔ یہ نیاز فتح پوری کی مدح میں ہے شروع اور آخر کے شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎

نیاز پیکرِ معنی میں تجھ سے جانِ سخن　　نیاز روحِ ادب کا مزاج داں تو ہے

سوادِ ذہن کو تاریکیوں نے گھیرا تھا　　چراغ تُو نہ جلاتا تو گھپ اندھیرا تھا

ایک غزل نما نظم "آج بھی ہے" کے عنوان سے نومبر ۱۹۶۴ء کے نگار میں صفحہ نمبر ۶۷ پر چھپی ہے اور محاسن لفظی و معنوی سے مالا مال ہے ابتدائی اور آخری اشعار یہ ہیں۔

یہ جہاں کارگہِ شیشہ گراں آج بھی ہے　　زندگی شیشہ فروشوں کی دکاں آج بھی ہے

وہی چولہے ہیں وہی راکھ وہی آگ جمیل　　اور فضا میں جو دھواں تھا وہ دھواں آج بھی ہے

مئی ۱۹۶۶ء کے نگار میں مندرجہ ذیل مطلعے کے ساتھ

نہ وہ احترامِ خرد رہا نہ وہ اعتبارِ دُعا رہا
جو اُمید دل سے چلی گئی تو خودی رہی نہ خدا رہا

چھپی ہے! اس میں صرف سات اشعار ہیں مقطع یہ ہے

مری عقل راہ میں مظہری کھڑی دیکھتی ہے اِدھر اُدھر
کہ جنوں نے ترکِ سفر کیا تو کوئی نہ راہ نما رہا

"مثلث" کے عنوان سے آٹھ بندوں کی ایک نظم جنوری فروری ۱۹۶۸ء کے نگار میں چھپی ہے ابتدائی اور آخری بند یہ ہیں

پردہ بھی کیا جلوہ بھی کیا جلوہ بھی کیا پردہ بھی کیا
آنکھوں سے گواہی عشق کی لی لو دیکھے نہیں جھوٹا بھی کیا

اک کھیل رچایا جلووں کا رسوا بھی ہوئے رسوا بھی کیا
کہتے ہیں جسے سب ننگِ وفا وہ رسم جمیل ایجاد بھی کی
شکوے بھی کیے فریاد بھی کی تسکینِ دلِ ناشاد بھی کی
جب حسن نے چپ کی داد نہ دی تو حشر اٹھے پھر نالہ بھی کیا

منظومات کے علاوہ علامہ جمیل مظہری کا ایک مضمون بعنوان "میرا نظریۂ شعر" اکتوبر، نومبر ۱۹۶۳ء کے نگار پاکستان میں دو قسطوں میں چھپا ہے معرکہ آرا مضمون ہے۔ مقالہ نگار کی وسعت مطالعہ دقتِ نظر اور شعر و ادب کے بارے میں زاویۂ نگاہ کا پتہ دیتا ہے اس سے صرف جمیل مظہری کے فکر و فن کو نہیں ادبیات و شعریات کے عام مسائل کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جمیل مظہری کی زندگی اور فن کے بارے میں ارشد کاکوی کے بھی دو اہم مضامین دسمبر ۱۹۴۵ء اور اگست ۱۹۴۵ء کے نگار میں شائع ہوتے ہیں پہلے میں جمیل مظہری کے کلام پر براہِ راست گفتگو کی گئی ہے دوسرے میں اُن کمزور اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں جو علامہ مظہری کے کلام پر اُن کے بعض ناقدین نے کیے تھے۔ علاوہ ازیں جمیل مظہری کے سلسلے میں علی اکبر نقوی اور سید محمد کاظمی کے مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں نقوی صاحب کا مضمون نومبر ۱۹۵۸ء میں اور کاظمی کا فروری ۱۹۶۳ء میں چھپا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں علامہ مظہری، نیاز اور نگار کے باہمی رشتوں کی استواری کا اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا۔ نیاز نے ہمیشہ مظہری صاحب کے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ انہیں صفِ اوّل کا شاعر تسلیم کیا اور اُن کے کمالات کی دل کھول کر داد دی۔ مظہری صاحب نے نیاز و نگار کی رفاقت کی اور رفاقت کو اپنے حق میں باعثِ توقیر جانا اور ان کے وقار کو عمر بھر عقیدت کی نگاہ سے دیکھا۔ تعلقات قلبی کا ایک معجزہ آخر آخر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ علامہ مظہری نے بحیثیت پروفیسر اور محقق اپنی تاریخ وفات ۲۳ جولائی ۱۹۸۰ء سے کچھ قبل جو مقالا ملاحظہ فرمایا وہ علامہ نیاز فتح پوری سے متعلق پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ تھا اور جو شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

اُردو مرثیہ

تاریخ اخلاق اور ادب کے آئینے میں

اُردو کے اکثر اصنافِ سخن دوسری زبانوں خصوصاً عربی و فارسی سے ماخوذ ہیں۔ لیکن شہدائے کربلا کا مرثیہ، جیسا کہ وہ اُردو میں رائج ہے
ی سے ماخوذ نہیں یہ اُردو ہی سے مخصوص ہے۔ اُردو ہی میں اس کی بنیاد پڑی۔ اور اسی زبان میں نشو و نما پا کر یہ اپنے درجۂ کمال کو پہنچا۔ ویسے تو ان تمام
ظموں کو مرثیہ کہا جا سکتا ہے جو دُنیا بھر کے شاعروں نے اپنے کسی عزیز یا دوست یا کسی بڑے آدمی کی وفات پر لکھی ہیں۔ لیکن ایسے مرثیوں کا ہمارے
ردو مرثیے سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ہمارے مرثیے محض شاعروں کے ذاتی جذبات کا اظہار نہیں ہوتے بلکہ اُمتِ مسلمہ کے ایک وسیع طبقے کے مذہبی جذبات
ی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ہمارے مرثیے عزاداری کی مجلسوں میں سُنانے کے لئے لکھے گئے ہیں اور ان کا بنیادی مقصد سامعین کو شہدائے کربلا کی یاد
ونا اور رُلانا اہلِ مجلس کے لئے باعثِ نجات تصور کیا جاتا تھا۔ مرثیے کا مجلسِ عزا سے ویسا ہی گہرا تعلق ہے جیسا ڈرامے کا اسٹیج سے۔ اُردو مرثیہ ہمیشہ
جلسِ عزا سے وابستہ رہا اور مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقے کے دینی و اخلاقی عقائد کا آئینہ دار رہا۔

جب ہم یہ سمجھ لیں کہ مرثیے مجلسوں میں پڑھنے کے لئے لکھے جاتے تھے، اور در اصل سماعت سے تعلق رکھتے تھے تو ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ پڑھنے والے
ی قوت مرثیہ خوانی اور سُننے والوں کی مدت سماعت سوڈیڑھ سو بندوں سے زیادہ بڑے مرثیہ کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔ یہی مجبوری تھی جس کی وجہ سے مرثیہ نگار
بھی اس طرف متوجہ نہیں ہوتے کہ وہ واقعۂ کربلا کو شروع سے آخر تک حُسنِ ترتیب و تعمیر کا خیال رکھتے ہوتے ایک ہی طویل مرثیے میں بیان کر دیں۔ اس لئے
وہ ہمیشہ کسی ایک شہیدِ کربلا کو مرکزی کردار بنا کر چند خاص واقعات کے بیان تک ہی اپنے مرثیے کو محدود کر دیتے تھے۔ مرثیے کا تعلق سماعت سے ہونے کا
یک اور نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ جب ہم کسی مرثیے کو پڑھتے ہیں تو ہم پر اس کا ویسا شدید تاثر پیدا نہیں ہوتا جیسا منبر پر کسی ماہر مرثیہ خوان کو پڑھتا ہوا
یک فضا قائم کرتے ہوئے دیکھنے اور سُننے سے پیدا ہوتا ہے۔ منبر پر بیٹھ کر پڑھے جانے کی وجہ سے مرثیے کی صنف میں ڈرامائیت بھی لا محالہ پیدا ہو گئی
ہ انسانی فطرت ہے کہ جب وہ کسی واقعے کو بیان کرنے لگتا ہے تو صرف اُن الفاظ پر ہی اکتفا نہیں کرتا جو اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں بلکہ جسم کی ساخت سے
اپنی حرکات و سکنات سے، جنبش پا و دست سے اور مختلف اعضائے جسم کے اشاروں سے، اور ایسے ہی دوسرے ذرائع سے کام لیتا ہے تا کہ اپنا
یان کو نہ صرف زیادہ قابلِ فہم بنا سکے بلکہ سُننے والوں کو زیادہ متاثر کر سکے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرثیے کے ان پہلوؤں کو جن میں ڈرامائی عناصر
یدا ہو سکتے اسی طرح لکھنے کی بھی کوشش کی گئی۔ جس سے حسبِ موقع تعجب، خوف یا اچانک تبدیلی کا تصور پیدا کیا جا سکے۔ سید عابد علی عابد نے
ٹھیک لکھا ہے کہ مرثیہ ایک بیانیہ نظم ہی نہیں رہا بلکہ ڈرامے کی حدود میں بھی داخل ہو گیا۔ ڈرامے میں جب تک وہ محض تحریری صورت میں رہتا ہے اس کا تاثر

عناصر ترکیبی مخفی یا مستور رہتے ہیں اور جب اداکار اسٹیج پر آ کر سامعین و ناظرین کے سامنے اپنی گفتگو سے اپنی حرکات کا اور اپنی حرکات سے مفہوم سمجھاتے ہیں، ڈرامے کی کہانی کی انفرادی تعبیر و تشریح پیش کرتے ہیں۔ تب تحریری صورت تمثیل یعنی ڈرامے کا روپ دھارتی ہے۔ اس وقت کردار زندہ ہو جاتے ہیں، کشمکش جاگ پڑتی ہے، مکالمات معنی خیز ہو جاتے ہیں۔ مختلف اداکاروں کے عمل سے ایک مجموعی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس مجموعی فضا کی تشکیل کا سب سے مؤثر چیز اداکار کی جیتی جاگتی شخصیت کی نمود ہوتی ہے۔ اس کے لبوں سے تمثیل نگار کے کردار صرف بولتے ہی نہیں بلکہ اپنے دل اور تمثیل کے پلاٹ کی گرہیں کھولتے ہیں۔

بالکل اسی طرح ایک اچھا مرثیہ خوان مرثیہ پڑھتے وقت اپنی صداکاری، اداکاری سے مختلف افرادِ مرثیہ کے روپ دھارتا ہے اور محفل کے لیے وہ فضا پیدا کرتا ہے جو اسٹیج کے ڈرامے میں مختلف عناصر سے ترکیب پاتی ہے۔ بزم، رزم، رخصت۔ بین ہر منظر ایک ہی طرح نہیں پڑھا جاسکتا۔ بچوں، بوڑھوں، عورتوں، مردوں، دوستوں اور دشمنوں کے متعلق بند پیش کرتے ہوئے آواز اور لب و لہجہ میں مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیوں کو خود پڑھیے تو اور ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور کسی سے ڈرامائی انداز میں سنیے تو نیا سماں بندھتا ہے۔ انیس کے ایک مرثیے سے بند دیکھیے جس میں ڈرامائیت نمایاں ہے ؎

جب لاشۂ قاسم کو علمدار نے دیکھا
قبضے کی طرف غیظ سے جرار نے دیکھا

منہ بھائی کا رو کر شہِ ابرار نے دیکھا
کی عرض بڑا داغ نمک خوار نے دیکھا

تینوں سے عجب سرو رواں کٹ گیا آقا
واللہ کہ دل زیست سے اب ہٹ گیا آقا

بے چین کیا دل کو غم راحتِ جاں نے
کیا پیاس کی تکلیف سہی غنچہ دہاں نے

دنیا سے کیا کوچ عجب سروِ رواں نے
لوٹا یہ چمن فصلِ بہاری میں خزاں نے

ہم خلق سے پہلے نہ سفر کر گئے افسوس
جینے کے جو قابل تھے وہ یوں مر گئے افسوس

پامال ہوا گھوڑوں سے تن وائے مصیبت
لوٹا گیا شادی کا چمن وائے مصیبت

بیوہ ہوئی ایک شب کی دلہن وائے مصیبت
بے شمع ہوئی قبر حسنؓ وائے مصیبت

تازہ تمہیں پھر بھائی کا غم ہو گیا آقا
دو گھر بستے برباد ستم ہو گیا آقا

تلوار چلی دل پہ بھتیجے کے الم سے
ٹپکا کیا چہرے پہ لہو دیدۂ نم سے

کچھ بس نہ چلا حکم شہنشاہ امم سے
دیکھا کئے کیا خوب حفاظت ہوئی ہم سے

قاسم کے عوض تیغ و سناں کھا نہ سکے ہم
پامال بھتیجا ہوا اور جا نہ سکے ہم

واللہ کہ قاسم کی بھی تقدیر تھی کیا خوب
سامان وہی ہو گیا جو تھا انہیں مطلوب

سرسبز ہوا سید معصوم کا محبوب
اک ہم ہی کہ بہنوں سے خجل بھائی سے محجوب

منہ زینب ناشاد کو دکھلا نہیں سکتے
بھاوج کے بھی پرسے کے لئے جا نہیں سکتے

مرثیہ جس زبان میں بات کرتا ہے وہ مسلمانوں کے ایک خاص طبقے کے عقیدے اور عقیدت کی زبان ہے۔ مرثیہ پڑھنے یا سننے والے اگر اس زبان سے آگاہی نہ حاصل کریں تو پھر مرثیوں کے ڈرامائی پیچ و خم افراد حادثۂ کربلا کا عمل اور ردعمل مختلف کرداروں کی گفتگو اور مبہم کی مختلف سطحیں بنتے ہوئے واقعات کی طرف لطیف اشارے یہ تمام باتیں ان کی نظروں سے اوجھل رہیں گی۔

مرثیہ اصلاً ایک ایسے واقعے کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتا ہے جس کا تعلق مذہبی عقائد سے بھی ہے اور ایسی روایات سے جن کی تاریخی تائید و توثیق نہیں ملتی۔ جہاں تک واقعۂ کربلا کا تعلق ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس کے اسباب و علل اور اثرات کی نوعیت ہمیشہ زیر بحث رہی ہے۔ پھر بھی اس کے واضح خدوخال ہیں جنہیں زمان و مکان کے آئینے میں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ حقیقتیں ایسی ہیں جن میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ حضرت امام حسینؓ کا حسب نسب، عربی معاشرے میں ان کا مقام، یزید سے ان کا اختلاف، جلاوطنی، کربلا میں مختلف قسم کے شدائد و مصائب جھیل کر شہید ہونا اور خاندان کی ذی عزت خواتین کا قید ہو جانا۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ اختلاف ہے تو کچھ ان جزئیات میں ہے۔ مرثیہ

واقعہ کربلا کی تاریخی حیثیت اور ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے اور نہ عام طور پر انہوں نے کی چنانچہ اسی لئے مرثیہ نگاروں نے اور خاص کر میر انیس نے تاریخی واقعات بیان کرنے کے بجائے تاثرات و تصورات، جذبات اور کیفیات کی وہ فضا پیدا کر دی جو کربلا کے المیے کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے پر ان کے دل میں پیدا ہوئی۔

مرثیہ نگار تاریخ نگار تو ہوتا نہیں کہ محض واقعات کے بیان پر اصرار کرے۔ کوئی تاریخی واقعہ شاعر کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو تاریخ کے مفہوم میں تاریخ نہیں رہ جاتی اور مرثیوں کو پڑھتے ہوئے یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیئے۔ اگر کسی کو واقعہ کربلا کی جزئیات کی تاریخی واقعیت، صداقت اور صحت مطلوب ہو تو اُسے کسی مستند و معتبر تاریخی کتاب ہی سے رجوع کرنا چاہیئے نہ کہ مرثیوں سے کیونکہ مرثیے کا کسی تاریخی واقعے پر مبنی ہونا تو ضروری ہے مگر جزئیات میں مؤرخانہ احتیاط سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مرثیوں کا بنیادی مقصد سامعین کو رلانا تھا اس لئے اس مقصد کے حصول کے لئے مرثیہ نگار نہ صرف جزئیات میں روایتی، غیر مستند اور غیر تاریخی باتیں نظم کرتے تھے۔ بلکہ خلاف فطرت امور کی بھی آمیزش کر دیتے تھے۔ جب کسی نے میر انیس پر جو اُردو کے سب سے بڑے مرثیہ نگار مانے جاتے ہیں یہ اعتراض کیا تھا کہ آپ کچھ ایسی روایات بھی نظم کرتے ہیں جو تاریخ حقیقت اور واقعے کے خلاف ہے۔ میر انیس نے جواب دیا تھا۔ کہ تاریخی واقعات کو تاریخی طریقے پر بیان کرنے سے رقت طاری نہیں ہو گی۔ غرض یہ ہے کہ مرثیے کی غائیت سے جو باتیں مربوط ہیں اُن کو ایک مؤرخ یا محقق کی نظر سے جانچنا مرثیہ نگار پر ظلم کرنا ہے، دیکھنا یہ چاہیئے کہ جزئیات کے معاملے میں مرثیہ نگاروں نے تاریخ سے جو انحراف کیا ہے اور اپنی طرف سے جو انحراف کیا ہے اور اپنی طرف سے جو اضافے کئے ہیں۔ اس سے اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے کہ نہیں۔ اس سوال کا جواب بلا شبہ اثبات میں ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مرثیہ نگار، روایات اور غیر مستند تاریخی امور اور خلافِ فطرت باتوں کے اضافے سے اور عربی ماحول عربی کرداروں کو اپنے مقامی ماحول اور مقامی روایات و ماحول کے رنگ میں اپنے مرثیوں کو زیادہ رقت انگیز اور مؤثر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح اپنے سامعین کو رلانے کے لئے مرثیہ نگاروں کیلئے کیا یہ ضروری تھا کہ وہ شہدائے کربلا کی مظلومیت اور بے کسی و بے چارگی پر زیادہ زور دیتے چنانچہ انھوں نے اسی پر زیادہ زور دیا۔ کربلا کے واقعات میں ہی ایسے کہ اُنہیں سُن کر ہر درد مند دل والے انسان کو رونا آجاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرثیوں میں صرف شہدائے کربلا کی مظلومیت اور بیکسی و بے چارگی پر زیادہ زور دیتے چنانچہ انہوں نے اسی پر زیادہ زور دیا اور تلقین کے دفتر کھولے بغیر افراد مرثیہ کے عمل سے اخلاقیات کا ایک لازوال خزانہ پیش کر دیا ہے۔ حضرت سید نا حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے عمل سے جو اعلیٰ اخلاقی نمونے پیش کئے ہیں ان کا ڈرامائی اثر خود اپنی طرف سامعین اور ناظرین کو متوجہ کر لیتا ہے۔ شاید ہی دُنیا کا کوئی واقعہ بیک وقت زندگی کے اتنے اہم پہلوؤں کو پیش کر سکے اور چند مردوں، عورتوں اور بچوں کے عمل سے ان کی ناقابلِ فراموش صورتگری ہوئی ہو۔ معرکہ کربلا نے زندگی اور موت، حق و باطل نیکی اور بدی کی متضاد قدروں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا تھا۔ اور ان کا مظاہرہ فیصلہ کن انداز میں ہو گیا تھا۔ مرثیوں کی اصل اخلاقی کشش ان حصوں میں ہے جہاں اپنے مقصد کی صداقت، برتری اور گہرائی پر کامل یقین رکھتے ہوئے بچے، بوڑھے، عورت اور مرد سب موت کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں تاکہ حضرت حسینؑ کے مقصد کو تقویت پہنچے۔ جناب سید الشہداء اور ان کے عزیزوں اور ساتھیوں کے آلام و مصائب کا بیان اور ان مصائب کے سیاق و سباق میں ان کے صبر، استقلال، رضا و تسلیم، شجاعت و غیرت، خدا ترسی و استقامت، ہمدردی وفاداری، حمیت و عزم کی تصویر کشی، نہ صرف سامعین و ناظرین کے ایمان کو تازہ کرتی ہے بلکہ خاندانِ نبوت کے ساتھ رشتہ محبت و اخلاص کو بھی مضبوط کرتی ہے اور ان کے اخلاقِ فاضلہ کی پیروی کرنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہمارے مرثیوں کے موضوع میں ہماری اخلاقی اصلاح اور جذباتی تزکیے کا قیمتی سامان موجود ہے۔ حمایت حق میں قتل و بے دریغ جانبازی و سرفروشی کے جو نمونے سید الشہدا اور اُن کے ساتھیوں نے پیش کئے اور جن کا بیان موثر پیرائے میں مرثیوں میں موجود ہے ہیں بہترین اخلاقی درس نہیں دیتے۔ بعض لوگ مرثیوں میں حضرت حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی گریہ زاری پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ ان کی سیرت کے ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیئے کہ شہدائے کربلا اور ان کے متعلقین نے جرأت و عزیمت، صبر و رضا اور ثبات نفس کا مظاہرہ بالکل ف کیا تھا لیکن اپنے پہلو میں نرم و نازک جذبات سے بھرا ہوا دل ضرور رکھتے تھے۔ اور ان عالی مرتبت شخصیتوں کو ایک دوسرے سے شدید جذباتی تگی اور آپس میں خون کی محبت بھی تھی۔ اُردو کے مرثیوں میں اور خصوصاً بڑے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں میں ہم انسان کو اس کے خاندانی رشتوں میں یعنی بنیادی ماحول میں دیکھتے ہیں۔ باپ۔ بیٹے۔ بھائی بھائی، چچا بھتیجے، ماموں بھانجے، ماں بیٹی، ساس بہو، نند بھاوج، شوہر بیوی، غرض خاندانی رشتے کی شکل ہے جس نے مرثیہ نگاروں کے دل کو متاثر نہیں کیا۔ حضرت عباسؑ جیسا بھائی شہربانوؑ جیسی بیوی، زینبؑ جیسی بہن، قاسم جیسا بھتیجا، عون جیسے بھانجے اردو مرثیوں کے سوا اور کس صنف ادب اور کس زبان کے ادب میں مل سکتے ہیں؟ ہمارے مرثیہ نگاروں نے ہم پر یہ بخوبی واضح کردیا ہے کہ انسانی ندانی رشتوں کا نام ہے۔

البتہ اتنا ضرور ہے کہ سامعین پر رقت طاری کرنے اور انہیں رُلانے کے لئے واقعۂ کربلا کے کرداروں کو اپنے پیاروں کے بچھڑ جانے پر خاموشی کے ساتھ اشکباری کرنے کی بجائے ماتم کرتے، سینہ کوٹتے، سر پیٹتے اور دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اتنا مبالغہ اپنے بنیادی مقصد کو حل کرنے کے لئے مرثیہ نگاروں نے ضرور روا رکھا ہے کہ اس سے آہ و بکا کی فضا پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ انسانی رشتوں شاعری اُردو کو مرثیہ نگاروں کی دین ہے اور یہ رشتے تجریدی نہیں ہیں۔ مرثیہ نگاروں کی رُوح میں موجود ہیں بلکہ خود ان کے وجود کی جڑیں خاندانی سانی معاشرے کی بنیاد ہے بلکہ خود انسانیت ہے۔ خاندان کے بغیر ہم انسان کا تصور کر ہی نہیں سکتے۔ اور خاندان کی وابستگیوں کو ن طرح مرثیہ نگاروں نے سمجھا اور سمجھایا ہے کسی اور صنف کے شاعر نے نہیں سمجھا اور نہ سمجھایا۔

انیسویں صدی کے آغاز سے مرثیہ نگاروں کی نظر میں کامیابی کا معیار یہ ہو گیا تھا کہ شہادت کے بیان سے پہلے لوگ واہ واہ ریں اور شہادت کا ذکر سن کر گریہ و بکا کریں۔ جن مجلسوں میں مرثیے پڑھے جاتے تھے وہاں لوگ اگرچہ ثواب حاصل کرنے خیال ہی سے جاتے تھے لیکن ان کا شعری و ادبی ذوق اس قدر ترقی یافتہ تھا کہ وہ لطف سخن بھی چاہتے تھے۔ سامعین کے ۔ق زبان و ادب اور لطف سخن کی تسلی کے لئے اور ان سے واہ واہ، سبحان اللہ سننے کے لئے ضروری تھا کہ مرثیہ ادبیت و عریت کا بھی حامل ہو۔ اس میں لسانی محاسن بھی ہوں اور ادبی خصائص بھی۔ چنانچہ اس لئے ضمیر و خلیق اور انیس و دبیر نے ہ اپنے مرثیوں میں ٹکسالی زبان استعمال کرنے کا بھی اہتمام کیا اور محاوروں خوش آہنگ ترکیبوں، دلکش اور جدید تشبیہوں اور لفظی و معنوی صنعتوں کا بھی۔ چہرہ سراپا میدان کارزار میں ہیرو کی آمد، رجز اور مبارز طلبی، معرکہ آرائی اور منظر نگاری کا ، جدتیں بھی اپنے مرثیوں میں پیدا کیں۔ اور مرثیے کو جو اٹھارہویں صدی تک ناقص زبان میں محض بین و ماتم پر مبنی مختصر ، نظم ہوا کرتا تھا اس پست سطح سے اٹھا کر باوقار ادبی سطح پر پہنچا دیا۔ اب مرثیہ صرف مرثیہ نہیں رہا بلکہ ایک منظوم

رزمیہ اور المیہ بن گیا۔

اگر ہم انیس و دبیر کے کسی مرثیے کا ادبی نظر سے غائر مطالعہ و تجزیہ کریں تو یہ دیکھیں گے کہ اس کے چہرے یا تمہید قصیدے کی تشبیب جیسا رنگ ہوگا۔ اور شہادت کے لئے طلب رخصت کی نوعیت قصیدے کے گریز سے مماثل ہو ہیرو کے سراپا میں غزل کا رنگ ہوگا۔ البتہ غزل کے سراپا کی سی شوخی و بیباکی اس میں نہ ہوگی تاہم رنگینی ضرور ہوگی پھر میدانِ کارزار میں ہیرو کی آمد اور رجز خوانی و مبارز طلبی میں ویسی ہی مضمون آفرینی اور مبالغہ و اغراق ہوگا جیسا قصیدے کے مدحیہ میں ہوتا ہے۔ معرکہ آرائی اور فنونِ جنگ کے بیان میں مثنوی کا سا بیانیہ انداز بھی ہوگا اور قصیدے کا سا شکوہ و طمطراق بھی۔ آخر میں شہادت کا بیان ہوگا جس میں بین بھی شامل ہوگا اور اس حصے میں مثنوی کا تسلسل اور تمثیل نگاری کے عناصر ملتے ہوں گے۔ درمیان میں جہاں ہیرو کے گھوڑے اور تلوار کی تعریف ہوگی وہاں قصیدے اور غزل کا ملا جلا رنگ محسوس ہوگا۔ اس طرح مجموعی طور پر ہم دیکھیں گے کہ مرثیہ ایک ایسی ادبی صنف ہے جس میں مثنوی، غزل، قصیدہ، ڈراما اور بیانیہ نگاری منظر نگاری و جذبات نگاری سب کا امتزاج ہے۔

اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ مذہبی عقیدت اور مرثیت بھی ملی ہوئی ہے جو اسے اخلاقی شاعری کے دائرے میں لے آتی ہے۔ انہی مختلف النوع اجزاء اور عناصر کے امتزاج اور ترکیب میں مرثیے کی ادبی انفرادیت کا راز پوشیدہ ہے۔ دیکھئے مرزا دبیر حضرت عباسؑ کا سراپا کس طرح کھینچتے ہیں۔ ایک بند پڑھیے

اک حاشیہ اس روئے کتابی کا ہے قرآن
اس گنج کا دینار ہے اک یوسفِ کنعان
اک شعلہ ہے اس شمع کا خورشید درخشاں
اس باغ کی شبنم ہے بہشتوں کا گلستاں
اللہ رے عجب حسن و لطافت کا ہے چہرہ
یہ ابنِ شہنشاہِ ولایت کا ہے چہرہ

حضرت امام حسینؑ میدانِ کارزار میں جانے کے لئے اپنے اہلِ خاندان سے رخصت طلب کرتے ہیں۔ میر انیسؔ کے ایک مرثیے سے اس موقع کے دو بند سنیے:۔

جب پڑھ چکے شہ بعد فریضے کے دعائیں
فرمایا کہ رخصت کے لئے بیبیاں آئیں
چھاتی سے پھر اک بار سکینہ کو لگائیں
کچھ باتوں بھی کہہ لیویں تو سر دینے کو جائیں
بیووں سے ملاقات کی فرصت نہ ملے گی
پھر عصر تلک بات کی مہلت نہ ملے گی

ننھے لیے وہ بیبیوں کا سامنے آنا
شبیر کا ایک ایک کو چھاتی سے لگانا
وہ بانو کا سر پائے مبارک پہ جھکانا
وہ شاہ کا قسمیں سر اکبر کی دلانا
رُخ زرد تھا بے پردہ ہر اک بی بی کا سر تھا
ماتم کا مرقع، شہ مظلوم کا گھر تھا

حضرت عون و محمدؑ کی میدان جنگ میں آمد کا بیان سنیئے۔

غل ہے اعدا میں کہ زینب کے پسر آتے ہیں
شور ہے بحر شجاعت کے گہر آتے ہیں
آفتاب فلک فتح و ظفر آتے ہیں
لاکھ سے لڑنے کو دو تشنہ جگر آتے ہیں
آمد آمد ہے دلیروں کی خبردار رہو
صف جمائے ہوئے آمادہ پیکار رہو

حضرت عون و محمد کی زبان سے رجز کا بھی ایک نمونہ دیکھئے۔

جوں علیؑ ولولۂ تیغ زنی رکھتے ہیں
ہاتھ میں قوت خیبر شکنی رکھتے ہیں
دل بے کینہ میں خلق حسنی رکھتے ہیں
طبع میں حلم حسین مدنی رکھتے ہیں
صاف باطن ہیں دغا کی نہیں باتیں ہم میں
جمع ہیں سارے بزرگوں کی صفاتیں ہم میں

جناب قاسم میدان کارزار میں داخل ہو کر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ رزم کے اس منظر کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

یہ کہہ کے اپنے گھوڑے سے نیزے کو دی تکان
چمکی انی تو برق پکاری کہ الامان
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں
ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کہے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

حضرت قاسم کی شہادت کا بیان بھی سن لیجئے۔ ان کی لاش مبارک میدان جنگ سے خیمے میں آتی ہے۔

ڈیوڑھی پہ لائے لاش جو سلطان بحر و بر
پردہ اٹھایا خیمے کا فضہ نے دوڑ کر
لاشے کے پاؤں تھامے تھا کوئی تو کوئی سر
چادر کمر کی پکڑے تھے عباس نامور
لٹکی تھیں دونوں خاک پہ زلفیں اٹی ہوئی
رخ پہ پڑی تھیں سہرے کی لڑیاں کٹی ہوئی

حضرت علی اکبر کی شہادت پر حضرت امام حسینؑ کا بین بھی سنئے

اکبر کا پتہ جب کہ کسی نے نہ بتایا
صحرا کو چلا حیدرؑ کرار کا جایا
فرزند کو جنگل میں تڑپتا ہوا پایا
چلائے کہ کیا حال ہے بیٹا پدر آیا
اٹھارہ برس بعد ہمیں چھوڑتے ہو تم
بیٹا پڑے اس خاک پہ دم توڑتے ہو تم
بیٹا مرا جاتا ہوں میں آواز سناؤ
ہم آئے گلے ملنے کو ہاتھوں میں اٹھاؤ
برچھی کا کہاں زخم لگا مجھ کو دکھاؤ
گر اٹھ نہیں سکتے تو میری گود میں آؤ
بچپن میں پھرا ہوں تمہیں کاندھے پہ چڑھا کر
لے جاؤں گا اب لاش کو چھاتی سے لگا کر

اب ذرا گھوڑے کی تعریف کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

اللہ رے نزاکت، فرس غنچہ دہن کی
آتی ہیں نظر صاف رگیں گل سے بدن کی
سیرت ہے اگر شیر کی صورت ہے ہرن کی
دانتوں میں ٹھہرتا نہیں بو سونگھ کے رن کی

وحشی ہے کہ گذر جائے صد چرخ بریں سے
ہر جست میں یہ قصد کہ اڑ جاؤں زمیں سے

اور تلوار کی مدح میں دبیر کو سنیئے

چھل بل تھی، چھلاوہ تھی، طلسمات تھی اسرار
چالاک، سبک بار، طرح دار، نمود دار -

نیزہ کہیں، خنجر تھی کہیں اور کہیں تلوار
بجلی تھی کسی جا تو کہیں نور کہیں نار

سیماب تھی، سیلاب تھی، طوفاں تھی ہوا تھی
شعلہ تھی، شرارہ تھی، قیامت تھی، بلا تھی

منظرِ قدرت کے بیان کا بھی اس بند سے اندازہ کیجئے

وہ سرخیٔ شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ بار ور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار

شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آب دار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

مشتے نمونے از خروارے، یہ چند مثالیں یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اردو مرثیے نے کس طرح محاکاتی
نظریہ، بیانیہ، بزمیہ، رزمیہ، المیہ، ڈرامائی، مکالماتی، مدحیہ، جذبات نگارانہ اور سیرت نگارانہ شاعری
ے اردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ اردو مرثیے نے ہماری شاعری کو بلند اخلاقی قدریں بھی عطا کی ہیں۔ اور ان قدروں کو عملی کرداروں کے
پ میں پیش کیا ہے۔ خاندانی رشتوں اور سماجی زندگی کے مرقعوں سے اردو کے نگارخانے کو آراستہ کیا ہے۔ زبان و
بیان میں وسعت، تنوع، عظمت اور رفعت پیدا کی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس عظیم ایثار و قربانی کو موضوع بنا کر
۔ جو ریگزار کربلا میں وقوع پذیر ہوئی۔ مرثیہ اپنے بنیادی محرک تخلیق کے لحاظ سے مذہبی سہی اور اس کی اصلی غایت
رونا رلانا سہی، لیکن یہ صرف اس حد تک محدود نہیں رہا بلکہ خالص ادب کے دائرے میں داخل ہو گیا۔

؎ کم ہے جو اس سخن پہ جواہر کریں نثار

جگن ناتھ آزاد

اُردو زبان اور اس کا صحیح استعمال

اردو زبان اور اس کے صحیح استعمال سے متعلق بات چیت شروع کرتے ہی سب سے پہلے جو سوال سامنے آتا ہے یہ ہے کہ صحیح استعمال سے کیا مراد ہے۔ کیا اردو زبان کا صحیح استعمال وہ ہے جو لکھنؤ میں ہوتا ہے یا وہ جو دہلی میں ہوتا ہے۔ اور یہ بات صرف لکھنؤ یا دہلی تک ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ دور تک پہنچتی ہے

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، اور اردو جموں و کشمیر سے تمل ناڈو تک اور آسام سے راجستھان تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے پاکستان کا ذکر کئے بغیر بات مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ زبان پشاور سے کراچی تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ گویا اردو کا علاقہ دوسرے لفظوں میں آسام سے شمال مغربی سرحدی صوبے تک اور جموں و کشمیر سے تمل ناڈو اور کیرل تک ہے، جس میں مہاراشٹر، مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش سب آجاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا پشاور سے کیرل تک اور گوہاٹی سے کراچی تک کسی زبان کا تلفظ، لب و لہجہ، محاورہ روزمرہ ایک سا رہ سکتا ہے؟ غالباً نہیں رہ سکتا۔ برطانیہ ایک چھوٹا سا ملک ہے وہاں KINGS ENGLISH ملک کے کونے کونے تک نہیں پہنچ سکی۔ لندن کے مضافات میں جو انگریزی بولی جاتی ہے وہ برطانیہ سے باہر کے انگریزی دانوں کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آسکتی۔ دو چار دن کی مشق کے بعد ہی اس کا مفہوم پلے پڑ سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے مشاعرے کی بدولت اس کے شین قاف کا معیار ملک کے طول عرض میں خاصی حد تک ایک ہی طرح کا رہا اور آج تک چلا آرہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود زبان کے کتنے ہی پہلو ایسے ہیں جن کے متعلق یہ توقع کرنا کہ وہ پشاور سے مدراس تک ایک خاص معیار کے ہوں تو زبان صحیح ہے ورنہ غلط زبان کے مستقبل کو تاریک بنانے کی کوشش ہے۔

اردو جو تھوڑی بہت میں جانتا ہوں وہ میرے والد مرحوم کا فیض تو ہے ہی لیکن اردو باقاعدہ طور پر سیکھنے

سلسلے میں نے لاہور میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ انہوں نے مجھے زبان کے محاسن و معائب سے اور باریکیوں سے آشنا کیا۔ لیکن وہ بھی یہ کہتے تھے کہ پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں اور چراغ حسن حسرت کی اردو دانی اہل زبان کے لئے مثالی حیثیت رکھتی ہے، حالانکہ اردو کے صحیح استعمال کے متعلق مولانا ظفر علی خاں اور چراغ حسن حسرت میں اکثر اختلاف رائے موجود رہتا تھا۔ یہ بیان کرنے سے میرا مقصد صرف اس امر پر روشنی ڈالنا ہے کہ جب پنجاب کے دو ایسے زبان دانوں کی زبان مستند قرار دی جا سکتی ہے جو زبان کے صحیح استعمال کے تعلق سے آپس میں اختلاف رکھتے ہوں تو زبان کے صحیح استعمال کا کیا معیار باقی رہا۔

جوش ملیح آبادی کے ساتھ میری زندگی کے آٹھ نو برس بسر ہوئے اور اس طرح نہیں کہ صرف "آج کل" کے دفتر ہی میں ملاقات ہوتی ہو بلکہ اُن کا اور اس خاکسار کا صبح شام کا اور دن رات کا ساتھ تھا۔ انہوں نے ایک موقعوں پر یہ کہا بھی تھا کہ عرش ملسیانی تو میرا دن کا رفیق ہے لیکن جگن ناتھ آزاد دن اور رات کا رفیق ہے۔ اب اس رفاقت کے زمانے میں مجھے اردو اور اس کے صحیح استعمال کے متعلق عجیب و غریب تجربات ہوئے۔

جوش صاحب کی رائے یہ تھی اور آج بھی اُن کی یہی رائے ہے[1] کہ صحیح زبان وہ ہے جو لکھنؤ میں بولی جاتی ہے ایک دفعہ عرش ملسیانی کی درخواست پر یا میری گزارش پر علامہ برج موہن کیفی نے اپنا ایک غیر مطبوعہ مقالہ "آج کل" کے لئے مرحمت فرمایا۔ ہم لوگوں نے جوش صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے مقالہ دیکھنے کی خواہش کی۔ وہ مقالہ ہم نے انہیں دیا دو ہفتے بعد جب وہ ہمیں "آج کل" میں اشاعت کے لئے واپس ملا تو ہم نے دیکھا کہ اس میں جگہ جگہ زبان کی اصلاحیں موجود ہیں۔

اب ہم لوگ مشکل میں پھنس گئے۔ کیفی صاحب کی اردو نثر میں جوش صاحب نے اصلاحیں کر دی تھیں۔ اسے اگر اصل صورت میں چھاپتے ہیں تو جوش صاحب خفا ہوتے ہیں اور اگر جوش صاحب کی ترمیم کردہ صورت میں چھاپتے ہیں تو کیفی صاحب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ اسی تذبذب کے عالم میں پانچ سات ماہ گزر گئے۔ ادھر کیفی صاحب کی طرف سے دو ایک بار پیغام آیا کہ بھئی میرے مقالے کا کیا ہوا۔ آخر ہم نے بڑی مشکل سے جوش صاحب کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا اور کیفی صاحب کا مقالہ اصل صورت میں شائع کر کے اُن کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ گئے۔ اور سچ پوچھئے تو عرش اور میں نے ایک مصیبت سے نجات پائی۔

جوش صاحب کا ذکر آ گیا ہے تو زبان کے صحیح استعمال کے تعلق سے ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے۔ جوش صاحب اور ہم لوگوں کو ابھی "آج کل" کے دفتر میں ملازمت شروع کئے دو چار دن ہی ہوئے تھے

---

[1] یہ نشری تقریر جوش صاحب مرحوم کی زندگی میں لکھی گئی تھی۔

ایک دن اُن کے کمرے میں داخل ہوتے ہی حسبِ معمول کہا۔

آداب عرض جناب مزاج اچھے ہیں۔

جوش صاحب جیسے کسی رَو سے ضبط کئے بیٹھے ہوں۔ "آداب عرض" کا جواب دینے کے بعد فوراً بول اُٹھے

دیکھئے جناب مزاج اگرچہ مختلف کیفیتوں کا مجموعہ ہے

لیکن واحد ہے، جمع نہیں ہے۔

میں نے عرض کیا جب مزاج پرسی محض رسمی قسم کی نہ ہو بلکہ جس کی مزاج پرسی مطلوب ہو اس کے لئے دل میں عزت اور احترام کے جذبات موجود ہوں تو مزاج کو جمع کہنا ہی انسب معلوم ہوتا ہے۔

کہنے لگے بالکل غلط۔ احترام کی وجہ سے مزاج کا لفظ واحد کے عوض جمع تھوڑا ہی ہوجائے گا۔ اور پھر آپ نے اپنے جواب میں ایک غلطی کی ہے۔ یہ "جذبات" کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا "جذبہ" کی جمع۔ بولے "بالکل غلط جذبہ فارسی کا لفظ ہے۔ آپ نے اس کی جمع عربی قاعدے سے بنالی۔ یہ جمع کیسے ہوسکتا ہے۔

میں چونکہ جوش صاحب سے ہمیشہ زبان سیکھنے کا آرزو مند رہتا تھا اس لئے سوال کیا کہ پھر ہم جذبہ کی جمع کیا بولیں؟ کیا جذبات کی بجائے "جذبہا" کہیں یا ....." ابھی میں نے فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ جوش صاحب نے ٹوکا اور کہا کہ یہ "بجائے" کا کیا استعمال ہے؟ "بجائے" میں اضافت فارسی کی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں جذبات کی بجائے۔ یہاں آپ کو کہنا چاہیئے جذبات کے عوض۔

تو اس طرح سے زبان آموزی کا سلسلہ آٹھ نو برس چلتا رہا۔ صبح شام، دن رات، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کے صحیح استعمال کے بارے میں میرا مزاج بڑی حد تک جوش صاحب کے کھینچے ہوئے خطوط پر چل نکلا

جوش صاحب اس قسم کا سلوک ہر ایک کے ساتھ نہیں کرتے تھے بلکہ صرف اسی کے ساتھ جس کے ساتھ اُن کی بے تکلفی ہوتی تھی۔ اور دلی قرب محسوس کرتے تھے۔ ورنہ دوسرے لوگوں کے ایسے فقرات پر جو ان کے نزدیک غلط ہوتے تھے خاموش ہوجاتے تھے۔ یا منہ بنادیتے تھے۔ یا اپنا ایک خاص لفظ "کُو" اس طرح کہہ دیتے تھے کہ مخاطب سمجھ نہ سکے۔ لیکن ہم لوگ جو ان کے رمز شناس اور ادا فہم تھے ان باتوں کو غور سے دیکھا کرتے تھے، میرے لئے بالخصوص میری زبان کی اصلاح کے لئے ان تمام باتوں کی ایک رہنمایانہ حیثیت تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جوش صاحب کا نظریہ زبان کے صحیح استعمال کے بارے میں واقعی ایک مناسب اور متوازن نظریہ ہے یا افراط و تفریط کا شکار ہے۔ اگر جوش صاحب کے بتلائے ہوئے ضابطے پوری طرح سے پابندی کی جائے تو زبان غالباً جامد ہوکر رہ جائے گی۔ اس میں نئے نئے الفاظ، تراکیب اور خیالات کے نئے نئے پہلو شامل نہیں ہوسکیں گے۔ ایک دن میں نے ان سے اپنے اسی خیال کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر آ

بتائے ضابطوں کی شدت سے پابندی کی جائے تو زبان ترقی نہیں کر سکے گی۔ کہنے لگے یہ عجیب منطق ہے کہ جب آپ غلط زبان نہیں لکھیں گے زبان ترقی نہیں کرے گی۔ اس اصول کا اطلاق آپ انگریزی پر کیوں نہیں کرتے اردو پر کیوں کرتے ہیں۔

اب اس تصویر کا ایک اور رُخ دیکھئے

کئی برس کی بات ہے ہم لوگوں نے دہلی میں ایک اردو نمائش منعقد کی جو ۱۸۳۰ سے لے کر ۷۶-۱۹۷۵ تک کے اخبارات، رسائل اور کتابوں پر مشتمل تھی۔ محترم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس کا افتتاح کیا اور افتتاحیہ تقریر میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے اہل قلم اور دانشوروں سے یہ فرمایا کہ زبان کا مقصد ابلاغ اور ترسیل ہے (انہوں نے COMMUNICATION کا لفظ استعمال کیا تھا) اس لئے ادیبوں، شاعروں اور اہل قلم حضرات کو اپنی نظم و نثر میں وہ زبان استعمال کرنا چاہیے جو عوام کی زبان ہے اور گلی محلوں میں بولی جاتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی مثال دی اور کہا کہ ان کی شاعری اس لئے بنگال بھر میں مشہور ہے کہ ان کی زبان کو سمجھنے کے لئے لغت کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔

اس نمائش میں پنڈت جی کو نمائش کے ایک ایک پینل تک لے جانے اور ہر پینل کی تشریح کرنے کی خدمت میرے سپرد تھی۔ جب ہم مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے پینل پر پہنچے تو میں نے پنڈت جی سے عرض کیا کہ مولانا کی زبان تو وہ زبان نہیں جو ہر کوئی سمجھ سکے اور اگر معیار یہی مان لیا جائے کہ ادیب اور شعرا وہی زبان استعمال کریں جو عوام بولتے ہیں تو مولانا آزاد کی نثر کے ساتھ ہی غالب اور اقبال کی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ محض لائبریریوں کی زینت بن کر رہ جائے گا۔ پنڈت جی نے فوراً جواب دیا میں نے اس ادب پر تبصرہ نہیں کیا جو اس وقت لکھا جا چکا ہے بلکہ آپ حضرات کو مشورہ دیا ہے کہ آپ اپنی نظم و نثر کے ذریعے سے عوام کے قریب آنے کی کوشش کیجئے۔

گویا جو شفیق صاحب کے پیش کئے ہوئے انتہائی پہلو کے مقابلے میں یہ ایک دوسرا انتہائی پہلو تھا لیکن اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک ابلاغ و ترسیل کا تعلق ہے عوام تک پہنچنے کے لئے عوام کی زبان استعمال کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ابلاغ و ترسیل کا مسئلہ ایک شاعر اور ادیب کے سامنے بھی رہتا ہے اور ایک سائنسدان کے سامنے بھی، ایک ماہر سیاسیات کے سامنے بھی اور ایک تاریخ دان کے سامنے بھی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات کا بڑا مقصد ابلاغ اور ترسیل ہے۔ اب اگر ایک ماہر زراعت یا ماہر اقتصادیات کسی موضوع پر ریڈیو سننے والوں یا ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کو پیش کرتا ہے یا کوئی سیاستدان اپنے نظریے کی وضاحت کرتا ہے اور اس سے ہم یہ توقع کریں کہ اس کی تقریر خالص ادیبانہ انداز کی ہو اور اس کا شین قاف بھی درست ہو تو یہ مطالبہ غلط ہے۔ ایک ماہر زراعت یا ماہر اقتصادیات یا سیاستدان اس زبان کا جس میں وہ تقریر کرتا ہے

مسلّمہ حیثیت کا ادیب ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ مسلّمہ حیثیت کا ادیب نہ ہو اور اپنے علم کا ماہر ہو تو اس کی جگہ کوئی محض ادیب کیسے لے سکتا ہے اس موضوع پر تقریر تو وہی مقرر ہی کرے گا جو زراعت یا اقتصادیات کا ماہر ہوگا خواہ وہ صحیح زبان کے استعمال پر قادر ہو یا نہ ہو۔

تو گویا زبان کے صحیح استعمال کو ہمیں دو پہلوؤں سے دیکھنا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کا مقصد قومی اور ملکی مفاد کی خاطر محض خیالات کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اُس صورت میں زبان کی باریکیوں اور تلفظ کی اہمیت پر زور دینا بے سود ہے اور دوسرے یہ کہ یہ استعمال زبان اور ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے ہے۔ اُس صورت میں زبان کی تمام باریکیوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔

اور باریکیوں کی بات یہ ہے کہ آج سے چالیس سال قبل تک لفظ "دوران" کے بعد "میں" کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ آپ پرانے ادیبوں کی تحریریں دیکھئے بصیر حامد میں جوشؔ، ملسیانی اور جوش ملیح آبادی کی نثر دیکھئے "دوران" کے بعد "میں" کا لفظ آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا ۴۵-۱۹۴۴ء میں نہ جانے کیسے لیکن "دوران" کے بعد "میں" کا لفظ نہ لکھنے کی ابتدا ہوئی اور آج صورت یہ ہے کہ اگر "دوران" کے بعد "میں" لکھا ہو تو اسے بالعموم غلط تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض مثالیں تو ایسی بھی دیکھنے میں آئی ہیں کہ نئے ادیبوں نے پرانے ادیبوں کے مسوّدوں کو مرتب کرتے ہوئے اُن کی تحریر میں "دوران" کے بعد لکھا ہوا "میں" کا لفظ حذف کر دیا ہے۔ اب اس معاملے میں جہاں تک میرا تعلق ہے، میں "دوران" کے بعد "میں" ہمیشہ لکھتا چلا آیا ہوں، اور اب بھی لکھتا ہوں۔ اور آج بھی مجھے اردو کے بعض مستند ادیبوں مثلاً عاشق حسین بٹالوی، حامد علی خان، مالک رام اور صدیق جالندھری کی تحریروں میں "دوران" کے بعد "میں" لکھا ہوا ملتا ہے۔ لیکن اگر میرا کوئی طالب علم "دوران" کے بعد "میں" نہیں لکھتا تو میں اُسے غلط قرار نہیں دیتا۔ کیونکہ میری ناقص رائے یہ ہے کہ چلن کے راستے میں رکاوٹ ڈالنا زبان کی ترقی کے راستے میں رُکاوٹ ڈالنا ہے۔

آخر یہ چلن ہی تو ہے کہ جس کی رو سے "میں نے دہلی جانا ہے" کو غلط اور "مجھے دہلی جانا ہے" کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ جسے ہم صحیح فقرہ کہہ رہے ہیں وہ گرامر کا منہ چڑا رہا ہے کیونکہ "میں" فاعل ہے اور "مجھ" مفعول ہے۔ تاہم فاعل کی جگہ مفعول کا استعمال کر کے اُس سے فاعل کا کام لے رہے ہیں۔ گرامر اس کی کہاں اجازت دے گی گرامر تو یہ کہے گی کہ "میں نے دہلی جانا ہے" صحیح ہے اور "مجھ کو دہلی جانا ہے" غلط ہے۔ مگر گرامر ہو یا لغت زبان دان دونوں سے بڑا ہے اور زبان دان ہوں یا اہل زبان، زبان ان دونوں سے بڑی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ چلن کا معاملہ شتر بے مہار کا سا نہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ زبان اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نہیں بنتی؛ بلکہ گلیوں، بازاروں، کھیتوں اور کارگاہوں میں بنتی ہے۔ اردو نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پرورش پائی لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ جامع مسجد کی سیڑھیاں اگر اپنا مزاج اور اپنے

نگ روپ بدل لیں تو اردو والے کہاں جائیں۔ اُس صورت میں مستند اہلِ علم اور مستند اہلِ زبان کی رہنمائی ضروری ہے، ورنہ زبان کے تلفظ اور اِملا سمیت اپنے رستے سے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ اس موقعے پر مجھے علامہ اقبال کا وہ خط یاد آرہا ہے جو انہوں نے زبان کے صحیح استعمال کے متعلق ۱۹۲۳ء میں سردار عبدالرب خان نشتر کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں اقبال لکھتے ہیں۔۔۔۔

"۔۔۔۔۔ زبان کو میں ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے۔
بلکہ اظہارِ مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان
انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس
میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے، ہاں تراکیب
کے وضع کرنے میں مذاقِ سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔"

یہ خیالات آج سے ستاون برس قبل پیش کئے گئے تھے اور آج جب ہم ان کی افادیت پر غور کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ مشورہ ہمیں اردو کے صحیح استعمال کے متعلق آج کے حالات کے پیشِ نظر دیا جا رہا ہو۔ میرے نزدیک یہ مشورہ ہم اردو والوں کے لیئے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

رپورتاژ پر فنّی بحث

رپورتاژ سفرنامے سے ملتی جلتی صنفِ ادب ہے۔ اس صنفِ ادب نے گذشتہ جنگِ عظیم کے دوران اُردو ادب میں شمولیت حاصل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے لیے نہ صرف قارئین کا وسیع حلقہ پیدا کر لیا بلکہ ادب میں بھی اپنی انفرادیت تسلیم کروالی۔ رپورتاژ کا رشتہ انگریزی لفظ "رپورٹ" اور فرانسیسی لفظ "رپورتاژ" سے قائم کیا جاتا ہے۔ اور یہ امر اس کے نام سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو ادب کی بیشتر دوسری اصناف کی طرح اسے بھی مغربی ادب سے ہی درآمد کیا گیا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس صنف کی خاص صورتیں اُردو ادب میں موجود نہیں تھیں۔ اخبار کی خبر، جلسے کی روداد، مشاعرے کی رپورٹ اور کسی حادثے یا واقع کا آنکھوں دیکھا در حقیقت رپورتاژ کی ہی ابتدائی صورتیں ہیں اور صداقت کا وہ عنصر جو ایک اچھے رپورتاژ کی اولین خصوصیت ہے اور گزرتے ہوئے واقع کی مکرر پیش کش جو رپورتاژ کی اساسی ضرورت ہے ان سب میں مشاہدہ کی جا سکتی ہیں۔

شمیم احمد نے لکھا ہے کہ "رپورتاژ کا لفظ بڑی حد تک رپورٹ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ..... اس صنف کو رپورٹ اور صحافت سے اس کا فن ہی جدا کرتا ہے"۔[۱] اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رپورٹ اور خبر کے بیان اور صداقت کو جب ادیب کے تخلیقی عمل سے گزر کر ادب کا فنّی لمس نصیب ہوتا ہے تو رپورتاژ معرضِ وجود میں آجاتا ہے۔ اور یوں رپورٹ اور خبر بھی جب ادب کے دائرے میں داخل ہوئی تو اُسے صحافت کی نسبتاً کم تر سطح سے اٹھا کر ادب کی بلند تر سطح پر فائز ہونے کا موقعہ مل گیا۔ صحافت میں خبر کو عجلت کے ساتھ قاری تک پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس ترسیل میں صحافی ایک غیر جانبدار نامہ بر کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ اس کے برعکس جب ادب بالعموم اور رپورتاژ

[۱] شمیم احمد ـــــ رپورتاژ اور اس کا موضوع - نگار - اصناف ادب نمبر - ص ۲۲۹

بالخصوص خبر کی صداقت کو موضوع بناتا ہے نہ تو اس موضوع کی دوامی حیثیت کو اُجاگر کر دیتا ہے، اور ادیب اس کی تخلیق میں ایک اہم کردار کی صورت شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ رپورتاژ کو اصنافِ ادب میں شامل کر لیا گیا ہے تو اس سے یہ باور کرنا درست ہوگا کہ اب یہ صنفِ اظہار نہ صرف ادب کے جملہ فنی تقاضوں کو پورا کرتی ہے بلکہ انسانی جذبات کو آسودگی۔ لطافت۔ اعتدال اور توازن بھی عطا کرتی ہے۔ اس اجمال پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش اس مقالے میں کی گئی ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کا خیال ہے کہ "ہر صنف (رپورتاژ) اُردو میں ہی نہیں بلکہ دُنیا میں بھی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تازہ وارد ہے"[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو میں رپورتاژ کا لفظ پہلی دفعہ سالنامہ "ادبِ لطیف" ۱۹۴۷ء میں کرشن چندر نے اپنی تخلیق "پودے" کے لیے استعمال کیا۔ انہیں دنوں ابراہیم جلیس نے ہفتہ وار "نظام" بمبئی میں اس صنف کے لیے "رپورتاج" کی اصطلاح رائج کرنے کی کوشش کی۔ اور اپنی تخلیق "شہر" کو اسی صنف کا نمائندہ قرار دیا۔ ان دونوں اہم ماخذ لفظوں میں جدت اور نیاپن موجود تھا۔ یہ الفاظ اس سے قبل اُردو ادب میں مستعمل نہیں تھے اس لیے تاریخِ ادب نے نہ صرف ان کے معنی دریافت کرنے میں گہری دلچسپی لی بلکہ اس صنف کے خدوخال، فنی خصوصیات اور ادبی حدود مقرر کرنے کا تقاضا کیا۔ اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ ہوا کہ "رپورتاژ" کے بارے میں بحث و نظر کا دروازہ کھل گیا۔ جس سے اس صنف کی مقبولیت میں اضافہ ہوا، نئے ادیبوں کو رپورتاژ لکھنے کی تحریک ملی اور کئی پرانے ادیبوں نے حقیقی واقعات کو صداقتِ بیان سے پیش کرنے کے لیے اسی صنف کا سہارا لیا۔

رپورتاژ میں قاری کی دلچسپی کا ایک اور نتیجہ یوں ظاہر ہوا کہ ناقدین نے رپورتاژ کو اُردو ادب کی دوسری مماثل اصناف سے ممیز کرنے کی کوشش کی اور جب پرانی اصناف پر نظر ڈالی گئی تو افسانہ اور سفرنامہ میں اس صنف کی بہت سی خصوصیات کو موجود پایا۔ چنانچہ اب ایک بحث یہ شروع ہو گئی کہ ان دو اصناف کی موجودگی میں ایک نئی صنف کو مروج کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ بعض ناقدین ذرا دور کی کوڑی لائے اور انہوں نے محمد حسین آزاد کی "نیرنگِ خیال"، میرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین "پھول والوں کی سیر" اور "دلی کا یادگار مشاعرہ" اور خواجہ حسن نظامی کے مضامین "غدر کی ماری شہزادیاں" اور "جنگیز کا جنازہ" وغیرہ کو رپورتاژ کے اولین نمونے قرار دے کر فیصلہ یہ صادر فرمایا کہ رپورتاژ کوئی نئی صنفِ ادب نہیں بلکہ اس کے بہت سے اچھے نمونے اُردو ادب میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد حسین آزاد نے "بقائے دوام کا دربار" سجایا ہے اور ان کی تصنیف "آبِ حیات" مرقعاتی وقائع نگاری کا دلکش نمونہ ہے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ نے شاندار ماضی کو حیاتِ مکرر عطا کی ہے اور گزرے ہوئے واقعات کو تخیل کی آنکھ سے دیکھ کر بے حد حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی غدر کے واقعات کو آنکھوں دیکھا حال بنا کر پیش کیا۔ اور واقعے پر اپنی مہرِ شہادت بھی ثبت

[1] ڈاکٹر اعجاز حسین۔ رپورتاژ کیا ہے؟ نگار۔ کراچی۔ اگست ۱۹۵۷ء۔ ص ۵۰

کرو۔ تاہم ان سب کو رپورتاژ کہنا اس لیے مناسب نہیں کہ رپورتاژ کے لیے چشم دید واقعات کو موضوع بنانا ضروری ہے اور متذکرہ مثالوں میں مصنفین نے باصرہ کے بجائے متخیلہ سے کام لیا ہے۔ اور ایسی شکلیں آراستہ کی ہیں جنہیں صرف اُن کی چشم خیال ہی دیکھ سکتی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین کے اِس خیال سے انکار ممکن نہیں کہ "تیس پینتیس سال سے زیادہ آگے اس رپورتاژ کا وجود نہیں ملتا"[1] اُردو روداد نگاری کے جو نمونے اس سے قبل سامنے آتے ہیں وہ فنی لحاظ سے کمزور اور تخلیقی عمل سے محروم ہیں۔ لہٰذا ان پر رپورتاژ کا اصطلاحی نشان ثبت کرنا مناسب نہیں۔ اس مختصر سی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ رپورتاژ اُردو کی نووارد صنفِ ادب ہے۔ اسے مغرب سے درآمد کیا گیا ہے اور اس کی اوّلین نمائندہ تخلیقات کرشن چندر اور ابراہیم جلیس نے پیش کیں۔ ابتدا میں اس صنف کے لیے دو لفظ ــــ رپورتاژ اور رپورتاج ــــ جو معنویت کے لحاظ سے آپس میں مشابہہ ہیں سامنے آئے لیکن مرورِ ایام کے ساتھ قبولِ عام صرف رپورتاژ کو حاصل ہوا اور اب یہ صنف اسی نام سے موسوم ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا وضاحت کے باوجود یہ مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے کہ ناول، افسانہ اور سفر نامہ کی موجودگی میں ایک نئی نثری صنفِ ادب کو مروّج کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ کسی نئی صنف کی ابتدا اکثر اوقات ادیب کے داخلی تقاضوں کا نتیجہ ہوتی ہے، وہ جب محسوس کرتا ہے کہ اس کے خیالات مروّجہ ادبی ظروف میں سمانے کے بجائے چھلک چھلک جاتے ہیں یا بہت سے نادر تصورات اظہار سے ابلاغ کی منزل ہی طے نہیں کر پاتے تو وہ "کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے" کا تقاضا کرنے لگتا ہے۔ اُردو شاعری میں غزل ادب کی مقبول ترین صنف ہے اور اب تک اس کے مقابلے میں دوسری کوئی صنفِ شعر گوئے سبقت نہیں لے سکی، تاہم غالبؔ نے اس کی تنگ دامانی کا شکوہ برملا کیا۔ اُردیں غزل کو توانائی کی اس نہایت سے ہمکنار کر دیا۔ جس میں غالب کا ارفع تصور داخلی روح کی طرح سرایت کرتا نظر آتا ہے۔ غالبؔ نے جس وسعت کا تقاضا کیا تھا اس کی ایک اور توانا صورت اقبالؔ کے ہاں نمایاں ہے اور حدیہ ہے کہ اقبال نے محض غزل کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ غزل کو نظم کے قریب تر کر دیا اور اس سے مستقبل کے شعراء نے نظمِ جدید کو پروان چڑھانے میں مدد لی۔

نئی اصنافِ ادب کے فروغ میں عصرِ جدید کے سماجی تقاضے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک عہد کی سماجی حقیقت اپنے وضع کردہ پیمانوں میں ہی سما سکتی ہے۔ اس عصری حقیقت کو اگر پرانے روزن میں ڈھالنے کی سعی کی جاتی تو یہ عمل پیش پا افتادہ نظر آئے گا اور ادیب کی آواز قاری کو متاثر کرنے کی بجائے سناٹوں میں گم ہو جائے گی۔ مروّجہ اصنافِ ادب کا داخلی نظام بھی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ زمانے کے ساتھ اپنا آہنگ برقرار رکھنے اور ارتقا کی طرف مسلسل قدم بڑھانے کے لیے بیشتر اصناف نے اپنی داخلی اور خارجی شکل و صورت میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ چنانچہ غزل ولی کے زمانے میں بھی لکھی جا رہی تھی اور آج وزیر آغا کے دور میں بھی تخلیق ہو رہی ہے۔ لیکن ان دونوں میں نہ صرف طرزِ احساس

---

[1] ڈاکٹر اعجاز حسین ۔ رپورتاژ کیا ہے ۔ افکار کراچی ۔ اگست ۱۹۵۷ء ۔ ص ۵۵

فرق موجود ہے بلکہ موضوعات میں بھی نمایاں تبدیلی آگئی ہے۔ اظہار کے لیے جن علائم و رموز اور الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے اُن کے انتخاب کی کیفیت بھی تبدیل ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب مروّجہ اصنافِ ادب نئے عصری تقاضوں کا پوری طرح ساتھ نہیں دے سکتیں تو ادیب ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے نئی اصنافِ ادب کی تلاش کرتا ہے۔ نئی صنف کے ابتدائی نمونوں کے بعد جب کسی تجربے کو مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے تو اس صنف کو ادب میں مستقل جگہ مل جاتی ہے۔ اور جو تجربہ قبولِ عام کی منزل طے نہ کر سکے اس کی بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی اور یوں یہ تجربہ اکثر اوقات تاریخِ ادب کے اوراق میں بھی جگہ نہیں پا سکتا۔ یہ نقطہ اس مثال سے واضح ہوگا کہ گذشتہ چند سالوں میں "انشائیہ" اور "نثری نظم" کی اصناف کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ اوّل الذکر کو چند سالوں میں ہی مقبولیتِ حاصل ہو گئی اور اس صنفِ ادب میں نئے لکھنے والوں کا نہ صرف روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ بلکہ انشائیہ کے فن پر بحث و نظر کا دروازہ بھی کھل گیا ہے۔ اور ناقدین اس صنفِ اظہار کے نئے قرینوں کو متعارف کرانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ دوسری طرف نثری نظم چونکہ ادیب کے داخل سے برآمد نہیں ہوئی اور مروّجہ اصناف کے مقابلے میں یہ غیر فطری امتزاج کا نتیجہ تھی اس لیے اس تجربے کو قبولِ عام کا درجہ حاصل نہ ہو سکا اور بہت سے ثقہ ناقدین نے تو اُسے صنفِ ادب تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔

رپورتاژ کے فروغ میں متذکرہ بالا محرکات نے یکساں فریضہ سرانجام دیا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری کو وسیع پیمانے پر فروغ دینے کی کاوش کی تو یہ بات بالخصوص سامنے آئی کہ سماجی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات ہیں جو ادیب کے مشاہدے میں تو آتے ہیں لیکن ادب کا جزو محض اس لیے بن نہیں پاتے کہ اس کے لیے کوئی موزوں صنفِ اظہار موجود نہیں۔ چنانچہ ادیب نے نہ صرف داخلی اضطراب کی کیفیت محسوس کی بلکہ اُسے یہ خدشہ بھی پیدا ہو گیا کہ معاشرے کی خارجی سطح پر ظہور میں آنے والے بہت سے واقعات زمانے کی گرد میں گم ہو جائیں گے اور ادب میں ان کی صورت صادق انداز میں مرتب نہ ہو سکے گی۔ اور یوں ان واقعات پر اس عہد کے ادیب کا تاثر ضائع ہو جائے گا۔ اِدھر ارتقا کی قوتوں نے زندگی کی رفتار کو تیز تر کر دیا تھا۔ ایک واقعہ ابھی اپنا تاثر پوری طرح قائم نہیں کر پاتا تھا کہ ایک اور نیا واقعہ رونما ہو جاتا، زندگی نئی کروٹ بدل لیتی اور نیا تناظر واقعات و حادثات کا سیاق و سباق ہی تبدیل کر ڈالتا۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم نے نہ صرف دنیا کا نقشہ بدلنے کی کوشش کی بلکہ اس نے انسانی ذہن کو بھی شدت سے متاثر کیا اور پُر سکون معاشروں میں سماجی اضطراب پیدا کر کے عام آدمی کی سوچ میں انقلاب بپا کر دیا۔ اس زمانے میں ادیب کا ایک فریضہ یہ بھی سمجھا گیا کہ وہ وقتی مسائل کے متعلق اپنے پڑھنے والوں کی راہنمائی کرے[۵]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت کے واقعات اور زمانے کے حادثات پر ذاتی تاثر کو اہمیت حاصل ہوئی اور ادب کی ایسی اصناف کو جو صیغہ واحد متکلم میں واقعاتی صداقت کو آنکھوں دیکھی شہادت بنا کر پیش کرتی تھیں مقبولیت حاصل ہونے لگی۔

---

[۵] محمد حسن عسکری۔ ماہِ نو۔ مارچ ۱۹۴۸ء - ص ۶۰

اس صورتِ حال کا ادراک ترقی پسند تحریک نے نسبتاً بہتر طور پر کیا، ترقی پسند ادب میں ہنگامی مسائل کو فوری طور پر ادب کا موضوع بنانے زندگی کو حقیقی رنگوں میں پیش کرنے اور تخلیقی ادب میں زندگی کی تنقید کا عنصر شامل کرنے کا رجحان بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اخبار کی جو خبر بھی ادبا کو متاثر کرتی وہ اُسے ترقی پسند مقصدیت کے آئینے میں دیکھتے اور اُسے ایک مخصوص سانچے کی تخلیق میں ڈھال دیتے۔ اور یوں ادب کی وساطت سے اپنے سماجی فریضے کی ادائیگی کر ڈالتے۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، ابراہیم جلیس، صدیقہ بیگم سہواردی، کرشن کانت، رامانند ساگر اور احمد ندیم قاسمی کے بعض افسانے اسی نوعیت کے ہیں اور خبر کو بڑی خوبی سے ادب کے غلاف میں لپیٹ ڈالتے ہیں۔ رپورتاژ کی اوّلین کاوش بھی آنکھوں دیکھے احوال کو افسانے میں ڈھالنے کی ہی ایک صورت تھی۔ اور اس میں چونکہ فنکار کا موڈ، جذبات و احساسات کا تاثر اور واقعات کی صداقت موجود تھی اس لیے اس نے پڑھنے والوں کو متاثر کیا اور یوں ایک نئی صنف جس میں ادب پڑھنے والے لوگوں کی دلچسپی کے بعض قیمتی عناصر موجود تھے فراہم ہو گئی۔ اُردو ادب میں رپورتاژ کا فروغ محض حادثاتی یا اکتسابی نہیں بلکہ یہ صنفِ ادب مخصوص داخلی تقاضوں اور معاشرتی ضرورتوں کے تحت پیدا ہوئی اور ترقی پسند ادبا نے اُسے پروان چڑھانے میں نہ صرف دلچسپی لی بلکہ اس کی اوّلین تخلیقات بھی پیش کر دیں۔ رپورتاژ بالعموم ایسے وقتی اور ہنگامی واقعات کے گرد تعمیر ہوتا ہے جو فوری طور پر کسی بڑی نظم، افسانے یا ناول میں سما نہیں سکتے۔ تاہم رپورتاژ کا موضوع ادبی رجحانات کا حامل ضرور ہوتا ہے اور ادیب تمثیلات، تشبیہات اور استعارے کی مدد سے واقعات کی پیش کش میں وہ سلیقہ بھی استعمال کرتا ہے جس سے قاری نہ صرف رپورتاژ میں دلچسپی لینے لگتا ہے بلکہ مطالعے کے دوران اپنی تہذیب بھی کرتا ہے۔ ادیب کا خارجی مشاہدہ اگر ایسی حیرت انگیز اور سحر زا کیفیت پیدا نہ کر سکے تو رپورتاژ کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوتا رپورتاژ خارجی حقائق کی واقعاتی ترسیل کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اور صرف صحافتی خدمت سرانجام دیتا ہے۔ محمد حسن عسکری نے رپورتاژ کے مشاہداتی پہلو کو نمایاں اہمیت دی ہے۔[5] لیکن اس سے نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ رپورتاژ ادب کی کوئی باقاعدہ صنف نہیں ہے۔ مشاہدہ ہر تخلیقی فن پارے کا اساسی جزو ہے اور اس کے بغیر نہ تو ادیب خارج سے اپنا رشتہ قائم نہیں کر پاتا ہے نہ اس کی تخلیق زندگی کی صداقت سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ تخلیق ہوا میں معلق نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ اس کے لیے زمان و مکان کی بنیاد بھی درکار ہوتی ہے۔ اور یہ اپنا تعلق بنی نوعِ انسان کے ساتھ بھی قائم کرتی ہے۔ رپورتاژ میں وقت کا قدم بالعموم زمانۂ حال کی سیدھی لکیر پر سفر کرتا ہے۔ اس میں افسانے یا ناول کی طرح دائرہ مکمل نہیں ہوتا۔ ادیب کے مشاہدے اور تخلیقی عمل کے درمیان نسبتاً کم وقفہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ تاہم رپورتاژ سے ادیب اپنی جذباتی وابستگی کو منہا اور واقعے کی ترسیل کے دوران اپنی تخلیقی حیثیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک اچھے رپورتاژ میں یہ سب شامل ہوتے ہیں اور ادیب ان کے کیمیائی امتزاج سے ہی رپورتاژ کا تار و پود مرتب کرتا ہے واقعات کو ادبی اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ اور کسی واقعے یا حادثے کے بیان میں ان پہلوؤں کو بھی دکھاتا جاتا ہے جنہیں مورخ نظر انداز کر دیتا ہے۔[6] چنانچہ تخلیق کا عمل رپورتاژ میں بھی کارفرما ہوتا ہے اور

[5] حوالہ ایضاً

[6] ڈاکٹر اعجاز حسین۔ افکار کراچی اگست ۱۹۵۰ء ص ۵۵

یہ اپنا جادو پوری طرح جگاتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ "ادب بنیادی طور پر ادیب کے اظہارِ ذات کی ایک صورت ہے اور یہ اظہار باطن کا وہ نغمہ ہے جو رمز، ایما، اشارے کنائے، اشعارے اور تمثیل کی اساس پر قائم ہے اور جذبے کی تہذیب کرکے قاری کو جمالیاتی حظ بہم پہنچاتا ہے۔"[1] رپورتاژ کے واقعاتی عناصر ادیب کے تجربے اور مشاہدے کا قیمتی عنصر ہوتے ہیں، وہ اپنے جذباتی آہنگ سے ہی رپورتاژ میں لطافت اور جاذبیت پیدا کرتا ہے۔ اگر رپورتاژ سے ادیب کی شخصیت کو خارج کر دیا جائے تو رپورتاژ محض خبروں کا مجموعہ رہ جاتا ہے۔ اور اس میں وہ کشادگی اور معنویت پیدا نہیں ہو سکتی جو ہمیشہ ادیب کا مقصودِ نظر ہوتا ہے۔ شمیم احمد کے اس تجزیے سے انکار ممکن نہیں کہ "خارجیت کی صداقت ہی دراصل داخلیت کی محرک بن جاتی ہے۔"[2] جب خارجیت اور داخلیت کا امتزاج عمل میں آتا ہے تو ہمیشہ ادب پیدا ہوتا ہے۔ بلاشبہ رپورتاژ میں ادیب قوتِ ارادی سے بہت کم کام لیتا ہے۔ تاہم وہ تخلیقی عمل سے بالکل بری الذمہ بھی نہیں ہو جاتا۔ تخلیق کا پُراسرار عمل جس صنفِ ادب پر اپنا افسوں نہ پھونکے اس میں ادبی خصوصیات پیدا نہیں ہوتیں۔ اور ادب پارہ محض ایک مصنوعی اور میکانکی تحریر نظر آنے لگتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعض افسانہ نگاروں نے جب ہنگامی واقعات پر فوری تاثر کو افسانے کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کی تو اس صنف کی فنی قدریں خاصی مجروح ہوئی تھیں اور بہت سے افسانے اخبار کی خبریں نظر آنے لگے تھے۔ چنانچہ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ رپورتاژ ادب کی کوئی باقاعدہ صنف ہے یا اُسے خارج از ادب قرار دیا جانا چاہیے۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا ادیب نے رپورتاژ کی تخلیق کے دوران اس نادیدہ قوت سے رابطہ قائم کیا ہے جو لفظوں کی ترتیب میں سحر تاثر پیدا کرتی ہے۔ صدرِ خامہ کو نوائے سروش بنا دیتی ہے اور ادیب کے باطن کی نقاب کشائی کے دوران واقع کی مناسبت سے زمانے کی صداقت کو بھی آشکار کر دیتی ہے۔ وزیر آغا نے ادب کی اس امتیازی حیثیت کو اُبھارنے کے لیے ادیب کو "لیڈی آف شیلاٹ" کا آئینہ استعمال کرنے کی ترغیب دی ہے اس آئینے کی خوبی یہ تھی کہ وہ اصل کے عکس کے علاوہ اس عکس کی تہذیب بھی کر ڈالتا تھا۔ رپورتاژ میں تو اس آئینے کو شاید سب سے زیادہ استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ وجہ یہ کہ رپورتاژ میں مشاہدے کو تخلیق میں ڈھالنے کے لیے ادیب اپنے داخلی عمل کو فوری طور پر برانگیختہ کرتا ہے اور اس تعجیل میں وہ بعض اوقات تو ادب کی سرحدوں کو بھی چھونے سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے رپورتاژ کو جو عکس کی پوری تہذیب نہ ہو پاتے ادب میں شمار کرنا ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے کہ محمد حسن عسکری رپورتاژ کی مذکورہ فنی صورت سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے رپورتاژ پر ادب کے تمام دروازے بند نہیں کیے بلکہ لکھا کہ

"یہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر کوئی رپورتاژ ادب کا درجہ حاصل کرے"

چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ اردو ادب میں جن رپورتاژوں نے دوام حاصل کیا ہے اُن میں مذکورہ

[1] وزیر آغا۔ تنقید اور احتساب۔ ص ۲۰۵

[2] شمیم احمد۔ نگار۔ اصنافِ ادب نمبر۔ ص ۲۴۹

موجود ہے، اُن میں ادیب نے باہر کی فضا کو خود اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا، حقیقت اور صداقت کو نکھارا اور اُن میں ایسی کیفیت پیدا کردی جس سے قاری نے جمالیاتی مسرت کا اکتساب کیا۔

رپورتاژ کے مزاج کی تشکیل میں افسانہ اور سفر نامہ کی اصناف نے اساسی کردار ادا کیا ہے اور اس کے ادبی تصور پر صحافت نے غالب آنے کی کوشش کی ہے۔ درآغا لیکہ رپورتاژ نے اپنی انفرادی ادبی حیثیت متعین کرنے کے لیے ان سب سے بالغراہ استفادہ کیا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ رپورتاژ نہ تو خالصتاً افسانہ ہے، نہ سفر نامہ اور نہ صحافتی خبر نامہ۔ ادیب نے حسب ضرورت اور بقدرِ ظرف اُن سب کو استعمال کرنے کی سعی ضرور کی ہے۔ مثال کے طور پر افسانے میں کہانی ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعات کے درمیان ایک منطقی رشتہ بھی موجود ہوتا ہے۔ افسانے کا ایک واقعہ دوسرے واقعے کو کروٹ دیتا ہے اور بالآخر ایک واضح انجام پر پہنچ کر قاری کو جذباتی آسودگی عطا کر دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر افسانہ نگار کی کوشش یہ ہے کہ وہ واقعات کا تار و پود اس فنکاری سے تعمیر کرے کہ ابتداً قاری میں تجسس بیدار ہو۔ قاری یہ معلوم کرنے کے لیے بےتاب ہو کہ "اس کے بعد کیا ہوا؟" اور پھر جب "کیا ہوا؟" کا نتیجہ سامنے آجائے تو اس کے داخل میں بیدار شدہ تجسس حدِ اعتدال پر آجائے۔ اس کے برعکس رپورتاژ میں مربوط افسانہ تو موجود نہیں ہوتا لیکن اس میں کہانی کے بعض عناصر کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں، یہ عنصر قاری کے ذوق تجسس کو مہمیز بھی لگاتا ہے اور وہ یہ جاننے کے لیے بےتاب بھی ہوجاتا ہے کہ "اس کے بعد کیا ہوا؟" تاہم رپورتاژ چونکہ کسی منطقی انجام پر نہیں پہنچتا اس لیے یہ قاری کو چونکانے یا اُسے حیرت زدہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ افسانے کا گراف نشیب و فراز کی صورت میں مرتب ہوتا ہے۔ ہوشمند افسانہ نگار فراز کے خط کو واقعات کی اساس پر اُبھارتا ہے اور پھر ایک خاص مقام پر پہنچ کر اُسے اچانک نشیب کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس رپورتاژ کا گراف بالعموم سیدھی لکیر جیسا ہے اور موجود کی چہرہ نمائی پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ چنانچہ رپورتاژ میں کہانی پن موجود ہونے کے باوصف اُسے کہانی یا افسانے کا ذیلی صنف قرار دینا ممکن نہیں۔

رپورتاژ کا تکنیکی ڈھانچہ واقعات کو ڈوری میں پرونے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور اُن کی زمانی یا مکانی حیثیت کو تبدیل نہیں کرتا۔ چنانچہ اس صنف کی تیکنیک افسانے کی بہ نسبت زیادہ جامد ہے اور یہ ادیب کو بعض فنی پابندیاں قبول کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ رپورتاژ نگار تو اس لمحے کی بازیافت کرتا ہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ چنانچہ رپورتاژ میں زمان و مکان کی وحدت کے علاوہ عمل کی وحدت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھئے تو رپورتاژ افسانے کی بہ نسبت ڈرامے کے زیادہ قریب ہے۔ تاہم ڈرامے میں پلاٹ چونکہ اساسی اہمیت رکھتا ہے اور زمان، مکان اور عمل کی وحدت پلاٹ کی صداقت کو روبہ منظر لانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اس لیے رپورتاژ کے لیے متذکرہ اتحاد ثلاثہ کی ضرورت کے باوجود رپورتاژ کو ڈرامہ قرار دینا ممکن نہیں۔ البتہ یہ بات تو شاید درست ہو کہ رپورتاژ کو لکھے ہوتے ڈرامے کی طرح پڑھا جاتا ہے اور اس میں افسانے جیسی دلچسپی بھی موجود ہے۔ تاہم یہ سب ایک اچھے رپورتاژ کی داخلی خصوصیات ہیں اور صرف اس کی انفرادی حیثیت

تعین کرنے میں ہماری معاونت کرتی ہیں۔

رپورتاژ کے مشاہداتی پہلو اور اس کے رواں عمل نے اس صنف کو سفرنامے کے اتنا قریب کر دیا ہے کہ بہت سے ناقدین نے تو ان دونوں کے درمیان حدِ امتیاز قائم کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اور لکھا ہے کہ جس طرح افسانہ ناول سے نکلا ہے اسی طرح سفرنامے نے رپورتاژ کو جنم دیا ہے۔ ناول اور افسانے میں ایک امتیازی فرق کینوس کا ہے۔ ناول پوری زندگی ایک مکمل دور کو اپنے محیط میں لیتا ہے جبکہ افسانے کے محدود کینوس میں زندگی کی صرف ایک قاش یا تاریخ کا صرف ایک لمحہ سما سکتا ہے۔ اس کے برعکس سفرنامہ اور رپورتاژ دونوں نسبتاً بڑے کینوس پر ہی اپنے نقوش ابھارتے ہیں۔ سفرنامہ اور رپورتاژ میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں ادیب کسی مخصوص موضوع کو ملحوظِ نظر نہیں رکھتا، وہ ملکوں، شہروں اور قصبوں کی تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی کوائف کو سمیٹتا ہے لیکن ان کے تذکرے میں وحدتِ خیال یا موضوعی مرکزیت کو نمایاں اہمیت نہیں دیتا۔ سفر کے دوران وہ جو کچھ دیکھتا ہے اور اس پر جو کچھ بیتتی ہے وہ اُسے معروضی انداز میں قلم بند کر دیتا ہے۔ سفرنامے میں بغیر کسی موضوعاتی مرکزیت کے شہروں کا جغرافیہ سمجھانے، مناظرِ قدرت کی ایک ایک تفصیل گنوانے اور تہذیب و تمدن اور انسانوں کی تمام اہم اور غیر اہم خصوصیات پر روشنی ڈالنے پر ہی سارا زور صرف کر دیا جاتا ہے۔ جس کے سبب سفرنامہ محض خارجی عناصر کا مرقع بن جاتا ہے۔[۵] بالفاظِ دیگر سفرنامہ منظر کے خاموش عکس کو بالعموم کیمرے کی تصویر کی طرح کاغذ پر منتقل کرتا ہے اور اس میں حرکت و عمل کی قوت کچھ زیادہ نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس رپورتاژ کسی مخصوص واقعے کو اپنا موضوع بناتا ہے اور زمان و مکان کی صداقت کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے واقعے کی پوری صورت کو متحرک حالت میں پیش کر دیتا ہے۔ سفرنامہ اور رپورتاژ دونوں میں واحد متکلم اہم حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم رپورتاژ میں تو واحد متکلم کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے۔ وہ واقعات کی الجھی ہوئی ڈوری کو آہستہ آہستہ کھولتا ہے اور قاری کو ذہنی سطح پر متحرک منظر کا جزو بنا دیتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھئے تو سفرنامہ ساکن تصویروں کا البم ہے لیکن رپورتاژ کی تصویریں نہ صرف متحرک ہیں بلکہ یہ پینوراما کی طرح قاری کو بھی صورتِ واقعہ میں شامل کر لیتا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ رپورتاژ کے لیے سفر ضروری شرط نہیں بلکہ یہ کسی وقت اور کسی مقام پر بھی وقوع میں آ سکتا ہے۔ روزمرہ کے مسائل، سیاست اور معیشت کے پیدا کردہ ہنگامے، جنگ اور فسادات کے واقعات، ادب اور حکمت کے موضوعات پر منعقدہ مجالس وغیرہ نے جب بھی ادیب کو متاثر کیا تو ایک اچھا رپورتاژ معرضِ تخلیق میں آ گیا۔ چنانچہ یہ کہنا تو درست ہے کہ رپورتاژ یا تنہ سفرنامے کی طرح خارج کے گہرے مشاہدے سے مرتب ہوتا ہے اور ایک صنفِ ادب کے طور پر اس نے افسانے سے وافر استفادہ کیا ہے تاہم اسے سفرنامے کی شاخ قرار دینا یا اُسے سفرنامے میں کلیتہً ضم کر دینا مناسب نہیں۔

مندرجہ بالا بحث میں سفرنامہ اور افسانہ کے مقابلے میں رپورتاژ کی امتیازی خصوصیات کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ واقعاتی مشاہدے، وسیع کینوس، وحدتِ تاثر کی پابندی اور ادیب کے داخلی تخلیقی عمل کی بنا پر رپورتاژ نے

۵۔ نظیم احمد۔ نگار پاکستان۔ اشاعت ادب نمبر۔ ص ۲۵۱

ایک الگ جذباتی مدار مرتب کیا ہے۔ تاہم یہ صنف چونکہ زمانۂ حال کی ایجاد ہے اس لیے سفرنامہ اور افسانہ کی اصناف نے اس کی تشکیل و صورت سازی میں اساسی کردار بھی ادا کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ رپورتاژ کی واقعاتی معنویت میں سفرنامے جیسی ہیئت اور افسانہ جیسا تحیر موجود ہے یہ ڈرامے کی طرح واقعات کی متحرک صورت پیش کرتی ہے اور آنکھوں دیکھے مشاہدے کو معنویت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ادب اور زندگی میں اس کی اہمیت کو اجاگر کر دیتی ہے۔

رپورتاژ اپنا خام مواد چونکہ براہ راست رواں دواں زندگی سے اخذ کرتا ہے اس لیے اس کے موضوعات کا دائرہ محدود نہیں، یہ صنفِ ادب دوسری ہمہ گیر اصناف کی طرح سماجی اور معاشرتی واقعات کو بوقلموں انداز میں سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور بیشتر ایسی جزئیات سے رنگینی اور تنوع پیدا کرتی ہے جنہیں دوسری اصناف میں غیر اہم اور فالتو سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ زندگی کا حسن صرف مرتب شدہ مثالی نمونوں سے ہی نہیں ابھرتا بلکہ اس کی خوبصورتی تنوع اور فنکارانہ بے ترتیبی سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ زندگی کو حقیقی رنگوں سے اُجاگر کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات سے ادب کی اصناف زیادہ فائدہ اُٹھاتی ہیں، رپورتاژ میں چونکہ زیادہ سے زیادہ جزئیات کو سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے اس لیے یہ صنف زندگی پر نسبتاً زیادہ وسیع نظر ڈالتی ہے۔ اس کی وسعت کو جامع انداز میں سمیٹتی ہے اور مصنف کے مخصوص زاویۂ نظر کے مطابق اس سے بہتر نتائج اخذ کرنے کی سعی کرتی ہے۔

رپورتاژ کے لیے موضوع کا انتخاب مصنف کا ذاتی مسئلہ ہے۔ تاہم ایک اچھا رپورتاژ ایسے موضوع کو بہتر طور پر قبول کرتا ہے جس میں اجتماعی زاویہ نمایاں کرنے کے امکانات زیادہ ہوں۔ اس ضمن میں انفرادی شعور کے کارنامے کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور اس واقعہ پر اچھا رپورتاژ لکھا جا سکتا ہے جس کی پھیلی ہوئی شکل میں عمومیت کا زاویہ موجود ہو۔ اب تک اُردو میں جو رپورتاژ لکھے گئے ہیں اُن میں بلاواسطہ طور پر جنگ۔ فسادات۔ حادثات۔ قحط۔ بلوے۔ ادبی جلسے۔ تہذیبی تقریبات، میلے، مذہبی اجتماع اور سیر و سفر کی ثقافتی سرگرمیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اُردو کے پہلے رپورتاژ "پودے" میں کرشن چندر نے ترقی پسند تحریک کی ایک کانفرنس منعقدہ حیدرآباد کو موضوع بنایا تھا۔ ابراہیم جلیس کا رپورتاژ "شہر" میں اور سماجی زندگی کا دلچسپ اور تخلیقی بیانیہ ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے "دلی کو بپتا" میں اور فکر تونسوی نے "چھٹا دریا" میں فسادات کا بھیانک چہرہ دکھانے کی کاوش کی ہے۔ کوثر چاند پوری کا رپورتاژ "کارواں ہمارا" میں آل انڈیا اُردو کانفرنس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "گواہی چند روز" میں امجد حسین نے جنگ پر رپورتاژ لکھا ہے "کشیر اداس ہے" کا موضوع وہ بحران ہے جو آزادی کے بعد کشمیر میں پیدا ہوا اور اب تک قائم ہے۔ اُن رپورتاژوں میں حالات حقیقی اور تاثرات شخصی ہیں اور انہیں ایک مخصوص عینک سے دیکھا گیا ہے۔ تاہم اُن میں سے کسی رپورتاژ کا موضوع بھی ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی ہے اور مصنف کی بصیرت ہر اس منظر کو عکس میں لیتی ہے جس سے موضوع کی ہمہ گیریت، اور وسعت کو قریب نظر سے سمیٹا جا سکے۔

ایک اچھے رپورتاژ کے لیے بڑے موضوع کا انتخاب ضروری ہے تاہم اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے اس موضوع

اپنی تخلیقی گرفت میں کس طرح لیا ہے۔ موضوع کو اُجاگر کرنے کے لیے اس نے کون کون سی جزئیات کو سمیٹا ہے اور ان سب کو واقعاتی بیانیہ کی بنت میں کس طرح شامل کیا ہے۔ ممتاز شیریں نے لکھا ہے کہ "اُردو کے رپورتاژ اگر خارج کے تحت آتے ہیں تو اُن کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بس بھدے سے انداز میں بھونڈے پن سے واقعات بیان کر دیے جاتے ہیں"[۲] ممتاز شیریں کا اعتراض اساسی طور پر اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ موضوع کے ساتھ وابستگی رپورتاژ کے داخلی تاثر اور کیفیت کو پُراثر انداز ہوتی ہے۔ یہ وابستگی نہ ہو تو رپورتاژ واقعات کا محض سطحی بیانیہ بن جاتا ہے اور اس میں گہرائی یا گیرائی پیدا نہیں ہوتی۔ دراصل رپورتاژ نگار تو واقعے کے تاثر میں دوسروں کو شریک کرنے کا آرزومند ہوتا ہے اور وہ بالواسطہ طور پر قاری کو بھی اپنا ہمنوا اور شریکِ منظر بنانے کی کوشش ہی کرتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھئے تو رپورتاژ کے موضوع کے ساتھ مصنف کی ذہنی ہم آہنگی اور جذباتی وابستگی بھی ضروری ہے اور اس کے بغیر ایک اچھا اور اثر انگیز رپورتاژ تخلیق نہیں ہو سکتا۔

رپورتاژ چونکہ زندگی کے ایک رواں عمل کو متحرک صورت میں پیش کرتا ہے اس لیے بنیادی طور پر اس کے لیے ایک ایسے اسلوب کی ضرورت ہے جو لفظوں کو اعجازِ تحرک و گویائی عطا کر دے اور یُوں الفاظ کی جامد تصویروں کو اس طرح متحرک کر سکے کہ قاری کے دل میں منظر میں موجود ناظر کا احساس پیدا ہو جائے۔ لفظ تو ترسیل کا وسیلہ ہے۔ یہ رنگ اور خیال کی طرح سیّال ہے۔ لیکن لفظ کی اس خصوصیت کو صرف کہنہ مشق تخلیقی فنکار ہی بروئے کار لا سکتا ہے اور اپنے تخلیقی عمل سے اُسے قوتِ گویائی عطا کر سکتا ہے۔ رپورتاژ میں موضوع پہ خارجی منظر سے منعکس ہوتا ہے۔ اس منظر کے لیے روشنی اور سایہ مصنف کے داخل سے مہیا ہوتا ہے۔ چنانچہ داخل اور خارج کے امتزاج سے جب رپورتاژ اظہار کی راہ پاتا ہے تو ایک ایسے تصویری پیکر کا روپ اختیار کر لیتا ہے جس میں مصنف نے زندگی کی لرزیدہ کرنوں سے حرکت و حرارت پیدا کر دی ہو۔ پس رپورتاژ کے لیے ایسے تخلیقی اسلوب کی ضرورت ہے جس میں ماحول کے خارج اور مصنف کے داخل میں غیریت کی خلیج حائل نہ ہو اور جو قاری کو اپنے جلو میں یوں لے کر راستے کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے کے بجائے اختتامِ سفر تک اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو اور جب رپورتاژ کے اختتام پر پہنچے تو حصولِ منزل جیسی فرحت اور تازگی سے ہمکنار ہو جائے۔

رپورتاژ چونکہ ایک بیانیہ صنفِ ادب ہے اور اس کا وصف ہی یہ ہے کہ اس میں حقیقی گزرے ہوئے واقعات ہوتے ہیں۔ اور بیہ سادگی سے اس طرح بیان کئے جاتے ہیں جیسے کہ وہ گزرے تھے۔ اس لیے رپورتاژ میں تخلیقی اسلوب کی رعنائیاں پیدا کرنا بظاہر مشکل نظر آتا ہے تاہم اسلوب چونکہ ادیب کی تخلیقی شخصیت کے ساتھ براہِ راست متعلق ہوتا ہے۔ اس لیے ادیب کے لمس سے تخلیق میں خود بخود سما جاتا ہے اور ادیب کا ذاتی عکس تخلیق میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اُردو کے رپورتاژوں میں مختلف مصنفین نے مختلف اسالیبِ بیان کا استعمال اپنے انفرادی انداز میں کیا ہے اور رنگینی کے علاوہ تنوع بھی پیدا کیا ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کے ہاں جذباتی لطافت زیادہ نمایاں ہے اور ان کا رپورتاژ نغمے کی لہروں پر رقص کرتے ہوئے اسلوب کا آئینہ دار ہے

[۲] ممتاز شیریں - معیار - ص ۱۳۹

خواجہ احمد عباس واقع کو بیرنگ انداز میں پیش کر کے اور سماجی حقیقت کو سطح پر اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کا سائنسی اسلوب قاری کو زندگی کی بے رحم حقیقت سے روشناس کرانے میں معاونت کرتا ہے۔ محمود ہاشمی موضوع کو غیر جانبدارانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سستی رقت پیدا کرنے کے بجائے قاری کو اسلوب کی داخلی شدت سے مسحور کر دیتے ہیں۔ ابراہیم جلیس کے اسلوب پر قہقہہ غالب آجاتا ہے لیکن اس کے زیرِ سطح آنسوؤں کی نمی بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اے حمید اور ابنِ انشا نے رپورتاژ میں طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب آزمانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مختار مسعود کا اسلوب علی گڑھ تہذیب کا نمائندہ اسلوب ہے۔ قرۃ العین حیدر جنہوں نے اُردو کے سب سے زیادہ رپورتاژ لکھے ہیں تخلیقی اسلوب کو استعمال کرتی ہیں اور ان کی تہذیبی شخصیت اس اسلوب سے اپنی جھلکیاں بار بار دکھاتی ہے۔ اسالیب کے اس تنوع نے اُردو رپورتاژ میں دلچسپی اور پڑھنے کی صلاحیت پیدا کی ہے اور مختلف رپورتاژوں کے انفرادی امتیاز کے لیے ایک معیاری پیمانہ بھی فراہم کیا ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایک معیاری رپورتاژ کے لیے شگفتہ تخلیقی اسلوب اس کی امتیازی خوبیوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ادیب اگر لفظوں کو خیال انگیز اسلوب میں پیش کرنے کا سلیقہ نہ رکھتا ہو تو رپورتاژ کے لیے شگفتہ تخلیقی اسلوب اس کی امتیازی خوبیوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ادیب اگر لفظوں کو خیال انگیز اسلوب میں پیش کرنے کا سلیقہ نہ رکھتا ہو تو رپورتاژ کی بہت سی فنی رعنائیاں دب جاتی ہیں۔ اور اس کا حلقۂ قرأت محدود ہو جاتا ہے اور شیشۂ حقیقت نگاری بیکار کی اور غیر ضروری تفصیلات کے سہارے بھونڈے اتفاقی بیانیہ میں ڈھل جاتی ہے۔

رپورتاژ کا ایک وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس میں حقیقی گزرے ہوئے واقعات ہوں اور وہ اس طرح بیان کیے جائیں جس طرح وہ گزرے ہیں۔ پس رپورتاژ کی ایک بنیادی ضرورت اس کی صداقت بھی ہے۔ اس صداقت کو اُجاگر کرنے کے لیے رپورتاژ بالعموم صیغہ واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے اور اس کا مرکزی ناظر مصنف خود ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف واقعے کی صداقت پر مہرِ شہادت ثبت کرتا ہے بلکہ اس پر اپنے احساسات اور تاثرات کا اظہار بھی کرتا ہے۔ ناول یا افسانہ میں فنکار کردار تخلیق کرتا ہے اور خود تخلیق کے بطون میں پوشیدہ رہتا ہے۔ رپورتاژ میں کرداروں کو تخلیق کرنے کی گنجائش یا سہولت موجود نہیں۔ اور ادیب تخلیق کے منظر پر ہر وقت نہ صرف موجود رہتا ہے بلکہ قاری کی انگلی پکڑ کر اُسے آگے بھی بڑھاتا ہے۔ اُردو کا پہلا رپورتاژ "پودے" صیغہ واحد غائب میں لکھا گیا ہے۔ تاہم اس بات کو ملحوظِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ کرشن چندر نے اس رپورتاژ سے اپنی ذات کو منہا نہیں کیا بلکہ مصنف نے کرشن چندر کو مرکزی کردار بنا کر اس رپورتاژ کی اثر انگیزی زیادہ کر دی ہے۔ اور یہاں ناظر کرشن چندر پر جملے کسنے اور اس پر تنقید و تبصرے کے وار کرانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

رپورتاژ میں صداقت کا دوسرا زاویہ یہ ہے کہ اس میں پیش کیے جانے والے مقامات اور کردار بھی حقیقی ہوتے ہیں۔ اُن کرداروں کو چونکہ معاشرتی، سماجی اور ادبی سطح پر بھی بلند مقام حاصل ہوتا ہے اور عامۃ الناس میں اُن کی شخصیت کے بارے میں ایک مخصوص تاثر بھی موجود ہوتا ہے، یہاں رپورتاژ نگار ان شخصیات کے فطری نقوش کو بھی زیرِ تبصرہ واقع کی روشنی میں اُجاگر کرنے کی سعی کرتا ہے

چنانچہ قاری جسے رپورتاژ کی بڑی شخصیات سے ملنے، باتیں کرنے اور اُن کے باطن میں جھانک کر اپنے تاثر کی شہادت حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ رپورتاژ میں اس سے یوں ملتا ہے جیسے اس سے زندگی میں مل رہا ہو اور اس سے خود ہم کلام ہو رہا ہو۔ حیدر نے اپنے رپورتاژ "ستمبر کا چاند" اور فارغ بخاری نے "برات عاشقاں" میں رپورتاژ کی اس خصوصیت سے نمایاں فائدہ اٹھایا ہے اور رپورتاژ کو ملاقات نگاری کی حدود میں داخل کر دیا ہے۔

اہم اور زندہ کرداروں کے علاوہ رپورتاژ میں بعض اوقات اضافی اور غیر معروف کردار زندگی اور واقع کا صحیح عکس اجاگر کرنے کے لیے پیش کئے جاتے ہیں۔ رپورتاژ نگار اس قسم کے کرداروں کا انبوہ میں سے یوں چنتا ہے کہ قاری تک واقع کا صحیح تاثر پہنچ سکے اور موضوع کی اجتماعی عمومی حیثیت نمایاں ہو جائے۔ اس قسم کے کردار عموماً بے چہرہ ہوتے ہیں اور اپنا تعارف اپنے اوصاف سے کراتے ہیں۔ تاہم یہ اپنے واضح نقش کو اُبھارنے کی سعی ضرور کرتے ہیں اور قاری کو واقعے کی جزئیات سے "کل" مرتب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ محمود ہاشمی کا رپورتاژ "کشمیر اداس ہے" میں ایک وسیع پس منظر کو سیاسی واقعات نے اُجاگر کیا ہے۔ اس رپورتاژ میں کئی ڈرامائی مواقع بھی سامنے آتے ہیں۔ اور اس میں مصنف نے متنوع اور بعض غیر اہم کرداروں کو بھی بڑی تعداد میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ ہوم گارڈ کے کارکن، نیشنل کانفرنس کے اونچے عہدے دار، ہندوستانی سپاہی، پھر پنجال کے قیدی اور مسلمان عوام وغیرہ سب اس رپورتاژ کا قیمتی عنصر ہیں اور غیر اہم ہونے کے باوجود محمود ہاشمی نے اُن سب کو رپورتاژ میں داخل طور شامل کر کے مہارتِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ رپورتاژ کے اس زاویے نے اس میں کہانی کا تعجب خیز پن اور ڈرامے کی گویائی شامل کر دی ہے۔ اور یہ پہلو رپورتاژ کو دوسری اصناف نثر سے امتیازی خوبی بھی عطا کرتا ہے۔

متذکرہ بالا سطور میں ادیب کو رپورتاژ کی مرکزی شخصیت قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ قاری کو رپورتاژ میں اپنی موجودگی کا ہر قدم پر احساس بھی دلاتا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رپورتاژ کا واحد متکلم احساسِ تفاخر سے معمور ہوتا ہے اور اپنے مشاہدے سے قاری کو احساسِ کمتری سے دوچار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رپورتاژ میں واحد متکلم کی حیثیت کو ایک کمینٹیٹر (commentator) کی ہے۔ وہ اس کیمرہ مین کی طرح ہے جو بند کیمرے کے روزن سے روشنی کی شعاعوں کو سیلولائیڈ سے گزارتا ہے اور پردے پر اس طرح بکھیر دیتا ہے کہ پوری زندگی کا منظر آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتا ہے اور اس کا ایک مستقل نقش ذہن پر مرتب ہو جاتا ہے۔ ایک اچھا رپورتاژ قاری کو مغلوب کرنے کے بجائے اسے اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رپورتاژ میں خود نمائی کے برعکس انکسار کا جذبہ زیادہ حلاوت پیدا کرتا اور اس کے تاثر کو دوچند کر دیتا ہے۔

رپورتاژ میں کرداروں کی صداقت کے ساتھ ساتھ زمانے کی صداقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اچھے رپورتاژ کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ وقت کو گرفتارِ زنجیر کرے اور قاری رپورتاژ کے آئینے میں گزرتے ہوئے زمانے کا صادق ترین عکس دیکھ سکے۔ رپورتاژ میں بہتے ہوئے واقعات اور گزرتے ہوئے زمانے کی مانوسیت کی حاقت ہے اور اس کی مجموعی کیفیت کو یوں پیش کیا

ہے کہ رپورتاژ ایک دور کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ بلاشبہ رپورتاژ بالعموم ظہورِ واقعہ کے ساتھ ساتھ تخلیق نہیں ہوتا بلکہ مصنف زمان، مکان اور صورتِ واقعہ کا مجموعی نقش پہلے اپنے ذہن کی سطح پر اتارتا ہے اور پھر کسی لمحۂ تخلیق میں ان تصویروں کو دوبارہ کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔ پس رپورتاژ میں زمانہ حال سے ماضی کی طرف مراجعت کرتا ہے اور ادیب ماضی کو یوں گرفت میں لیتا ہے کہ وہ حال کے لمحۂ رواں میں دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے بعض اوقات ادباء نے رپورتاژ کے لیے صرف ایسی تکنیک منتخب کر لیتے ہیں جس میں مصنف کو نہ تو حال سے ماضی کی طرف مراجعت کرنی پڑتی ہے اور نہ ماضی کو زمانۂ حال میں زندہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ بلکہ رپورتاژ نگار اپنا بیانیہ زمانی اعتبار سے صیغہ واحد متکلم کے حال کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ رپورتاژ ڈائری کی صورت میں لکھا جائے اور یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ لکھنے والا حالات کا عینی شاہد ہے اور واقعات و کوائف کی صداقت پر زمانے کی گرد پڑنے سے قبل ہی انہیں یادداشت کی صورت ڈائری میں محفوظ کر رہا ہے۔ ممتاز شیریں نے لکھا ہے کہ "ڈائری کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ڈائری گویا اپنے لیے لکھی جاتی ہے۔ اس میں لکھنے والا اپنے آپ سے مخاطب ہوتا ہے۔ دوسروں پر اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتی اور اگر رکھتی ہے تو اس صورت میں کہ اس کا لکھنے والا اپنے پیچھے یہ سچ چھوڑنا چاہتا ہے۔" تاہم رپورتاژ چونکہ دوسروں کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے ڈائری کی تکنیک کا استعمال صداقت کے اظہار کے علاوہ رپورتاژ کی فنی ضرورت زیادہ نظر آتا ہے۔ مسعود مفتی کا رپورتاژ "چہرے"، نکر تونسوی کا "چھٹا دریا" اور محمود ہاشمی کا "کشمیر اداس ہے"۔ ڈائری کی تکنیک میں لکھے گئے عمدہ رپورتاژ ہیں اور ان میں تاثر کی لہر بخطِ مستقیم قاری کی طرف سفر کرتی ہے۔

رپورتاژ میں زمانۂ حال کو پیش کرنے کا دوسرا طریق یہ ہے کہ مصنف اپنا بیانیہ صیغہ واحد متکلم حاضر میں پیش کرتا ہے اور واقعات کو بکھرے بکھرے ڈائری نوٹس کی صورت میں پیش کرنے کی بجائے انہیں ایک مربوط بہاؤ میں آنکھوں دیکھا احوال بنا دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تکنیک بھی خاصی موثر ہے لیکن بعض اوقات مصنف صرف خارجی واقعات بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے تو ادیب کا وہ داخلی تاثر جو رپورتاژ میں جادوئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں پوری طرح شامل نہیں ہوتا۔ رپورتاژ نگار اگر تخلیقی مزاج رکھتا ہے تو وہ منظر سے پرے دیکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور رپورتاژ میں اپنا تاثر بھی شامل کر دیتا ہے اور یوں رپورتاژ نگار وہ کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو ایک اچھے ادب پارے کے عقب سے روشنی کا فوارہ چھوڑتی نظر آتی ہے۔ شیخ منظور الٰہی کے رپورتاژ "قریہ قریہ سے فرار" میں یہی تکنیک استعمال ہوئی ہے اور یہ ایک زندہ و متحرک رپورتاژ کی مثال بن گیا ہے۔

تکنیک کے اعتبار سے رپورتاژ کو خارجی اور داخلی اقسام میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ خارجی رپورتاژ میں زیادہ تر گرد و پیش کی تصویرکشی کی جاتی ہے۔ اور بیانیہ واقعات کو من و عن صورت میں پیش کرتا ہے۔ مصنف عینی شاہد نظر آتا ہے اور وہ سچائی کو روا رکھنے کے لیے واقعات کو توڑنے مروڑنے کی کوشش نہیں کرتا۔ احمد حسین کا رپورتاژ "گواہی" اسی انداز میں واقعات پر مبنی

نظر ڈالتا ہے۔ مصنف ایک اچھے رپورٹر کی طرح ہر وقت منظر پر موجود رہتا ہے۔ اور ایک اچھے صحافی کی طرح اپنی ذات کو واقعے پر غالب نہیں آنے دیتا۔ چنانچہ اُسے خارجی رپورتاژ کا ایک عمدہ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

داخلی رپورتاژ میں مصنف صرف خارج کے بیانیہ پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وُہ اپنے ذہنی اور فکری تصورات کو بھی رپورتاژ کی بنت میں شامل کر دیتا ہے۔ چنانچہ وُہ منظر کا صرف خارجی شاہد بننے کے بجائے اسے اپنے دل میں اتارنے کی سعی کرتا ہے۔ اور اس مسرّت یا کرب کو جو اس کی روح میں تحلیل ہو گیا ہے اُسے قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اس قسم کا رپورتاژ محض سطح کو سامنے نہیں لاتا بلکہ گہرائی و دونوں سطحوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کا "دلّی کی بپتا" داخلی رپورتاژ کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اور اس کی خوبی یہ ہے کہ ذاتی تجربات کے بیان کے باوصف مصنف نے اُسے پورے شہر کی داستان بنا دیا ہے اور توازنِ بیان اور ضبطِ اظہار کے باوصف ۱۹۴۷ء کی دلّی کی بربادی کو اس شہر کے خونچکاں ماضی کا حصہ بنا دیا ہے۔

رپورتاژ کی تکنیک کے یہ دونوں زاویے یک رخ ہیں۔ ایک اچھا رپورتاژ صرف خارج کو گرفت میں لے تو یہ کھردرا اور بے رنگ بیانیہ بن جاتا ہے اور اگر داخلی کیفیات کو اُبھارنے کے لیے ذہنی تصورات کا زیادہ سہارا لیا جائے تو اس میں شعری کیفیت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ در اصل ایک معیاری رپورتاژ نہ تمام تر خارجی ہوتا ہے اور نہ داخلی بلکہ یہ اُن دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ یہ واقعات کے علاوہ گرد و پیش کی صورتِ حالات، اُن کے بارے میں لکھنے والے کا تاثر اور واقعات سے اور احقائق کا پس منظر بھی خوبی سے پیش کرتا ہے۔ محمود ہاشمی نے اس قسم کا تجربہ "کشمیر اُداس ہے" میں اور قرۃ العین حیدر نے "ستمبر کا چاند" میں کیا ہے۔ چنانچہ ان دونوں میں منظر اور پس منظر کے علاوہ رپورتاژ نگار کی روح بھی منعکس ہوتی ہے اور قاری اس سے گہرا اثر لیتا ہے۔

انشائیہ کی طرح رپورتاژ بھی اُردو ادب کی ایک نئی صنفِ ادب ہے۔ ایک طویل عرصے تک اس کے فنی خدوخال کو سفر نامہ کے خطوط کے ساتھ گڈمڈ کیا جاتا رہا اور یوں اُسے سفر نامہ کی ذیلی شاخ ہی تصور کیا گیا۔ لیکن اب اس صنفِ ادب میں تخلیقات کی تعداد اتنی ہو گئی ہے کہ اس کی تاریخ مرتب کرنا اور اس پر ایک مجموعی نظر ڈالنا ممکن ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب اس صنف پر تنقیدی بحث آزادانہ ماحول میں ہو گی اور اس کی ترقی کے مزید امکانات روشن ہوتے چلے جائیں گے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

کلچر کا نفسیاتی تناظر*

اُردو میں کلچر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے کم اور غیر نفسیاتی لحاظ سے زیادہ ——— واضح رہے کہ ہر کلچر کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ اس لئے کلچر کا مطالعہ محض کسی نظریئے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ اس وقت اور بھی زیادہ شدت سے ہونے لگتا ہے۔ جب ڈاکٹر محمد اجمل کے مندرجہ ذیل بیان پر غور کریں:

”بلاشبہ ہمیں نئے شہر بسانے اور نئی تہذیب پیدا کرنی چاہیئے لیکن اپنا وُہ خاص تاریخی کردار کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے جو ہم پر خاص ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ ہمارے کلچر میں معاشرتی علوم سے پہلے فطری علوم نے ترقی نہ کی تھی۔ مغربی ممالک کی طرح ہمارے کلچر میں معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کا شعور فطری علوم کی ترقی اور اطلاق کا نتیجہ نہیں ہے“ ——— (تحلیلی تفصیلات ص: ۱۵۵)

ڈاکٹر محمد اجمل کی اس رائے کی روشنی میں کلچر سے وابستہ نفسیاتی محرکات اور تخلیق پر ان کی اثر آفرینی کا مطالعہ کلچر کی عام اور مروّج بحثوں سے قطعی طور پر جُداگانہ صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس ضمن میں اساسی نظریہ ہے کہ معاشرے کے تانے بانے میں جن نقوش اور رنگوں کی وجہ سے انفرادیت پیدا ہوتی ہے سو کلچر ہی سے عبارت ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کلچر ہی سے کسی خاص عہد کی فضا متاثر ہوتی ہے اور آنے والے تخلیقی اذہان کے لئے فضائے تخلیق کی صورت اختیار کر کے ان کی تخلیقات کو عصری تقاضوں اور ان سے جنم لینے والے نفسی میلانات سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

کلچر کن امور سے متاثر ہو کر کسی خاص رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس سوال کے جوابات متنوع ہیں اور مختلف اصحاب نے اپنے اپنے انداز میں خواب جوانی کی مانند اس کی تعبیریں پیش کی ہیں۔ فراق گورکھپوری گو فرائیڈین نقاد نہیں لیکن انہوں نے کلچر کی تشکیل میں جنس اور جنسی محرکات پر جس شد و مد سے زور دیا ہے وہ کچھ فرائڈ ہی کی یاد دلاتا ہے۔ چنانچہ ”اُردو کی عشقیہ شاعری“ میں انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے:

”سماج جنسیات کی پیداوار ہے اور جنسیات سماج کی!“ یہی نہیں بلکہ انہوں نے شاعری اور کلچر کے باہمی تعلق کی مختلف صورتوں کو بھی جنس ہی کے حوالہ سے سمجھایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”کسی قوم کے کلچر کا اندازہ کرنے کے لئے کئی طریقے ہیں، انہیں میں ایک طریقہ اس قوم کی عشقیہ شاعری کی جانچ پرکھ ہے“! اسی طرح ایک اور موقع پر اسی نکتہ کی وضاحت میں مزید لکھا:

”عشق اور عشقیہ شاعری دونوں سماج اور سماجی کلچر یا سماجی معیاروں اور روایتوں کی پیداوار ہیں۔ ہمارے جسم ہماری روحیں، جس رس میں پکائی جائیں

جیسا قوم ہمارے جذبات و احساسات کے لئے ہمارا کلچر صدیوں میں تیار کرتا ہے۔ ایسا ہی ہمارا عشق ہوتا ہے اور ایسی ہی ہوتی ہے ہماری عشقیہ شاعری۔ یہ استدلالی بحث طولانی ہے اور اس لئے نزاعی لیکن اس کی دلچسپی مسلم! کلچر کو ایک خاص فضا فرض کر کے اس کا مزاج متعین کرنے میں جنس کے علاوہ اور بھی کئی محرکات کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ اسے محض جنس تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کلچر کی تاریخ میں پہلے تو تاریخی، اقتصادی اور سماجی کئی طرح کے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ یوں جب کلچر مخصوص اوصاف اختیار کر کے ایک خاص رنگ میں رنگا جاتا ہے تو یہی استثنائی مثالوں سے قطع نظر بیشتر تخلیق کاروں کے رنگ طبع کو متاثر کرتا ہے۔ اگر تشکیلی اوامر میں تغیر و تبدل نہ ہونے سے اقدار کے مثبت یا منفی پہلو دیر تک برقرار رہیں تو کلچر سے پیدا ہونے والی ذہنی فضا بھی کیونکر برقرار رہتی ہے۔ اس لئے بعض اوقات افراد کی مانند کلچر کا بھی ایک مخصوص مزاج بن جاتا ہے۔ گریس سٹورٹ نے اس ضمن میں نرگسی کلچر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے بقول:۔

"بعض اوقات غلط ہو یا صحیح — ہمارا کلچر بھی نرگسی بن جاتا ہے۔ ایسا کلچر مریضانہ حساسیت، تصرفیت، املاک پسندی، حسد، جارحیت، نفرت اور حقارت وغیرہ کی بنا پر اپنے ہیجانات پر قابو پانے میں ناکام ثابت ہو تو وہ پھر اس راستے پر آنکھیں بند کئے گامزن رہتا ہے جو بالآخر اجتماعی خودکشی پر منتج ہوتا ہے۔" (NARCISSUS P. 23 Page No 83)

ژونگ نے اس "اجتماعی خودکشی" کے لئے "اجتماعی اعصابی خلل" (MASS PSYCHOSIS) کی اصطلاح استعمال کی ہے اور ایسے ہی کلچر میں سانس لینے والوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے گریس سٹورٹ نے یہ لکھا تھا کہ وہ ہر وقت چوکنے رہتے ہیں کہ کہیں ان سے کوئی سبقت نہ لے جائے۔ نرگسیوں کا ایک جم غفیر ہے کہ ایک دوسرے کے کہنیاں اور کندھے مارتے، دھکیلتے، سازشیں کرتے اور چھل فریب سے کام لے کر بہتر سے بہتر آئینہ کے لئے گریباں گیر نظر آتے ہیں۔ (ص: ۹۳)

کیا یہ تمام خصوصیات ہم میں نہیں پائی جاتیں اگر پاکستانی کلچر کی نفسیاتی اساس تلاش کی جائے تو وہاں دیگر امور کے ساتھ مریضانہ حد تک بڑھی ہوئی شدید نرگسیت بھی ملے گی۔ اسی نرگسیت نے پدرم سلطان بود کے اس منفی رویے کو جنم دیا ہے جس کے باعث ہم نے اپنی ناقابلیوں، کوتاہیوں اور خامیوں کا جواز عظمت رفتہ میں تلاش کر رکھا ہے۔ اس نرگسیت نے خوف کا وہ مریضانہ احساس پیدا کر رکھا ہے جس کی بنا پر سی آئی اے اور کے جی بی کے بھوت ڈراتے رہتے ہیں۔

اس طرح اگر لکھنوی شعراء اور ان کی تخلیقات پر کلچر کی اثر اندازی کا مطالعہ تو لینے بھی نرگسی کلچر کی جامع اور مکمل مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ سیاسی انحطاط کا زمانہ تھا۔ اسی لئے لکھنو میں نرگسی کلچر کے بیشتر منفی پہلو ہی سامنے آئے۔ اختر اورینوی نے اپنے مقالہ "عصر غالب / غالب کے قبل و بعد کے میلانات" میں کلچر کی نفسیات سے بحث کرتے ہوئے لکھنوی کلچر کا بھی مطالعہ کیا انہوں نے اسے انحطاط کی پیداوار قرار دیتے ہوئے اس کا تخلیقات سے تعلق متعین کیا۔

"......فریب زندگی اور سراب نشاط انحطاطی منفی سلسلہ دونوں طرح کی تبدیلیاں معاشرے کی تہذیب و ثقافت میں عام طور پر پیدا ہوتی ہیں کیونکہ اجتماعی نفسی حالت ویسی ہی ہوتی ہے۔ پھر عام ثقافتی رجحانات کا اثر ادبی زندگی پر بھی پڑنے لگتا ہے...... لکھنوی کلچر کی عام خصوصیات کا اثر لکھنؤ کے ادب پر پڑا۔ ادبی ثقافتی خصوصیات کی پیدائش اجتماعی نفس کے باطن سے ہوتی۔" (تنقید جدید، ص: ۱۷۳)

انہوں نے لکھنوی کلچر کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے:

"لکھنوی کلچر کی نفسی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک لاشعوری فریب کھانے کے سبب شعور کی سچی تنقید اور ضمیر کی آواز کو سُن ہی نہیں سکتی تھی۔ لاشعور شعور کی درد خیز حالت سے اکتا کر خارجی دُنیا کی طرف توجہ منعطف کی، شعور بیمار ہو کر بالکل بے دست و پا مفلوج ہو گیا۔ توازن قائم نہ رہ سکا اور ایک پُر فریب لاشعوری رو کے ماتحت شخصیت سماجی خارجیت کے رنگوں میں مبتلا ہو گئی، اسے PERVERSION کہتے ہیں جس طرح فرد کو اس کا لاحق ہوتا ہے ...... بالکل اسی طرح کلچر کو بھی اس نوع کا روگ لگ سکتا ہے جب احساس کمتری کے نشتر برداشت نہیں ہوتے تو اس قسم کی پُر فریب سنک پیدا ہو جاتی ہے۔ لکھنؤ کلچر ایک اُلٹے دماغ کی تہذیب ہے۔"
(ایضاً : ص : ۱۷۷)

"دراصل ہوا یوں کہ دہلی کے اُجڑنے پر صرف لکھنؤ ہی خوشحالی کا مرکز رہ گیا۔ اس لئے لکھنؤ دربار فن کاروں اور تخلیق کاروں کا آن داتا بھی تھا۔ اس عہد کے عوام اور شعراء بھی خود کو دہلی سے ممتاز رکھنے کی شعوری کاوش ملتی ہے دمیراَمن کی سادہ نگارش کو جب مرزا رجب علی بیگ سرور نے محاوروں سے منہ توڑے ہیں کیا تو اس کی وجہ بھی اسی "احساس کمتری" کے نشتر میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ غزل کے اندازِ عشق میں تبدیلی، معاملہ بندی، واسوخت، ریختی ان سب نے جنم لینے والی عُریانی، فحاشی، سوقیانہ پن اور ابتذال ــــ اور پھر ان سب پر متضاد رعایتِ لفظی سے لے کر شوکتِ لفظی تک تمام لفظی ہتھکنڈوں کو خصوصی اہمیت بخش دینا بلکہ بعض صورتوں میں تو مقصودِ فن بھی قرار دینا۔ الغرض لکھنؤ کلچر کے مخصوص نفسی مزاج نے اس عہد کی تخلیقات میں یُوں رنگ آمیزی کی لکھنؤ کا دبستانِ شاعری معرضِ وجود میں آ گیا یُوں کہ اختر اورنیوی کے الفاظ میں "لکھنوی کلچر کی ایک خاص نفسی حالت نے ہر شعبۂ تمدن پر اپنا سایہ ڈالا، شاعری کی نمود اور اس کا جوش و رقص کسی گہرے بیکراں جذبۂ حیات کے نتیجہ میں نہیں۔"
(ایضاً : ص : ۱۷۹)

کلچر کے نفسیاتی تناظر کی تشکیل میں نواہی بھی خاصہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مذہبی ممنوعات، سماجی ممنوعات اور عمومی تحریمات (TABOOS) نواہی کی طویل فہرست میں ہر دم اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اخلاق انسانی زندگی کے مثبت رویوں سے عبارت ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کا نفاذ بیشتر اوقات "نہیں" سے ہوتا ہے یوں "کرنے" اور "نہ کرنے" سے وابستہ قوتِ فیصلہ جس نفسی تناؤ کو جنم دیتی ہے اگرچہ اس کی نوعیت انفرادی اور ذاتی ہوتا ہے لیکن جبر اور گھٹن کی شدت اس نفسی تناؤ کو اتنا عام کر دیتی ہے کہ وہ کلچر اجتماعی رویوں پر اثر انداز ہو کر ادب و کلچر پر بھی اپنے گہرے نقوش مرتسم کر دیتا ہے۔ اس سے ایک طرف جہاں محدود اقلیت دو مسلمات سے انحراف اور انکار سے رو گردانی کرتی ہے تو وہاں اکثریت منافقت جھوٹ اور ریاکاری میں تحفظ ذات تلاش کرتی ہے۔ اس بغاوت اور منافقت کا واشگاف اظہار تو جرائم اور سیاست میں ہوتا ہے لیکن ادیب بھی ان محرکات سے بچ نہیں سکتا۔ وہ سچ بولے تو کوتاہ گر کذب اسے سنگسار کرتے ہیں۔ جھوٹ بولے تو تخلیقی شخصیت مجروح ہوتی اور ضمیر ملامت کرتا ہے۔ اگرچہ توانا تخلیقی شخصیت کے حامل تخلیق کار سنگساری گوارا کر لیتے ہیں۔ مگر اکثریت کلچر جیسے بتوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ اگرچہ یہ سب مسلّمات کے احترام اور اقدار کے تحفظ کے نام پر کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت سچائی کے دروازے روک دینے سے معاشرہ اپنا نقصان کرتا ہے کہ تازہ ہوا کی کھڑکی بند کر کے گھٹن اور تعفن میں سانس لیتا ہے۔ اس لئے ہر وہ کلچر جس نے منافقت کو حرزِ جاں بنایا بالآخر عجائب گھر کی زینت بنا ــــ خود پاکستان میں بھی ہمیشہ ہمیشہ سے منفی کا غلبہ رہا ہے ہر چند کہ مختلف ادوار میں لاتے مختلف اور خوبصورت نعرے لگائے جاتے رہے ہیں لیکن اس کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا اب ہمیں مخالفت میں ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں، صرف ہم سچائی پر ہوتے ہیں اور مستقبل ہے میرا فرمایا ہوا۔ ہم یکتائی اور نرگسی آئینہ لئے اپنے جمال کے نظارہ میں محو رہتے ہیں لیکن یہ بنیادی حقیقت فراموش کر بیٹھے ہیں کہ دوسرے بھی ہم سے زیادہ پُر جمال ہو سکتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ آئینہ کو دو لمس نہیں!

خالد اقبال یاسر

مثنوی میر حسن کا تجزیاتی مطالعہ

میر حسن (۱۷۲۸ - ۱۷۸۶) نے ایسے پر آشوب دور میں آنکھ کھولی جب مغل سلطنت اپنے عروج کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی اور اب اس زریں عہد کی یادیں اور یادگاریں باقی رہ گئی تھیں۔ درباری، عوام اور فوج کے رشتوں پر استوار سماجی ڈھانچہ شکست و ریخت کے اندوہناک عمل سے دوچار تھا اور اس دور کے ہر صاحب بصیرت انسان کی طرح میر حسن بھی اس زوال کے حساس مگر بے بس عینی شاہد تھے، ان کے اپنے بیان کے مطابق شروع جوانی میں گردش روزگار بد ہنجار کی جفا کاری سے وہ لکھنؤ اور فیض آباد کی طرف روانہ ہوئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۷۳۹ء میں دہلی پر نادر شاہ کی یلغار، قتل عام، لوٹ مار اور غارت گری سے ان کا براہ راست سابقہ پڑا ہوگا اور شاید یہی ان کے خاندان کی دلی سے ہجرت کی بنیادی وجہ ہوگی، فیض آباد اس وقت تک دلی کی بہ نسبت پر امن مقام تھا گرچہ ان کے ذاتی حالات یہاں بھی دگرگوں ہی رہے۔ انہی ذاتی پریشانیوں عسرت اور تنگدستی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اجتماعی کسمپرسی اور محرومی کا اظہار ان کی مثنوی سحرالبیان میں ہوا ہے جس کو ہمارے ناقدین عام طور پہ زبان و بیان کی دلکشی منظر کشی پر قدرت، واقعہ نگاری کے تسلسل اور جزئیات پہ کامل گرفت جیسی خصوصیات کے لیے اہمیت دیتے رہے ہیں۔

اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں جس وقت یہ مثنوی تخلیق ہوئی مرکز کی گرفت صوبوں پہ اس حد تک کمزور پڑ چکی تھی کہ مغل شہنشاہ شاہ عالم صرف نام کا شاہ عالم رہ گیا تھا۔ نادر شاہ کے بعد ملک احمد شاہ ابدالی مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی لوٹ مار کی زد میں تھا۔ کمزور بادشاہ رعایا کی حفاظت کے قابل نہ رہا تھا اس کی فوج سازشوں کا شکار ہو کر منتشر ہو چکی تھی۔ سودا کے الفاظ میں شہنشاہ دہلی کی فوج کے ؎

جو پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے سوار گر پڑیں سونے میں چارپائی سے

عمادالملک کی ریشہ دوانیوں اور مرہٹوں کے ساتھ ملی بھگت نے بادشاہ کو بالکل کنگال کر کے رکھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ذاتی ملازمین اور محل کے محافظین کو بھی تنخواہ دینے سے قاصر تھا اس وقت عوام میں ایک

فقرہ زبان زد خاص و عام تھا ؎

سلطنت شاہ عالم، از دلی تا پالم

خالصہ کی زمینوں کے مزارعوں تک نے لگان دینے سے انکار کر دیا تھا، نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ شہزادیوں اور بیگمات کے کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے تھے۔ بادشاہ کی پالکی کے لیے کہار نہ ملتا تھا۔ ۱۷۵۴ء تک قریب محل کے ملازموں اور محافظوں کی چھتیس مہینوں کی تنخواہیں بقایا تھیں۔ چنانچہ وہ خود کو بادشاہ کی ملازمت سے آزاد سمجھتے تھے انہوں نے کئی بار بغاوت کی اور امراء و وزرا کا خاص طور پر میر منشیوں کی حویلیوں پر خوراک کے حصول کے لیے حملے کیے ۱۷۵۶ء میں جب ایک وزیر کا انتقال ہوا تو انہوں نے نقد معاوضہ وصول کیے بغیر اسے دفنانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اسی سال انہوں نے قلعہ کی ناکہ بندی کر دی اور اپنے مطالبات پورا ہونے تک خوراک اور پانی تک قلعے کے اندر نہ جانے دیا۔ وزیروں نے انہیں کھلے عام لوٹ مار کی اجازت دے رکھی تھی اس لیے کہ وہ خود ان کے تقاضے پورے کرنے کے قابل نہیں رہے تھے، کوتوال شہر تک ڈاکہ زنی کی وارداتوں میں ملوث تھے اور لوٹ کے مال میں سے اپنا حصہ وصول کر کے ان کے خلاف کارروائی نہ کرنے کی ضمانت دیتے تھے

اس زوال کا ادب پر براہ راست اثر یہ ہوا کہ فارسی جو پہلے دربار کی زبان تھی اور علم و فضل کا معیار سمجھی جاتی تھی اس کا غلبہ کمزور پڑ گیا اور شعرا نے اردو زبان کو اظہار کا ذریعہ ٹھہرایا لیکن شعرا اب بھی دوسرے ملازمین کی طرح کسی حد تک امراء کی سرپرستی کے محتاج تھے اور دلی کے امراء کی زبوں حالی نے شعراء کو لکھنؤ کی جانب ہجرت پر اسی لیے مجبور کیا کہ ابھی وہاں کے امراء مکمل طور پر بدحال نہیں ہوئے تھے لیکن زوال کا اثر بہر حال بے حد ہمہ گیر اور اجتماعی ہوتا ہے:۔ خیال دور گذر چکا تھا، امراء کے پاس فراغت ہی فراغت تھی نہ تو انہیں جنگ کی ضرورت ہی رہی تھی اور نہ ہی انہیں اس میں کوئی فائدہ نظر آتا تھا یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ زوال کے عمل سے ذہنی طور پر خاموش سمجھوتہ کر رہے ہوں ارادے کمزور سے کمزور تر اور وسائل محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے تھے۔ جی حضوری، سازندے اور دستار پوش ملّا دربار پر چھائے ہوئے تھے، امراء خاصان حرم کے درمیان داد دینے میں مشغول رہتے تاکہ خارجی دنیا کے تلخ حقائق اور افق سے اٹھتی آندھیوں کے آثار انہیں پریشان نہ کریں شاعر بھی اسی دربار کا ایک حصہ تھا لیکن ایک ہی ماحول اور ایک جیسے زمانے میں رہتے ہوئے بھی شعرا کا ردِ عمل جدا رہا۔ ان میں سے ایک رویہ حقیقت پسندی اور زوال کا مقابلہ کرنے کی انفرادی جدوجہد سے عبارت ہے :

میر تقی میر کے ہاں ہر طرف پھیلے ہوئے تصنع اور ریاکاری سے نفرت ہی نہیں بلکہ ان اعلیٰ عصری اقدار کے بہ وفاداری سے ترتیب پاتا ہے جو رفتہ رفتہ ناپید ہوتی جا رہی تھیں۔ دوسرے رویے کا مظہر میر درد اور ان کی شاعری ہے جو تصوف میں پناہ ڈھونڈتے ہیں جو گریز کے ساتھ ساتھ زمانے کے فکر و فن اور شر کی قوتوں کے خلاف معلوم ناشناسی ہی کی ایک صورت ہے تیسرے سودا اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعے زوال کے شکار اداروں اور شخصیات کا مضحکہ اڑا کر دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور چوتھا رویہ گریز کی کمزور ترین صورت میں جمود کے شکار معاشرے کے۔ ات سمجھوتے یا اس کے جبر کے آگے گھٹنے ٹیک دینے سے عبارت ہے جو انسان کو حقیقت سے روگرداں

کرتے ہوئے خواب و خیال کی دنیا میں ہجرت کر جانے کا سبق دیتا ہے ایسے دور میں ادب کو عام طور پر تفنن طبع کا ذریعہ سمجھ لیا جاتا ہے تاکہ وہ حالات کے تقاضوں سے انسان کو غافل کر دے، اور افیون کی طرح وقتی طور پر سکون مہیا کرے اسی وجہ سے نثر میں طویل دیومالائی داستانیں تخلیق ہونے لگیں جن میں زبان و بیان کی مہارت کا مظاہرہ کیا جاتا۔ محاورے کی چاشنی اور مقفٰے و مسجع عبارت سے اسے رنگین اور دلچسپ بنایا جاتا تاکہ قاری یا سامع کی توجہ کھینچ سکے اور اس کا انہماک ختم نہ ہونے پائے اسی لیے کہانی میں تجسس برقرار رکھنے کے لیے کسی نازک موڑ پہ کہانی کو ختم کر دیا جاتا تاکہ اگلے روز تک پھر کیا ہوا؟ کی سی کیفیت برقرار رہے۔ سالزاں در نہ کھولنے کی تلقین، چپتے کھونٹ نہ جانے یا پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی نصیحت تجسس بڑھانے کے لیے داستان گو کا مخصوص طریقۂ واردات تھا بعض قصوں میں تو قصہ گو اور سامع دونوں افیون کی چٹکی لے کر داستان کا آغاز کرتے ہیں، چنانچہ اس دور میں جہاں نثر میں طوطا کہانی، قصہ چہار درویش اور طلسم ہوش ربا جیسی داستانیں لکھی گئیں وہاں شاعری میں بھی مثنوی کی صنف میں اسی قسم کی داستانوں پر طبع آزمائی کی کوششیں ہوئیں، ایسی کہانیوں میں رعیت کو خوش حال اور خزانوں کو مالا مال بتایا جاتا، عدل کا اس قدر چرچا ہوتا کہ جنگل میدان میں سونا اچھالتے جائیے کوئی نہیں پوچھے گا کہ آپ کے منہ میں کتے دانت ہیں لیکن باہر کا یہ حال ہے کہ شہر میں شہری فولاد خان کوتوال کی سرپرستی میں ڈاکہ زنی ہو رہی ہے۔ کہیں بنارس کے ٹھگوں نے غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ان کی رہزنی کے ڈر سے مسافر سفر پہ نکلتے گھبراتے ہیں۔ کہیں افغان دن دیہاڑے دیہاتوں اور شہروں پر دھاوے بول رہے ہیں، روہیلوں نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال کر مغلوں کی برائے نام عزت کو بھی خاک میں ملا دیا ہے اور وارن ہیسٹنگز نوابانِ اودھ کی بیگمات کی جامہ تلاشی میں مصروف ہے۔

زوال اور انحطاط کے جال میں آنے والے شہروں، تہذیبوں اور ریاستوں کے لوگ انفرادی طور پہ ہی نہیں، اجتماعی طور پر بھی بے حسی کا شکار ہو کر نصب العین سے عاری ہو جاتے ہیں جو کسی بھی معاشرے کو متحرک رکھنے کی شرطِ اول ہے، ان کی حیات آرزو سے خالی ہو جاتی ہے، ریاستی اور معاشرتی ادارے اسی طرح اپنے فرائض سے غافل ہو کر بدعنوانی کے عادی ہوتے چلے جاتے ہیں ادھر محبت کے جذبے کی تہذیب کے لیے کوئی واضح راستہ موجود نہیں ہوتا اور زندگی کے روحانی مطالبوں سے غفلت جنم لیتی ہے جس کے نتیجے میں جسم کی سطح پر زندگی گزارنے کا رجحان فروغ پاتا ہے۔ اور حد سے گزر کر طوائف بازی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے مے نوشی سے دو رات اک گونہ بے خودی میں مبتلا رہنا زندگی کا مطمع نظر ٹھہرتا ہے۔

شراب و کباب و بہار و نگار
جوانی و مستی و بوس و کنار

مثنوی سحر البیان کے اس شعر کی طرح انکی کہانی بھی اس دور کے انہی منفی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس کا آغاز بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کوئی بادشاہ تھا جو بہت حشمت و جاہ و مال و منال والا تھا۔ کئی بادشاہ اسے باج دیتے تھے اور اس کے طویلے کے ادنیٰ گدھوں کو بھی نعل بندی میں زر ملتا تھا۔ رعیت آسودہ حال و بے خطر تھی، لیکن دنیا کی تمام نعمتیں میسر ہونے کے باوجود اسے ایک غم تھا اور وہ تھا اولادِ نرینہ

سے محرومی کا غم، آخر اسی رنج میں اس نے ترک دنیا کا ارادہ کر لیا۔ وزیر باتدبیر نے اسے روکا اور نجومیوں اور رمالوں کو دربار میں طلب کر لیا۔ انہوں نے آپس کے مشورے کے بعد یہ پیش گوئی کی کہ بادشاہ کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوگا لیکن بارہ برس تک اسے بلندی سے خطرہ رہے گا اس لیے اس کی بہت دیکھ بھال کرنا ہوگی۔ پیش گوئی کے مطابق بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام بے نظیر رکھا گیا، حفاظت کے خیال سے اسے بارہ برس تک محل ہی میں رکھا گیا اور اسے ہر طرح کی تعلیم و تربیت دی گئی لیکن اتفاق سے جس رات اس نے چھت پر سونے کی خواہش ظاہر کی اور اسے بارہ سال پورے ہونے کی خوشی میں چھت پر سونے دیا گیا وہ اس کے بارھویں سال کی آخری رات تھی اس کے سو جانے پر پہریدار بھی غافل ہو گئے ایک پری اس رات وہاں سے گزر رہی تھی اس نے شہزادے کو دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو گئی اور اپنے ساتھ اٹھا کر پرستان لے گئی۔ ادھر اس کے ماں باپ کا غم سے برا حال تھا ادھر بیان سے بچھڑ کر اداس رہتا تھا۔ پری نے اس کا جی بہلانے کے لیے اسے کل کا ایک گھوڑا دیا تاکہ وہ اس پر سوار ہو کر دنیا کی سیر کر لیا کرے، ایک دن سیر کے دوران وہ ایک باغ میں اترا جہاں شہزادی بدر منیر بھی اپنی ہم جولیوں کے ہمراہ سیر کرنے آنکلی تھی، بے نظیر انہیں دیکھ کر درختوں میں چھپ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہلی نظر میں ایک دوسرے پر یوں عاشق ہوئے کہ فرطِ شوق میں ان کے ہوش جاتے رہے دختر وزیر نجم النساء نے عطر گلاب چھڑکا جس سے دونوں ہوش میں آئے دونوں نے باہم اظہار محبت کیا اور وصل سے ہمکنار ہوئے اگلی رات وہ پھر ملے لیکن پری ماہ رخ کو خبر ہو گئی اس نے رقابت میں آکر شہزادے کو اندھے کنوئیں میں قید کر دیا۔ ہجر میں بدر منیر کا برا حال تھا اسے خواب میں بے نظیر کی قید کے بارے میں علم ہو گیا۔ نجم النساء جوگن بن کر شہزادے کو قید سے چھڑانے نکلی تو ایک پری زاد فیروز شاہ اس پر جان سے عاشق ہو گیا اور اپنے ساتھ اٹھا کر اپنے ملک لے گیا، نجم النساء نے اس شرط پر اس سے شادی پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ بے نظیر کو ماہ رخ کی قید سے چھڑائے گا۔ فیروز شاہ نے ماہ رخ کو ڈرا دھمکا کر بے نظیر کو آزاد کرا لیا دونوں بدر منیر کے پاس آئے بے نظیر بدر منیر کے باپ سے شادی پر رضامند ہونے یا جنگ کے لیے تیار ہونے کے لیے کہتا ہے، بدر منیر کا باپ مسعود شاہ شادی پر رضامند ہو جاتا ہے۔ اور شادی کے بعد فیروز شاہ اور نجم النساء رخصت ہوتے ہیں اور بدر منیر بے نظیر کے ساتھ امن و چین کی زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔

اس کہانی کے مطابق حقیقت سے آنکھیں چرانے کی ایک اور مثال اولاد سے محرومی کا بیان ہے بادشاہی کے بل پر استوار معاشرے میں ولی عہد سے محرومی یقیناً بہت بڑا مسئلہ ہے اس لیے کہ اس کی غیر موجودگی میں انتقال اقتدار کا عمل پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتا ہے لیکن جس زمانے میں میر حسن نے ہوش سنبھالا اس زمانے کے لوگوں کو اولاد کی کمی نہ تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بادشاہ وقت کی اولاد کی زیادہ تر تعداد طوائفوں اور لونڈیوں سے تھی اور شاہی خصلتوں سے بالکل بے بہرہ اور ناکارہ تھی۔ خضر خان جیسے خواجہ سرا طوائفوں کے دلال ہونے کے ناطے بادشاہ کے مشیر اعلیٰ تھے کے مطابق شجاع الدولہ کی اگرچہ صرف ایک بیگم تھی لیکن اس کے حرم میں لاتعداد لونڈیاں تھیں اور ان کو لونڈیوں کے بطن سے بیس لڑکے اور شاید اسی قدر لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ غیر منکوحہ لونڈیوں کی اولاد اپنے خادموں سمیت خورد محل میں رہتی تھی اور ان کی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی۔

قصے کے مافوق الفطرت عناصر اس پر مستزاد ہیں، دیو، پریاں اور کل کے گھوڑے کا ہماری حقیقی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں لیکن اس غیر حقیقی غیر ذہنی اور غیر استدلالی کہانی میں سے بھی لکھنؤ کا معاشرہ اپنی جھلک دکھاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر موضوع اپنے گرد و پیش سے جنم لیتا ہے اور کسی بھی نوعیت کا تخلیقی عمل خواہ وہ حقیقت پسندانہ ہو یا تخیلاتی خارج ہی کی پیداوار ہوتا ہے، ماورائی تصورات بھی دراصل مادی دنیا ہی کا پرتو ہوا کرتے ہیں یا ورائیت عبارت آرائی، تصنع قافیہ پیمائی اور رنگین سے رنگین تر موضوعات کی تلاش دراصل درباری روایت سے پھوٹنے والی شاعری اور شاعروں کی مجبوری بن جاتی ہے تاکہ ان کے فن اور خامی پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے جس کے سہارے ان کا دال دلیہ چلتا ہے، شہنشاہ خود ایسے غیر عملی افکار کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو عوام کو الہیاتی اور ماورائی دنیا کے سحر انگیز تصورات میں الجھائے رکھیں تاکہ انہیں اپنے استحصال کا شعور حاصل نہ ہو پائے، مافوق الفطرت عناصر معاشرے کے ٹھہراؤ اور سہل پسندی کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ جب انسان اپنے زور بازو سے کوئی کارنامہ سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتا تو پھر وہ نصب العین کے حصول کے لیے درمیانی راستوں (Short cuts) کی تلاش میں رہتا ہے عملی دنیا میں یہ درمیانی راستے سفارش دھونس اور دھاندلی کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ جب کہ خیالات کی دنیا میں کل کا گھوڑا، رحم دل جن یا اللہ دین کا چراغ اس کی ایسی نفسیاتی ضرورتوں کی تسکین کرتے ہیں جن کی مدد سے خیال ہی خیال میں اس کے مسائل چٹکی بجاتے میں حل ہو جاتے ہیں۔

جمود کے اسی جبر کے تحت مثنوی سحر البیان کا شاعر بھی ایسی کہانی سنانے پر مجبور ہے جو معاشرے کے کھوکھلے اور فرسودہ اداروں کی ظاہری شان و شوکت اور دبدبے کو بچائے رکھے اور اس کی فرسودگی کو آشکار نہ ہونے دے۔

جاگیرداری عہد میں جس طرح ذرائع پیداوار پر اونچے طبقے کی اجارہ داری ہوتی ہے اسی طرح عورت پر بھی سب سے پہلا حق اسی کا ہوتا ہے۔ چنانچہ عورت سے عشق اور اس سے حظ اٹھانے کا شہزادے کو خصوصی اختیار حاصل ہوتا ہے یوں بھی زوال کے عہد میں اسے تیر اندازی۔ شہ سواری اور جنگ و جدل جیسے مردانہ کاموں سے رغبت نہیں رہتی عورتوں کی صحبت میں رہتے رہتے اسے مردانہ زبان کا محاورہ بھول جاتا ہے اور محل میں سانپ گھس آنے پر اس کے منہ سے بے ساختہ کسی مردوئے کو مدد کی خاطر بلانے کے لیے پکار نکلتی ہے۔ معاشرے کی جانب سے فراہم کردہ تحفظات اور مراعات کے باعث عشق میں اس کی ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب کہ عام معاشرے کے کسی نوجوان کے لیے اپنی محبوبہ کی محض ایک جھلک دیکھنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا اور وہ اپنی محبت کے المیہ انجام کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار ہوتا ہے۔

شہزادوں کے تصور عشق کے عین مطابق اس مثنوی میں بھی محبت کا تصور پاک نہیں ہے اور انگریزی زبان کے محاورے Love making سے ملتا ہے، کہانی کا ہیرو بے نظیر ہر موڑ پر ہمیں جنسی اختلاط میں مصروف نظر آتا ہے، وہ شہزادی بدر منیر اپنے عشق میں ثابت قدم اسی لیے رہتی ہے کہ وہ اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا باپ مسعود شاہ شادی پر اسی لیے رضامند ہوتا ہے کہ اس سے اسے سیاسی مفادات

حاصل ہو سکتے ہیں اور کہانی کا انجام منطقی طور پر طربیہ رہتا ہے۔

کہانی میں دیو اور پریوں کے کردار بھی دراصل انسانوں ہی کے بعض مثالی نمونوں کو پیش کرتے ہیں دیو آپ ایسا مرد سمجھ لیں جو مردانگی اور قوت کے اعتبار سے دوسرے مردوں سے برتر ہے۔ اسی طرح پری وہ عورت ہے جو عام عورتوں اور خوبصورتی کے عام معیاروں سے زیادہ حسین وجمیل ہے اس لحاظ سے ان کے کردار اور ان سے وابستہ محیرالعقول کارنامے انسانی زندگی سے الگ نہیں کیے جا سکتے کیونکہ ہر انسان اگرچہ ایسا نہیں ہوتا لیکن ایسا بن جانے کی خواہش اس کے دل کے کسی گوشے میں ضرور انگڑائیاں لیتی ہے دوسرے یہ کہ اس دور کے انسان شاید ان پر جادوں اور پریوں کے وجود پر ہمارے آج کے جمہوری معاشرے کے انسان کے مقابلے میں زیادہ یقین رکھتے تھے۔ سحرالبیان کی پری مہ رخ اور پری زاد فیروز شاہ کے نام ہی عام انسانوں جیسے نہیں بلکہ جذبات بھی عام انسانوں جیسے ہیں وہ بھی عشق کی آگ میں جلتے ہیں۔ چند ایک خصوصیات کے علاوہ جو انہیں انسانوں کے گروہ سے الگ کرتی ہیں ان کی زندگی کے عام معمولات، رسم و رواج اور بول چال عام انسانوں جیسی ہے اور انہیں بھی اپنے معاشرے میں اپنی سماجی قیود اور حد بندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن سے عام انسان دوچار ہوتے ہیں۔ مہ رخ کو بھی اسی طرح اپنے عشق کو راز اور عاشق کو اپنے باپ سے چھپانا پڑتا ہے جس طرح بدرمنیر دنیا سے خوف کھاتی ہے، پری زاد فیروز شاہ بھی نجم النساء کے عشق میں اسی طرح مبتلا ہوتا ہے جس طرح بے نظیر بدرمنیر کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے دربار سے منسلک شاعر کو عام زندگی میں ذاتی مسائل سے یقیناً واسطہ پڑتا ہے اور وہ ان مسائل کے ذمہ دار طبقے سے بھی شناسا ہوتا ہے لیکن ایسے نظام معاشرت کی غلامی اور جبر اسے اسی نظام کی خرابیاں اجاگر کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس کا وہ بھی خود بھی ایک ادنیٰ کل پرزہ ہے، اسے دربار اور اس کے طبقے میں جود و سخا، شان و شوکت اور جاہ و جلال کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا اور اگر نظر آتا بھی ہو تو وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا مثنوی سحرالبیان میں اسی نسبت سے لکھنؤ کے معاشرتی ڈھانچے کے محض اسی ایک خورد بینی حصے کی عکاسی ہوئی ہے جو امراء کے طبقے پر مشتمل ہے، لہٰذا اس تمدن کے زیریں طبقوں میں موجود بے چینی کی عکاسی کے برعکس اس مثنوی میں عشق و عاشقی، رقص و سرور، خوابوں کی رنگ رلیاں اور چہلیں، شادی بیاہ کی دھوم دھام، شکار کے جلوس، ولادت کی رسوم، حمام میں نہانے کی کیفیت، محلوں کی آرائش، دوستوں کی رونقیں شاہانہ ملبوسات خوابگاہوں کے نقشے بہت کچھ درباری تمدن کا چربہ ہے اور یہ سارا تصنع وہی ہے جو حالی کے خیال میں مسلمانوں کے آخری دور کے سلاطین کی زندگیوں پر حاوی ہو جاتا ہے اور اقبال اسے طاؤس و رباب آخر کہتے ہیں مگر بیشتر ناقدین اسے اس اعتبار سے محمد شاہی اور شاہان اودھ کے درباروں اور اس عہد کے اونچے تمدن و معاشرت کا مرقع سمجھتے ہیں۔

میر حسن جب شہزادے کی ولادت کا حال بیان کرتے ہوئے جشن کی تصویر کشی کرتے ہیں تو قاری کو غیر محسوس طور پر سلطنت مغلیہ کے دور زوال میں پہنچا دیتے ہیں، غیر ترقی یافتہ معاشرے کے جاہل افراد ہی نہیں

بادشاہ بھی اولادِ نرینہ کے لیے منتیں مانتا ہے اور مسجدوں میں دیے جلاتا ہے اور جب نجومیوں اور جوتشیوں کی پیش گوئی کے مطابق ولی عہد پیدا ہوتا ہے تو سجدۂ شکر بجا لاتا ہے اور دربارِ عام منعقد کر کے عام خوشی منانے کا حکم دیتا ہے جو سلطنت کے عوام کے لیے بہت بڑا واقعہ ہے، چاروں طرف شادیانے بجنے لگتے ہیں، نقار خانے میں نوبت بجائی جاتی ہے تاکہ خاص و عام سن کر شاد کام ہوں۔

بجے شادیانے جو واں اس گھڑی
ہوئی گرد و پیش آ کے خلقت کھڑی

ہم ل کے بیٹھے جو شہنا نواز
لگا منہ پہ پھرکی لگا اس آ ساز
لگے لینے اونچاں خوشی سے نئے
ارانا لگا بجنے اور سگھڑئی

امیر و وزیر اس خوشی کے موقع پر بحضور شاہ نذریں گزارتے ہیں کیوں کہ نظامِ ملوکیت میں اختیارات اور جاگیر کے مستحق وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں شاہ کی خوشنودی حاصل ہو، شہ کے خالص الخاص مصاحبین کو درباداری کے طفیل ہی بیش قیمت جاگیریں اور منصب عطا ہوتے اس لیے جاگیر کے خواہش مندوں اور جاہ و منصب کے طلب گاروں کے لیے شہزادے کی ولادت سے زیادہ بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حسب توقعات ؎

دیے شاہ نے شاہزادے کے ناؤں
مشائخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر لشکر کو زر
وزیروں کو الماس و لعل و گہر
خواصوں کو خوبوں کو جوڑے دیے
پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیے

غرض جس کے پاس جو نہیں تھا اسے عطا کیا، رقص و سرور کی محفلیں گرم ہوئیں۔ چھٹی اور بسم اللہ کی رسم دھوم دھام سے منائی گئی، شاہی سواری کی شان و شوکت دیکھنے کے قابل تھی سارا شہر آئینہ بند تھا۔ سواری کے آگے نقیب اور چوبدار بہ اہتمام سونے روپے کے عاصے لے کر چلے، سواروں، پیادوں، اور فیلوں کی قطاریں بندھ گئیں، آہستہ گھوڑوں پر لباس زری میں ملبوس نقارچی قدم قدم راستہ بناتے، ہر کسی نے جلوس میں حسب مرتبہ مقام پایا۔

میر حسن نے جو کچھ لکھا ایسا سلیس اور رواں کہ جو کہانی کا بھی بنیادی تقاضا تھا اور حقیقت نگاری کا بھی جذبات کی عکاسی پر دسترس بھی میر حسن نے اپنے اسی اسلوب سے بہم پہنچائی ہے۔ انسانی ہمدردی کا ایک ایسا

تصور میں مثنوی کی واقعاتیت اور جذباتیت میں جاری و ساری ہے کہ جس سے مافوق الفطرت عناصر پس منظر میں چلے گئے ہیں اس کے کرداروں کا رویہ ازحد پرخلوص ہے اور اسی خلوص نے نجم النساء کے کردار کو اہم بنایا ہے۔ جو کہانی کو کہیں رکنے نہیں دیتا اور جب ایک دفعہ حالات کی زمام اس کے ہاتھ میں آتی ہے تو پوری کہانی اس کی محتاج ہو کر رہ جاتی ہے، وہ جوش سے زیادہ ہوش اور جذبات سے زیادہ عقل سے کام لیتی ہے اور اپنے تدبر سے سہل پسند شہزادی اور شہزادے کی مشکلات آسان کرتی ہے۔ اور ان کے راستے کی دیواریں گراتی چلی جاتی ہے اس کا دل انسانی ہمدردی سے لبریز ہے اور دوسروں کی مدد میں اس کے لیے راحت ہے وہ اپنے عشق میں کامیابی کو بے نظیر اور بدرمنیر کے ملاپ کے ساتھ مشروط کر دیتی ہے اس کے جذبۂ خلوص کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کے حوالے سے اور بھی معنی خیز بن جاتی ہے جب ہم اس بات کی طرف دھیان دیتے ہیں کہ جس طرح اس دور کی کہانیوں میں بادشاہ کے لیے وزیر کا باتدبیر ہونا ضروری ہوتا ہے اسی طرح شہزادی کے لیے وزیرزادی کا باتدبیر ہونا بھی ضروری ٹھہرتا ہے۔

کرداروں کے حوالے ہی سے میرحسن نے رنج و الم، حسرت و یاس، مسرت و انبساط اور ہجر و فراق کے مضامین کو بہت خوبی سے باندھا ہے، مثلاً رخصت کے منظر میں میرحسن نے اپنے قلم کی تاثیر سے صداقت کے پہلو کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

یہ بیٹھے تھے خوش ہو کے باہم اُدھر
کہ اتنے میں اُدھر سے باجا پہر
پہر کے وہ بجتے اٹھا بے نظیر
ہوئی غم کی تصویر بدرمنیر
نہ بولی نہ کی بات نے کچھ کہا
نہ دیکھا ادھر آنکھ اپنی اٹھا
کہا مجھ سے پیاری نہ بیزار ہو
پھر آؤں گا بولی کہ مختار ہو

ہجر و فراق کے مضمون کو بیان کرتے ہوئے میرحسن نے جزئیات کی طرف خصوصی توجہ صرف کی ہے۔

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اٹھنا اسے کہہ کہ ہاں جی چلو
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی
یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے
تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے

جذبات کی دنیا میں ماں کی ممتا سے بڑی سچائی اور کوئی نہیں ہے، یہ وہ رشتہ ہے جہاں غریب امیر ایک ہو جاتے ہیں اور طبقاتی تفریق پیچھے رہ جاتی ہے، بیٹے کی گم شدگی پر ماں کی بے قراری کے اظہار میں اپنے کمال فن کو اتنی شدت سے بروئے کار لانا میر حسن ہی کا کام ہے :

کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے بکس رہ گئی
گئی بن سے وہ شہ کو لب بام پر
دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیمبر
یہی تھی جگہ وہ جہاں سے گیا
کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا
شب آدھی وہ جس طرح سو گئی
رہی تھی جو باقی وہ روتے کٹی
عجب طرح کی شب تھی بیہیات وہ
قیامت کا دن تھا نہ تھی رات وہ
سحر نے کیا جب گریبان چاک
اڑانے لگے مل کے سب سر پہ خاک

محبت میں فنا کی حد تک انجذاب اور وفور شوق نجم النساء اور پری زاد کے مابین اس طرح سے معلوم ہوتا ہے :-

وہ جوگن جو تھی درد و غم کی اسیر
ہوا غم میں جوگن کے یہ بھی فقیر

نہ سدھ گھر کی لی اور نہ لی راہ کی
جب آئی ذرا سدھ تو پھر آہ کی
بجاتی رہی ہیں وہ صبح تلک
یہ رویا کیا سامنے بے دھڑک
دھری اپنے کاندھے پہ جب اس نے بین
اٹھی لے کے انگڑائی زہرہ جبین
پری زاد نے تب پکڑ اس کا ہاتھ
شتابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ
زمیں سے اڑا آسماں کے تئیں
وہ کتنا کہا کی نہیں رے نہیں

یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر فن، محمود فاروقی کی رائے میں کسی سے بڑھ کر وہبی ہو جاتا ہے اور اس کا اثر چکبست کے مطابق بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے۔

میر حسن سراپا نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور انہوں نے مغلوں کے عہد زوال میں ہندوستانی شہزادے شہزادیوں اور امراء کی بہت عمدہ شبیہیں پیش کی ہیں۔ ایک مکتبۂ فکر، مسلمان شعراء کی مثنویوں میں سراپا نگاری کے اعتدال کی حدوں سے نکلتے ہوئے رجحان کو ہندوستان کے بت پرستانہ مذاہب کی دین سمجھتا ہے۔ اس لحاظ سے مثنوی سحر البیان مذہبی معاشرے کی بھی عکاس ہے اور اگر اس پر مزید تحقیق کی جائے تو ہندی موسیقی کے راگوں، نجم النساء کے جوگ اور رسالوں کی پیش گوئیوں کے طریقوں کے علاوہ اور بھی ایسی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں جہاں اگرچہ ہندو اور مسلمان تہذیبیں معانقہ کرتی نظر آتی ہیں اور ابھی علیحدہ مسلم قومیت شاید اپنے ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں داخل ہوا چاہتی تھی۔ اور کوئی شعر اس لیے زبان زد عام ہوتا ہے کہ اس میں بظاہر بہت معمولی مگر بہت نازک اور بنیادی حقیقت سادہ اور دلنشین پیرائے میں بیان ہوئی ہو اور اپنی طرز اظہار سے ایک مشترک تجربہ بن جائے جسے ہر کوئی SHAPE کر سکے۔

سحر البیان کے بھی بعض اشعار زبان و مکان کی حدوں سے نکل کر لافانی ہو گئے ہیں:۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
کٹی رات حرف و حکایات میں
سحر ہو گئی بات کی بات میں
کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
لبوں سے ملے لب دہن سے دہن
دلوں سے ملے دل بدن سے بدن

شاید یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے باعث مولانا محمد حسین آزاد یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ میر حسن نے لکھا اور
یی صاف زبان فصیح محاورے اور مٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت سے ادا کیا جیسے آب رواں، اصل
اقعے کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ گیا اور ان ہی باتوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں جو اس وقت وہاں ہو رہی
ہیں .... اس نے خواص اہل سخن کی تعریف پر قناعت نہ کی بلکہ عوام بھی جو حروف تہجی بھی نہیں پہچانتے تھے
لیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے"

لوگوں کی زبانوں پر اس مثنوی کے چڑھ جانے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ لوگ زوال کے عہد میں بھی
ہائی کے لیے ابھی تک انہی اداروں کی طرف دیکھتے تھے جن کا ذکر اس مثنوی میں ہوا ہے۔ دوسری وجہ
ارے ہاں صدیوں سے پائی جانے والی اسلاف پرستی اور نفسیاتی ضرورت کے تحت درخشندہ ماضی کی
رف دیکھنے کی عادت ہے جب ہر طرف امن و چین اور خوشحالی کا فی الحقیقت دور دورہ تھا اور تیسری وجہ
حقائق کی تلخی سے گریز کرتے ہوئے خارجی عوامل سے پیدا ہونے والے اعصابی تناؤ کو کم کرنے کے لیے خواب و خیال
لی دنیا میں ہجرت کرنے کا رجحان ہے۔ بہرحال اتنی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہم اس مثنوی سے اس
ور کے عام معاشرے کی بالواسطہ طور پر اور درباری معاشرے کی بلاواسطہ طور پر تفہیم کا کام لے سکتے ہیں۔

بزمِ خیال

احمد شجاع پاشا
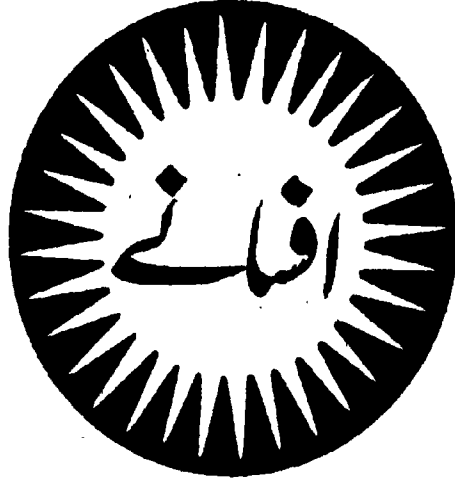
اُستاد شاہو

بھدا جسم ۔ ناٹا سا قد ۔ پھولا ہوا پیٹ ۔ مکروہ صورت یہ تھا شاہو ۔ جسے اس کی محفل میں اٹھنے بیٹھنے والے اُستاد کہتے تھے ۔ جسے شہر بھر کی کوتوالیوں کے تھانیدار اور سپاہی اچھی طرح جانتے تھے ۔ مشتبہ چال چلن کے لوگوں کے ناموں کی فہرست میں استاد شاہو کا نام سرِفہرست تھا ۔ شہر میں کسی جگہ دنگا فساد ہو جاتا ۔ کوئی تالا ٹوٹ جاتا ۔ کسی کی جیب کٹ جاتی ۔ کسی کے ہاں چوری ہو جاتی ۔ تھانیدار فوراً شاہو کو بلا لیتے ۔ پولیس کا ایک سپاہی سرکاری پروانہ لے کر شاہو کے ہاں پہنچتا ۔ وُہ دروازہ کھٹکھٹاتا ۔ شاہو بھنگ کا پیالہ ہاتھ میں لیے کنڈی کھولتا ۔ اپنی تندرست آنکھ گھما کر آنے والے کی طرف دیکھتا ۔ اور مسکرا دیتا ۔ یہ مسکراہٹ اس کے ایک کان سے دوسرے کان تک پھیل جاتی ۔ اس کے پیلے پیلے ٹوٹے ہوئے دانت صاف نظر آنے لگتے ۔ وُہ بھنگ کا پیالہ دروازے کے پہلو میں بنے ہوئے طاق میں رکھ دیتا ۔ جہاں رات کو سرسوں کے تیل کا دیا جلا کرتا تھا ۔ تہبند کے پلّو سے منہ صاف کر کے عجیب انداز سے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ۔ اور اپنی بیمار آنکھ کو جو عرصہ پہلے ایک ڈاکٹر کی دونالی سے نکل کر بھٹکتے ہوئے چھرّے کی نذر ہو گئی تھی چھپا کر دوسری آنکھ میچ لیتا ۔ اور پھر ـــــ کچھ توقف کے بعد کھونٹی پر لٹکتی ہوئی سفید پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لیتا ـــــ چارپائی پر پڑا ہوا کرتہ گردن میں لپیٹ کر پو ہٹھار جوتی ہاتھ میں پکڑ لیتا ۔

"چلیں ـــــ" وُہ سپاہی سے پوچھتا "چلوں جمعدار جی ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"سوا سیر سلفہ کا انتظام کر لوں کہ جلدی چھٹی مل جائے گی ـــــ"

"کون جانے شاہو ـــــ تمہاری تقدیر ـــــ"

"کیوں بتاؤ جمعدار جی اب کی بار کیا ہوا ـــــ سر پھٹول ہوئی ـــــ تالا ٹوٹا کہ جیب کٹ گئی ـــــ"

"تالا ٹوٹا ہے —"
"ٹکڑی گئی ہے —؟"
"ارے کسی نے ایک بدنصیب کے تنور پر رکھا ہوا صندوقچہ اٹھا لیا۔ دس روپے ساڑھے تیرہ آنے تھے —"
شاہو اس زور سے ہنسا کہ کمرے کی کمزور دیواریں ہلنے لگیں۔ دروازے کی چولیں چرچرا اٹھیں۔
ارے جمعدار جی لیں — کل رقم دس روپے ساڑھے تیرہ آنے — نہ جمعدار جی۔ اُستاد شاہو کے شاگرد ایسی گھٹیا چوری نہیں کرتے ہیں۔ سمجھا ہزار دو ہزار کا مال گیا ہے اور تھانیدار جی شاہو کو بلا رہے ہیں —"
"چوری پھر چوری ہے —"
"شاہو سزا یافتہ چور ہے جمعدار جی — گھٹیا چور نہیں —"
"اب دیر نہ کر شاہو —"
"لو جمعدار جی ابھی لو — یہ بھنگ کا اک گھونٹ چڑھا لوں۔ پیو گے۔ کہو تو اک پیالہ لا دوں۔ قسم خدا کی جمعدار کو بھی جنت میں پہنچا دیتی ہے —"
تھانیدار بلا کر پوچھ گچھ کرتا۔ رات بھر کے لیے شاہو حوالات میں بند کر دیا جاتا۔ اکثر اوقات پٹائی بھی ہوتی۔ کبھی جیل ہو جاتی اور کبھی اُسے رہا کر دیا جاتا —
شہر کی عدالت نے اسے سولہ بار سزا دی تھی۔ کئی بار جرم ثابت نہ ہونے پر رہا کیا تھا۔ شاہو کی زندگی کے پندرہ بیس قیمتی سال بندی خانے میں گزرے تھے۔ آج سے بیس بائیس سال پہلے جب اس کی عمر یہی چوبیس پچیس سال کی تھی۔ اس نے پہلی چوری کی تھی۔ یہ چوری ایک ایسی عورت کے لیے تھی جسے وُہ شہر سے بھگا کر لایا تھا۔ زینو کے متعلق وہ اپنے دوستوں سے یہ کہتا تھا کہ زینو بڑے امیر کبیر گھرانے کی بیٹی ہے۔ وُہ اپنی دولت۔ اپنا گھر بار۔ سب کچھ اس کے لیے تیاگ کر اس کے ساتھ چلی آئی۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وُہ زینو کو ایک بوڑھے کے گھر سے اچک لایا تھا۔ جسے نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں پالنے کا شوق تھا۔ زینو فیشن ایبل عورت تھی۔ اُسے سُرخی۔ پاؤڈر۔ سبھی کچھ چاہیئے تھا۔ شاہو کی جیب خالی تھی اور وُہ جانتا تھا کہ عورت کو مطمئن رکھنے کے لیے کون سے اصولوں پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ زینو کے مطالبات بڑھے۔ شاہو کا بس نہ چلا۔ اس نے سینما کے ٹکٹوں کی بلیک مارکیٹ کی۔ یوں بھی کام نہ چلا۔ اس نے ایک سینما گھر کے سامنے نئی فلم دیکھنے والے ہجوم میں گھس کر یکے بعد دیگرے پانچ سات جیبیں تراش لیں۔ بیس پچیس روپے لے کر گھر پہنچا اور زینو کو عطر میں نہلا دیا۔ زینو کے منہ کو خون لگ چکا تھا۔ وہ کب رکنے والی تھی۔ اس نے پھر مطالبہ کیا۔ شاہو نے پھر چوری کی۔ اب کی بار محلے کے چودھری امام بخش کی نون تیل کی دکان کا تالا توڑا۔ اس آسان طریقے سے پیسے ہاتھ آئے تو شاہو کی جھجک جاتی رہی۔ وُہ ڈھیٹ ہو کر چوری کرنے لگا۔ اُسے کچھ ساتھی اور مل گئے۔ وُہ زیادہ تجربہ کار تھا۔ اس ٹولی کا سردار بن گیا۔

اور بالآخر ایک دن پولیس نے شاہو کو پکڑ لیا۔ اس کے ہاں سے چوری کا مال برآمد ہوا تھا۔ عدالت میں پیشی ہوئی۔ مقدمہ چلا۔ منصف نے ڈیڑھ سال کی سزا دی۔ ڈیڑھ سال کی سزا بھگتنے کے بعد اس کی دُنیا میں صرف ایک تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ اور وہ تھی کہ زینو اب اس کے ہاں نہیں تھی۔ کسی اور کے ہاں تھی۔ زینو کا غیر شرعی خاوند وہ حوالدار تھا جو شاہو کی خانہ تلاشی کے لیے ہو کے گھر آیا تھا اور جس نے چوری کا مال قرق کرنے کے بعد شاہو کی زینو کو بھی قرق کر لیا تھا ———

اس کے بعد ——— چوری اور سزا ——— یہ تھی شاہو کی زندگی ——— ایک بار اس نے تھانے کے محرر کو نام اور پتہ لکھواتے قت بڑے مزے کی بات کہدی تھی۔ "نام شاہ دین عرف شاہو" اس نے کہا تھا "باپ کا نام فتح دین۔ پیشہ چوری اور جیل کاٹنا ——— " شاہو کی بائیں آنکھ بھی اسی پیشے کی نذر ہو گئی تھی۔ ایک رات وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ شہر کے ایک ڈاکٹر کی بیٹھی میں جا گھسا تھا۔ گرما کی چاندنی رات تھی۔ گھر والے باہر صحن میں سو رہے تھے۔ چوروں نے نقب لگائی۔ سامان اکٹھا نقدی۔ زیورات۔ جو کچھ بھی ملا سمیٹ لیا۔ کمروں میں ایک تنکا تک نہ چھوڑا۔ کمرے بھائیں بھائیں کرنے لگے۔ سامان سمیٹ کر یہ لوگ باہر نکلے تو صاحبِ خانہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چور چور پکارتا ہوا بستر سے اُٹھا۔ شاہو اور اس کے ساتھی کچھ یزیں اُٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر کے پاس دو نالی بندوق تھی۔ اس نے بندوق داغ دی۔ شاہو سب سے آگے تھا۔ یک چھرّہ اس کی آنکھ میں پیوست ہو گیا۔ وہ چکرا کر گرا۔ اس کے ساتھی اسے اُٹھا کر ساتھ لے گئے۔ اور دوسرے ہی دن شاہو علاج کے لیے اسی ڈاکٹر کے پاس چلا آیا۔

"یہ کیسے ہوا ——— " ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ایک حرامی کی بندوق ڈاکٹر ——— ایک حرامی کی بندوق ——— " علاج ہوتا رہا۔ زخم تو مندمل ہو گیا۔ مگر آنکھ جاتی رہی۔ دراسی چوری کے سلسلے میں جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو منصف کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"شاہو ——— " اس نے کہا

"جی حجور ——— "

"شاہو میں تم کو کتنی بار اس عدالت میں دیکھ چکا ہوں ——— "

"اس میں میرا کیا کسور ہے سرکار ——— "

"اور کس کا ہے ——— "

"آپ کا مرے حجور ——— "

"کیا بکتے ہو ——— "

"جی ہاں میرے حجور۔ آپ کی تبدیلی ہی نہیں ہوتی۔ تین سال تو کب کے ہو چکے ——— "

"دو سال ——— " منصف نے جھلا کر کہا۔

اسے جیل بھیج دیا گیا۔ اور وہاں بھی اس نے رجسٹر میں نام درج کراتے وقت وہی کہا: نام شاہ دین عرف استاد شاہو۔ پیشہ چوری اور جیل کاٹنا۔

اپنے فن کا وسیع تجربہ حاصل کرنے کے بعد شاہو استاد بن گیا تھا۔ بھنگ پینے والے پانچ دس ہر روز اس کے ہاں چلے آتے تھے۔ وہ ان کے لیے چٹائیاں اور دریاں زمین پر بچھا دیتا تھا۔ خود ایک مونڈھے پر بیٹھ جاتا کمرے میں دو تین حقے پڑے رہتے تھے۔ ایک حقہ خاص استاد شاہو کا تھا۔ جسے اور کوئی نہ چھو سکتا تھا دوسرے آنے جانے والوں کے لیے تھے۔ ایک کونے میں اپلوں کی آگ سلگتی رہتی تھی۔ کمرے میں دھواں چھایا رہتا تھا۔ گو ہو کہ سردی استاد شاہو کے کمرے کے کواڑ بند رہتے تھے۔ گرمی میں اپلوں کی آگ کمرے کی بجائے باہر برآمدے میں سلگتی تھی۔ اس کے چیلے چانٹے جنہیں اس نے اس فن کے بہت سے گر سکھائے تھے اس کے گرد جمع رہتے تھے۔ کوئی پولیس سے اُلجھتا تو سب سے پہلے شاہو سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

"ارے میں جانتا ہوں ــــ" وہ اپنی تندرست آنکھ گھما کر کہتا" میں سو بکیلوں کا ایک بکیل ہوں۔ یہ لوگ تو مرے سامنے بچے ہیں انہیں تو ابھی انٹی کھیلنا بھی نہیں آتا۔ یہ بکالت کھاک کریں گے "

"تمہارا تجربہ ہے استاد ــ" ایک کہتا۔

"ہاں ــــ یہاں کھالی کھولی کتابیں پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے تو جندگی گجاری ہے اسی ادھیڑبن میں ــ"

شہر کی انڈر گراؤنڈ دنیا میں شاہو کی شہرت بری افواہ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ بہت سے عقیدتمند ایسے تھے جو چوری کے مال سے اس کا حصہ الگ کر لیتے تھے۔ کسی کی جیب سے روپیہ ملا تو چوّنی استاد کی بھنگ کے لیے رکھ لی گئی۔ اور کچھ نہ بن پڑا تو آتے ہوئے پاؤ بھر مٹھائی ہی لیتے آتے ــــ

زینو کے جانے کے بعد شاہو نے عورتوں کو گھر میں بسانے سے انکار کر دیا تھا۔

"کون اِجت کھراب کرے اپنی ــــ" وہ کہتا "عورت جات کا کیا ہے۔ بات بات پر یوں پھسل جاوئے ہیں جیسے پاؤں تلے ہوں، نہ مرے بھائی۔ شاہو کی استادی یہاں نہیں چلتی۔ کوئی کڑیل سے کڑیل تالا لے آؤ۔ چٹکی بجاتے میں نہ کھول دوں تو شاہو نہیں چمار کہہ دینا۔ یہ علی گڑھی تالے۔ لوگ انہیں نجانے کیا سمجھنے لگے۔ میں نے وہ کرتب دکھاتے کہ یہاں کی بولتی بند ہوگئی۔ سب پھیکٹری میکٹری دھری کی دھری رہ گئی ہوگی ــــ"

"اور وستاد یہ ماسٹر لاک ــــ امریکن تالے ــ"

"ارے تالے امریکن ہوں کہ کوئی اور ــــ دُنیا بھر کے تالے"۔ شاہو کا نام سن کر کھل جاتے ہیں ــ"

عمر زیادہ ہوئی ــ جسم پھول گیا ــــ صورت مکروہ ہوگئی ــــ شاہو میں وہ پھرتی اور چالاکی نہ رہی۔ وہ مشورہ دینے کی فیس لینے لگا۔ مگر چوری اس کی گھٹی میں تھی۔ ہفتہ دس دن میں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر چین نہ آتا تھا۔ اب وہ یوں

کرتا تھا کہ شاگرد پیشہ کو آگے بڑھا کر خود مکان کے باہر ٹھہر جاتا، چوکیداری کرتا۔ ویسے نقب لگانے اور تالے توڑنے کے لیے پہل اسی کو کرنا پڑتی تھی۔ شاہو کا کام اسی طرح چلتا رہا۔ اس نے بیمار آنکھ کو چھپانے کے لیے عینک خرید لی۔ پھولے ہوئے پیٹ کی سلوٹوں کو چھپانے کے لیے نئے نئے کھلے کرتے بنواتے ــــ مگر اپنی راہ نہ چھوڑی ــــ پکڑا بھی گیا۔ سزا بھی ہوتی رہی ــــ جرم ثابت نہ ہونے کی وجہ سے رہا بھی ہوتا رہا ــــ مگر شاہو کی عادتیں پہاڑوں کی طرح اپنی جگہ قائم رہیں ــــ

جنگ ہوئی۔ اس کے بہت سے ساتھی اور شاگرد بھرتی ہو کر چلے گئے۔ کاروبار کچھ دنوں کے لیے مندا پڑ گیا۔ شاہو کو بھی سپاہی بن جانے کی ترغیب دی گئی۔ مگر پھوٹی ہوئی آنکھ نے ساتھ نہ دیا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ ساتھی کچھ مر کھپ گئے۔ کچھ لوٹ آئے۔ جرائم کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ شاہو کا کاروبار پھر چمک اٹھا۔ انگریز چلے گئے۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ دوسروں کے ساتھ شاہو نے بھی آزادی کا جشن منایا۔ آزادی کے گیت گائے۔ پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگائے "ہم آجاد ہوتے ہیں۔ ہمیں نیا ملک ملا ہے۔" اس نے اپنی محفل کے لوگوں سے کہا "ہمیں اس ملک کے لیے سب کچھ کربان کر دینا چاہیئے ــــ"

"ملی کچھ یاد استاد ــــ" ایک شاگرد نے کہا "اب تو ہمیں چوری کی بھی آجادی ہونی چاہیئے ــــ"

"چپ رہ اے سالے "

"اچھا استاد تم جیتے ــــ پاکستان جندہ باد ــــ" شاہو کے پسینے سے بھیگے ہوئے چہرے پر چمک سی آگئی۔
شاہو چوری کرتا رہا اور ایک عام شہری کی طرح ملک کی سیاسی زندگی میں بھی حصہ لیتا رہا۔ قائداعظم فوت ہوئے۔ شاہو کو سخت دکھ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ پنجاب میں الیکشن ہوتے شاہو اپنے ساتھیوں کو لے کر سب سے پہلے پولنگ سٹیشن پر گیا۔ اپنی پسند کے امیدوار کو ووٹ دلواتے۔ یہ سب کچھ بھی ہوتا رہا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا کاروبار بھی چلتا رہا ــــ

"شہروں میں سبھی قسم کے شہری رہتے ہیں ــــ" وہ کہتا "اچھے بھی اور بُرے بھی۔ مگر وہ سب شہری ہیں میں بھی شہری ہوں ــــ"

اور پھر وہ دن بھی آپہنچا جب پاکستان کی سرحدوں پر غیر ملکی فوجوں کے اجتماع کی خبر سن کر پاکستانیوں کے چہرے غصہ سے سرخ ہو گئے۔ ملک کا بچہ بچہ کفن باندھ کر لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ملک میں دفاعی انتظامات کئے جانے لگے۔ رہنماؤں نے جلسوں میں تقاریر کیں۔ اہل وطن کو یک صف ہو کر خطرات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کی۔ ہر شہر میں جلوس نکلنے لگے۔ شاہو بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر جلوس میں شامل ہوا۔ اسے جلوس کے آگے باآواز بلند نعرے لگاتے ہوئے دیکھ کر پولیس کا ایک سپاہی جسے حکام نے قیام امن کے لیے متعین کیا تھا ــــ مسکرانے لگا ــــ

"شاہو ـــــ" اس نے مسکرا کر کہا "تم اور یہاں ـــــ"

"کیوں جمعدار جی شاہو استاد کو یہاں دیکھ کر آپ کو دکھ کیوں ہوتا ہے ـــــ"

"دکھ نہیں ہوتا ـــ تعجب ہوتا ہے ـــــ" جمعدار ہنسنے لگا ـــــ"

"وہ کیوں ـــــ ؟"

"یہاں کس کی جیب کاٹو گے شاہو ـــــ"

"شاہو اس جلسے میں چوری کے لیے نہیں آیا جمعدار جی ـــــ سمجھے نا ـــ میرے سینے میں بھی تو دل ہے ـــ" پولیس سپاہی نے بلند بانگ قہقہہ لگایا ـــ شاہو کی آنکھوں میں لہو اتر آیا ـــ مگر وہ چپکا ہو رہا ـــــ

اسی شام ـــ حکام نے اعلان کیا کہ دفاعی انتظامات کے پیشِ نظر شہر میں رات کو بلیک آؤٹ کی مشق کی جائے گی لوگوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد انہیں پُرامن رہنے کی تلقین کی گئی ـــ انہیں بتایا گیا کہ وہ سائرن کے چیخنے پر تمام روشنیاں گل کر دیں۔ اور اس مشق کو کامیاب بنانے کے لیے حکومت کے ساتھ تعاون کریں ـــ

شاہو حقہ ہاتھ میں لیے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ محفل میں اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ دن بھر کے واقعات پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ شاہو حسبِ دستور فلسفیانہ انداز میں اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور کرمو ہنستا ہوا اندر داخل ہوا "استاد ـــــ" اس نے آتے ہی شرفو کے ہاتھ سے حقہ چھین کر ایک لمبا کش لگاتے ہوئے کہا "استاد تم نے سنا ـــــ"

"کیا ہوا ابے ـــــ ہوا کے گھوڑے پر کیوں سوار ہے ـــ" شاہو نے تندرست آنکھ گھمائی ـــ

"آج بلیک آؤٹ ہے ـــــ"

"اچھا ـــــ" شرفو کے چہرے پر روشنی لہرانے لگی ـــــ

"ہاں ـــ منادی ہو رہی ہے ـ اب روز بلیک آؤٹ ہوگا ـــ" کرمو مسرت سے پاگل سا ہوا جا رہا تھا

"تو کیا ہوگا ـــــ" شاہو نے پوچھا ـ اس کی تندرست آنکھ اب بھی گھوم رہی تھی ـــــ

"واہ استاد ـــ میں کہہ رہا کہ بلیک آؤٹ ہوگا ـــ یوں سمجھو کہ پو بارہ ـــــ"

"چپ رہ ابے ـــــ" شاہو نے ڈانٹا ـــــ

"کیوں استاد ـــ ایسے موقعے کب ہاتھ آتے ہیں ـــــ"

"وہ جنگ کے بلیک آؤٹ یاد ہیں نا استاد" شرفو نے کہا "کم کھدا کی کاروباریوں چمک اٹھا تھا جیسے سونے کی کان مل گئی ـــــ"

"جب میں اور اب میں بہت فرک ہے ابے شرفو ـــ" شاہو نے سوچ سوچ کر بات کی ـــــ

"یہ کیا وستاد — بلیک آؤٹ بلیک آؤٹ ہے — فرق کا ہے کا —"

"جب پاکستان نہیں تھا — اب پاکستان ہے — ہم آزاد ہیں — " کمرے پر اکدم خاموشی چھا گئی ۔ لوگوں زبانیں گنگ ہو گئیں ۔ لوگ یوں سنبھل کر بیٹھے جیسے کسی نے کسی بہت ہی مقدس چیز کا ذکر کر دیا ہو ۔ ان کے چہرے بن اور سنجیدہ ہو گئے —

"ستارے —" شاہو نے پھر کہا " جب میں اور اب میں فرق ہے غیر ملک کی فوجیں سرحد پر کھڑی ہیں ۔ الی ت ہم ایسے کام کر کے ۔ اپنے ملک کو کمزور کریں گے ۔ وہ بارفنڈ کی بات یاد ہے نا رے شرفو ۔ انگریز کی سرکار بار فنڈ لیتی ہم بھی اپنی سرکار کو بار فنڈ دیں گے ۔ اور وہ اس طرح کہ جب بلیک آؤٹ ہوگا ہم کچھ نہ کریں گے ۔ ہم بھی تو آخر اسی ـ کے رہنے والے ہیں ۔ ہمیں بھی تو ملک کی خدمت کرنی چاہیئے ۔ اور کچھ نہ ہی تو یہی سہی —"

"سچ کہتے ہو وستاد —" شرفو نے کہا —

"مگر وستاد —" کرمو بولا " یہ بھلا کیا بات ہے ۔ یہی تو موقع ہے —"

"چپ رہ سالے — ہم چور سہی — غدار نہیں — ایسے وقت ایسا کام کرنا چوری نہیں غداری ہے —"

"مگر وستاد میں کہہ رہا —"

"چپ رہ سالے — کان کھول کے سن لے — آج کی رات جو کچھ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا — ستارے تیرے ہی لیے نہیں دوسروں کے لیے بھی ہے — سمجھے — میں نے چوری کی ہے — آج تک کوئی خون نہیں کیا ۔ سا نہ ہو میں تیرا خون کر بیٹھوں —"

"میرا خون اور چوری نہ کرنے کے لیے — یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے وستاد —"

شاگرد پیشہ کے جانے کے بعد شاہو نے بھنگ کا اک اور پیالہ چڑھایا اور اطمینان سے بستر پر لیٹ گیا ۔ آج بلیک ؤٹ تھا ۔ شہر کا شہر اندھیروں میں ملفوف تھا ۔ سڑکیں ویران پڑی تھیں ۔ بازار سنسان تھے ۔ شاہو کچھ دیر چارپائی پر وٹیں لیتا رہا — پھر اس کی آنکھ لگ گئی

صبح صبح سورج نکلنے سے پہلے کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ وہ تندرست آنکھ ملتا ہوا اٹھا —

"کون ہے —" اس نے پوچھا —

"دروازہ کھولو شاہو —" شاہو نے دروازہ کھولا — پولیس کے چند ایک سپاہی اس کے سامنے کھڑے — وہ ان سپاہیوں کو دیکھ کر ششدر سا رہ گیا —

"کیا بات ہے والدگا —" اس نے پوچھا —

"خانہ تلاشی استاد شاہو —" حوالدار نے کہا —

"خانہ تلاشی ---- وہ کیوں ----"

"چوری ہو گئی ہے ---" جیسے کسی نے پوری قوت سے شاہو کے سر پر لٹھ دے مارا ہو۔

"چوری --- کب؟" وہ حیران نگاہوں سے حوالدار کی طرف دیکھنے لگا۔

"رات ---"

"رات --- رات ---" وہ بڑبڑانے لگا "کل رات تو بلیک آوٹ تھا ---"

"تم جیسے لوگوں کے لیے اور مناسب موقع کون سا ہو سکتا ہے شاہو ---"

"سوچ کے بات کرو دارو گا ---- میں نے چوری کی سجا جبر ورپائی ہے --- گدّاری کی کوئی سجا دے تو جانوں۔

حوالدار ہکا بکا سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو ---" اس نے پوچھا "کون سی غدّاری ---"

"تم کھانہ تلاشی کرو دارو گا ---"

خانہ تلاشی ہوئی --- کچھ برآمد نہ ہوا --- شاہو اس دوران میں چارپائی پر چپکا بیٹھا رہا۔ اس کی نگاہیں کمرے کی بھوری دیواروں کو گھورتی رہیں، اس کے ہونٹ حرکت کرتے رہے۔ سینہ معمول سے زیادہ ابھرتا رہا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ غصے میں بھرا بیٹھا ہے

"کیوں دارو گا ---" اس نے پوچھا "کیا ارادے ہیں ---"

"تھانے چلو استاد ---"

"یہاں نہیں مرے دارو گا --- تم چلو تھانے --- اپنے دو سنتری مرے ساتھ بھیج دو --- میں چوری کا مال برآمد کراوں گا ---"

"تم --- تم ---"

"میں بھاگنے کا نہیں دارو گا ---"

"بھاگ کر کہاں جاؤ گے استاد ---"

"یہ کن لو دارو گا --- استاد شاہو چور جرور ہے --- گدّار نہیں ---"

اس نے منہ ہاتھ دھویا --- نیا تہبند باندھا --- نیا کُرتہ پہنا --- نئی پگڑی سر پر رکھی۔ اور سپاہیوں کی آنکھ بچا کر ایک چاقو بھی کُرتے کی جیب میں رکھ لیا --- کچھ دیر بعد وہ دو سپاہیوں کے ساتھ گھر سے نکلا۔

"کدھر استاد ---" ایک نے پوچھا۔ ---

"مرے پیچھے چلے آؤ --- استاد کو سب اڈے معلوم ہیں ---" شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے ہوتے

ہوتے وہ ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک گئے
"یہاں شمو طوائف رہتی ہے — " شاہو نے کہا "کرمو اس پر مرتا ہے —"
"کرمو کون اُستاد —"
"چوروں کے نام کو بٹہ لگانے والا گدّار —"
شاہو نے دروازہ کھٹکھٹایا —
"کون ہے —" اندر سے آواز آئی۔
"اری شمو — میں ہوں — استاد —"
"ابھی آتی ہوں استاد —"
شمو نے دروازہ کھولا — اور دونوں سنتریوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
"استاد —" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا —
"تمہیں کیا فکر شمو — تمہیں اور مل جائیں گے — بتاؤ کرمو کہاں ہے —"
"اندر ہے اُستاد —" وہ سب اندر چلے گئے — کرمو شمو کی چارپائی پر بیٹھا بڑھیا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا — شاہو کو دیکھ کر اس کا جی دھک سے رہ گیا — شاہو کمرے میں داخل ہوا۔
"دستاد تم —" اُس نے کہا۔
"صرف میں ہی نہیں — وہ بھی —" اس نے دونوں سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا جو باہر صحن میں کھڑے تھے کرمو کا رنگ زرد پڑ گیا — وہ تھر تھر کانپنے لگا
"دستاد —" اس نے کچھ کہنے کی جرأت کی۔
"تم نے کل رات چوری کی — بولو کرمو — کل رات چوری کی تم نے —" شاہو گرجا۔
"ہاں دستاد — ہاں دستاد —"
"کہاں ہے مال —"
"یہ رہا دستاد —"
"سب کچھ ہے نا — نکدی — جیور —"
"سب کچھ ہے دستاد —" شاہو نے گٹھڑی اٹھائی اور باہر صحن میں پھینک دی
"تم نے کل رات چوری کیوں کی —"
"میں نے دستاد — میں نے —" کرمو کانپ رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا کہ چوری نہ کرنا۔ یاد ہے نا مرے کرمو — یاد ہے نا — میں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم نے چوری کی تو میں تمہارا کھون کر دوں گا۔ تم نے ہمارے نام کو بٹہ لگایا ہے۔ تم گدار ہو اور جانتے ہو گداروں کی کیا سجا ہوتی ہے —"

"میرا کھون — میرا کھون —" کرمو گھبرایا۔ اس نے بچ کر نکلنے کی کوشش کی۔ شاہو نے کُرتے کی جیب سے چاقو نکال کر کرمو کی گردن میں پیوست کر دیا — کرمو کے منہ سے اک دلدوز چیخ نکلی — وہ چکرا کر گر پڑا —

"دوستاد —"

"مجھے استاد کہتا ہے — گدار —" اس نے کرمو کے منہ پر تھوک دیا۔

سنتری آ پہنچے — انہوں نے دیکھا کہ کرمو تڑپ رہا ہے — اور شاہو شعلہ ریز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے

"گدار کتے —" وہ کہہ رہا تھا "گدار کتے —"

آمنہ ابوالحسن

ایک بوند عطر کی

بے وقوف چاند۔ جہاں جہاں میں جاتی میرے پیچھے پیچھے چلا آتا۔ اونچی اونچی بلڈنگیں پھلانگ کر لمبے لمبے فاصلے الانگ کر لانکہ میں اس سے بچنا چاہتی۔ کیونکہ چندا کا چہرہ مجھے اپنے شفیع کی طرح لگتا اور شفیع مجھ سے دور تھا۔

تو ایسے اداس لمحوں میں جب چاند میری کھڑکی کے مقابل آرکتا تو میں دانستہ اپنی نگاہیں گھما لیتی لیکن اس کی مچلتی ہوئی کرنیں پھر ن میرا دھیان اپنی طرف کھینچ لیتیں جیسا کہ شفیع کی بھی عادت تھی کہ چاہے میں کسی طرف متوجہ کیوں نہ ہوں۔ وہ میری توجہ اپنی طرف ہٹائے بغیر نہیں رہتا تھا۔

چہرے پڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ بچپن میں جب سب بچوں نے سکول میں کتابیں پڑھی ہوں گی میں ہمیشہ چہرے پڑھتی رہی سانی چہرے مجھے ہمیشہ آئینوں کی طرح نظر آئے جن کے مقابل ٹھہر کر میں نے زندگی کا عکس ان میں صاف اور واضح دیکھا اور ہزار ہا ہروں نے کرن کرن مجھ سے باتیں کیں لیکن شفیع کی بات جدا تھی۔

شفیع کو پیچ لڑانے اور موٹر تیز چلانے کا جنون تھا۔ اسی جنون نے مجھے اس سے قریب کیا کیونکہ میں بھی حادثات کی زد میں پہنچ کر ن سے بچنے۔ انہیں شکست دینے کے جنون میں مبتلا تھی۔ چنانچہ ایک روز ٹریفک کے قواعد کی لاپرواہی کئے بغیر ایک دوسرے کو اوورٹیک کرنے کی ضد میں ہم ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ شفیع کے بائیں ہاتھ میں فریکچر آیا اور میری پیشانی بری طرح زخمی لہو لہان ہوئی مگر پھر لسے برے ماتھے کی چوٹ اور مجھے اس کا ٹیڑھا ہاتھ بہت پسند آنے لگا کہ یہ دونوں ہی ہمارے مضبوط ارادے کے مظہر اور ملاقات کا سبب بنے کچھ عرصہ ہسپتال میں رہ کر جب ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تو ایک دوسرے کی شکست کی تمنا میں ہر چیز بھول گئے۔

صلح اور سمجھوتے کا ہم دونوں میں شدید فقدان تھا۔ بس ہم ایک دوسرے کی تاک میں رہتے اور ایک دوسرے پر فتح پانے کے کسی وقع کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دیتے اگر ایک کمزور اور دوسرا طاقتور ہوتا تو شائد یہ جھگڑا نپٹ بھی جاتا۔ مگر چونکہ دونوں ہی مساوی قوت رادی رکھتے تھے لہٰذا یہ چکر چلتا ہی رہا۔ ہم ہمیشہ لڑتے جھگڑتے ہی رہے۔

کچھ عرصے تک یونہی رہنے کے بعد ایک دن شفیع حنا کے ساتھ میرے پاس آیا اور بولا ایک تحفہ لایا ہوں۔ دیکھو تو ذرا۔ اور میرے سامنے اس نے حنا کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے فوراً حنا کا دوسرا ہاتھ تھاما اور اسے اپنی طرف کھینچ کر سینے سے لگاتی ہوئی بولی۔ قابلِ قدر چیز

ہے تمہاری نظر کی داد دیتی ہوں۔ اسی روز میں نے اپنے صحن کے تمام پودوں سے خوبصورت خوشبودار پھول چنے اور انہیں گوندھ کر
کے بالوں میں سجایا حنا اور زیادہ پیاری نظر آنے لگی تو شفیع اسے ایک نظر دیکھ کر بولا۔ بہت بہت شکریہ مگر چند پھول تم بھی اپنے بالو
سجا لو نا۔ ہش۔ میں کیوں سجاؤں۔ پھولوں کی زندگی ہی کتنی؟ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔

شفیع نے چند پھول حنا کے بالوں میں سے نوچ لئے اور انہیں سونگھتے ہوئے کہا جب تمہیں پھول پسند نہیں تو پھر اپنے آنگن میں ا
سارے لگا کیوں رکھے ہیں۔ بے وقوف ہو تم میں کوئی باغبان نہیں۔ کسی اچھے موڈ میں لگا بیٹھے ہوں گے یونہی حنا ہم دونوں کو دیکھ د
مگر ہماری نوک جھونک سن سن کر ہنستی رہی۔

سمجھ سے باہر ہیں آپ لوگ۔ شفیع تو مجھے یہ سمجھا کر لائے تھے کہ مجھے آپ سے جھگڑنا ہے لیکن اب خود ہی جھگڑے جا رہے ہیں۔ ـ
کوئی موقع ہی نہیں دیتے۔

پھر حنا میری چہیتی سہیلی بن گئی اور ہم دونوں مل کر شفیع سے لوہا لینے لگے اس کے بعد شفیع اپنے ایک دوست کے ساتھ آیا او
ایسا خوبرو آدمی دیکھا ہے کبھی تم؟ .... مجھے یقین ہے تم فوراً اسے پسند کرنے لگو گی۔ کیونکہ تمہیں حسن بہت پسند ہے نا۔
سر پھر گیا ہے تمہارا۔ میں بیزاری سے بولی۔ حسن صرف شکل کا نام نہیں۔ اور شکل تو ناسمجھوں کی کمزوری ہوتی ہے یا پھر آرٹسٹوں
نہیں کم سمجھ ہوں نہ آرٹسٹ لہٰذا اپنے دوست کو الٹے قدموں لے جاؤ۔ کیا فائدہ بے چارے کی بے عزتی کروا کے۔

وہ صورت دکھا کے لوٹ گیا اور پھر کچھ دن بعد پھر ان کے حلقے میں آیا۔ خوب چیز ہیں نا؟ ہاں۔ بہت خوب" شریر اور پیار
بالکل تمہاری طرح۔ تب؟ تب کیا۔ ذہین لوگ ہی زندگی ہوا کرتے ہیں۔ بدصورت تھوڑی۔ تو؟ اُفوہ! تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ ان
کا تو تمہیں خوب پتہ ہے جو تمہارے کانوں میں نہیں گھس گئیں لیکن جذبات سے انجان اور ناواقف ہو وہ فقط یہی کہ کوئی تمہیں پسند کرتا
لیکچر ختم کرو۔ چلو پانی میں اپنی کشتیاں ڈال دیں اور دیکھیں کہ کس کی ناؤ تھپیڑوں سے بچ کر کنارے کو جا پکڑتی ہے۔

اور جو کسی کی ناؤ ڈوب گئی تو؟ تو اس کو صبر کرنا چاہیئے۔ صبر بہت اچھا جذبہ ہوتا ہے۔ بہت ہی بڑھیا۔ میں طنز سے مسکرائی
نے گھور کر میری جانب دیکھا۔ چند منٹوں تک دیا سلائی چبا چبا کر تھوکتا رہا۔ پھر جوش سے بولا؟ چلو۔ دیکھیں۔

انہی دنوں اس کا ٹرانسفر ہو گیا۔ وہ دوسرے شہر چلا گیا۔ میں ہنستی رہی، ہنستی رہی۔ لیکن ہنستے ہنستے کبھی میری آنکھوں میں
سارے آنسو جمع ہو جاتے کہ میں انہیں بہا دینے کو بے قرار ہو جاتی۔ مگر مجھے کوئی بہانہ نہ ملتا۔ میری ہر ضرورت اتنی باقاعدگی سے پوری
جاتی کہ مجھے ضد کرنے یا روٹھنے کے لئے (کم از کم گھر میں) کوئی بات ہی نہ ملتی اور یوں رونے دھونے کے تمام جواز خود بخود ختم ہو جاتے
مجھے دیکھ کر کہتی۔ آپ کو تو دوسروں کے چہرے پڑھنے کا شوق و جنون ہے نا مگر کبھی اپنا چہرہ بھی پڑھا ہے۔ آپ نے؟

لیکن اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے مجھے ہول ہوتی ہیں کبھی آئینے کے مقابل نہ جاتی مگر جو آئینہ میری ہستی کے اندر لگا ہوا۔ میری جان
احساس سے متصل تھا اس نے بارہا مجھ سے کہا۔ جھوٹی کب تک خود کو فریب دیتی رہے گی۔ زندگی بڑی مختصر ہے کھیل ختم کر لیکن
شروع کر دینے کے بعد کسی نتیجے کے بغیر یکایک ختم کر دینا کتنا برا لگتا ہے۔

اور دھیرے دھیرے میرے کالے کالے بھونرا لیسے بال رنگ بدلنے لگے۔ میری روشن آنکھیں۔ ماند ماند۔ آبشار کی طرح میری تند فطرت ندی کی طرح دھیمی۔ میں جو ندرتوں کی شائق تھی۔ واقعات کی دلدادہ اپاہجوں کی طرح ایک ہی خیال کو پکڑ کر سانس لینے لگی اور اور وہ خیال تھا اپنے علاج کا۔ شفیع کا۔

جب بھی میرے سر بفلک پہاڑوں کو دیکھتی۔ بلندیوں پر سے ڈھلانوں کو دیکھتی مجھے شفیع یاد آجاتا۔ یہ پہاڑ جو ہمارے ارادوں کی طرح ناقابل تسخیر ہیں۔ اور یہ ڈھلانیں جو ہماری اندرونی کشمکش کی طرح نہ نظر آنے والی۔ انہیں شفیع کے ساتھ مل کر طے کرنے میں کتنا لطف آتا؟ تب مجھے خیال ہوتا کہ انسانی وجود بھی ایک تہہ خانہ ہے جس میں پڑی ہوئی چیزوں میں کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن پر بروقت توجہ نہ کی جائے تو وہ اپنی آپ اپنا ہنر کھو دیتی ہیں کیا حرج ہے اگر ایک بار خود کو سرینڈر کر دیا جائے؟

میں نے تہیہ کر لیا کہ اب جب بھی شفیع لوٹے گا۔ کہہ دوں گی۔ کہ تم جیت گئے شفیع اور میں ہار گئی۔ لیکن مقدر کی بات کہ شفیع لوٹا تو مجھے ناقابل حصول سمجھ کر حنا سے بیاہ طے کر لیا۔ وہ ویسا ہی نہیں بلکہ اور شوخ رہا مگر بیاہ کے بعد اس کی ہنسی میں کانٹوں جیسا نوکیلا پن اور چبھن محسوس ہونے لگی جیسے وہ ہنس نہ رہا ہو۔ زخم بکھیر رہا ہو۔

میں ایسے وقت اکثر سہم جاتی اور مجھے وہ وقت بے اختیار یاد آجاتا ہے جب بیاہ کے روز شفیع اپنی دلہن کو اٹھانے جھکا تو چونکہ میں حنا کو تھامے ہوئے تھی لہٰذا اس نے مجھے بھی اٹھا لیا پھر حنا تو اس کے ہاتھ سے پھسل گئی۔ لیکن میں اس کی باہوں میں جکڑی رہ گئی اس بات پر آس پاس کے لوگ تو ہنس ہنس کر رہ گئے لیکن حنا نے بہت برا مانا اور کافی دھوم مچائی مگر شفیع صرف مسکراتا رہا۔

اس واقعے کے بعد سے حنا۔ میری سہیلی میری دشمن بن گئی۔ شفیع سے اسکا ایک ہی مطالبہ تھا۔ نیلوفر سے نہ ملو۔ شفیع اب یوں بھی کب باقاعدگی سے میرے پاس آرہا تھا؟ مگر جب بھرپور چاندنی راتوں میں صاف شفاف آسمان پر چاند چلتے چلتے کسی ابر پارے کے پاس ٹھہرا ہوا نظر آتا تو مجھے ایسا ہی لگتا جیسے وہ شفیع ہے جو میرے انتظار میں رک گیا ہے اور اگرچہ اس احساس کے ساتھ ہی میرے انتظار میں رک گیا ہے اور اگرچہ اس احساس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں آنسو آجاتے مگر میں مسکرا پڑتی کہ مسکرانے سے بزدل سے بزدل آدمی بھی دلیر وباہمت محسوس ہوتا ہے۔

حنا اب میرے پاس بہت کم آتی اور جب بھی آتی مجھے صلواتیں اور جلی کٹی سنا کر جاتی اس کا خیال تھا کہ وہ خواہ مخواہ پھنس گئی جبکہ شفیع لمحہ بھر کے لئے بھی اس کا نہیں۔ میں نے حنا کو سمجھایا کہ شفیع اس کا ہے لیکن اسے میری باتیں جال کی طرح لگیں جو مچھیرے مچھلیاں پکڑنے سمندر میں پھیلاتے ہیں۔

میں اس کے بھولپن پر حیران رہ گئی۔ اگر میں جال ہوتی تو شفیع اس میں پھنس ہی نہ جاتا؟ خود کو بچا کس طرح لیتا؟ میں تو وہ خالی پنجرا تھا جس میں کوئی بھی پنچھی نہیں تھا میں نے اپنے دروازے خود کھول دیئے کہ قید تو قوت پرواز کو گھٹا دیتی۔ ختم کر دیتی ہے۔ قید بڑی فضول چیز ہے لیکن حنا نے نہیں مانا۔

بھونڈی سی غیر ہم آہنگی کے باوجود شفیع کے گھر بچے ہوتے گئے اس کی آمدنی میں بھی معقول اضافہ ہوتا رہا۔ خوشحالی کی ساری خوشیاں اسے نصیب

ہوئیں ماس کے قبضے بھی لوکیلے ہونے کے باوجود شل رہے مگر وقت نے آخر کار اسے نڈھال کرنا شروع کیا اس کے صندل جیسے جسم کی مہک ہوتی گئی۔ اپنی ہستی کا تمام عطر رفتہ رفتہ کشید کر کے زمانۂ دراز بعد وہ ایک روز اچانک میرے پاس آیا۔

آؤ ان کشتیوں کی خبر لیں جو ہم نے وقت کے گرداب میں اپنی مضبوطی اور مہارت منوانے کے لئے چھوڑ دی تھیں۔ اب جسم کا صندل اگتے خود رو قوں کے کھیت اپنی فصل دے چکے مگر ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارے وجود کی کسی شیشی میں عطر کی وہ ایک بوند باقی بھی ہے یا نہیں جو زمانے حتیٰ کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

میں نے گھور کر شفیع کو دیکھا۔۔۔۔۔ پاگل نہ بنو شفیع ۔ وقت لکڑی کا گھوڑا نہیں جس پر جب چاہو سوار ہو جاؤ۔ کوئی کوئی زندگی عبادت ہوتی ہے۔ عبادت کا چہرا سلامت کرو ۔ پلیز۔۔۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ اٹھا اور چپ چاپ روانہ ہو گیا۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ اٹھا اور چپ چاپ روانہ ہو گیا میں نے اسے جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا کہ اگر اتنے ہی سے میرے ضبط میری عبادت میں خلل پڑ گیا تو۔۔۔۔۔۔؟

شرون کمار ورما

تلاش

وہ کئی دن بعد اپنے کمرے سے نکلا تو گھر کے تمام افراد ایک دم بدل چکے تھے۔ یہ حقیقت تھی یا اس کا وہم۔ بہرحال اسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ سب لوگ یوں چونکے تھے جیسے انہونی ہو گئی ہو۔ اس نے چوکھٹ پہ کھڑے ہو کر خالی آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ کیا وہ اسے ہمیشہ کے لئے کھو چکے تھے، کیا وہ ان کی امید کے خلاف نمودار ہوا ہے۔ کیا اس کا وجود ان لوگوں کے نہ ہونے کے برابر ہے۔۔؟

سب نے اسے حیرت و خوف سے دیکھا۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے، اور آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ گھر پر کوئی سانحہ گزر گیا ہے۔

"تمہیں کہاں جانا ہے؟" باپ نے نرمی سے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" وہ بولا "سب فیصلے تو آپ کرتے ہیں۔"

"جہاں تمہاری مرضی ہو جاؤ۔" ماں نے محبت سے کہا۔ "ہمارے پاس بیٹھو گے؟"

"آپ کے پاس؟ لیکن آپ لوگ تو مجھے پہچانتے ہی نہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو، کون نہیں پہچانتا تمہیں۔ تم۔" وہ جیسے ڈر گئی۔ اسے اپنی بات پر یقین نہ رہا ہو۔

"وہ آج بھی نہیں ملا۔ اور اس کے بغیر میری کوئی پہچان نہیں، میں ادھورا رہ گیا ہوں۔ یہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ وہ مجھ سے کہہ کر بھی تو نہیں گیا۔ بس چپکے سے چلا گیا۔ میں تھانے گیا تھا رپٹ لکھوانے، ان لوگوں نے مجھے گالیاں دیں اور دھکے دے کر باہر سڑک پر پھینک دیا۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجیے، مجھے کیا کرنا چاہیئے۔" وہ باپ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"شیام۔" اس کا باپ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"شیام مجھے نہیں ملتا۔ اس روز آپ لوگوں نے اسے دھتکارا تھا۔ وہ مجھے لیکر نوکری کی تلاش میں کئی جگہوں پر گیا۔ اس کے ساتھ میں تھا۔ کوئی سفارش نہیں تھی، نقد روپیہ نہیں تھا۔ ان لوگوں نے بھی اس کی بات نہیں سنی۔ باہر آ کر اس نے میرے کان میں کہا کہ اسے سخت بھوک لگی تھی، اور وہ بھوک مٹانے کے خیال سے مجھ سے جدا ہو گیا۔ میں دیر تک دھوپ میں کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ سورج میرے اندر گھسا جا رہا تھا اور باہر اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ آتے جاتے لوگ سیاہ دھبوں میں بدل گئے۔ وہ سڑک دونوں طرف جگمگاتی، شاندار کوٹھیاں، آرائشی پیڑ پودے، اور ان کوٹھیوں

میں نے دیکھا کہ وہاں پہلے لوگ سب غائب ہو گئے، ایک سیاہی رہ گئی۔ جب یہ سب کچھ واپس آیا تو میں سڑک کے کنارے پڑا تھا اور لوگ مجھے گھیرے کھڑے تھے۔ ہر شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے نہیں جانتا۔ میں کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ میں نے انہیں بتانا چاہا، لیکن جو میں انہیں بتانا چاہتا تھا وہ تو وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور واپس نہیں آیا تھا۔ اب تک نہیں ملا تھا مجھے اور میں اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، میں جس سے کہتا ہوں وہ ہنسنے لگتا ہے، مجھ پر یقین نہیں کرتا۔ لوگ کیوں مجھ پر یقین نہیں کرتے۔ میں جھوٹ تو نہیں بولتا۔ غلط بیانی تو نہیں کرتا۔"

"شیام، یہ سب تمہارا وہم ہے، بھوک اور دھوپ کی وجہ سے تم بیمار ہو گئے تھے، ٹھیک ہو جاؤ گے،" اس کے باپ نے سمجھایا۔

"دل مت ہارو۔" ماں بولی۔

"ہار جیت میرے لئے ختم ہو چکی ہے۔"

"اس نے بڑا گہرا گڑھا کھودا ہے۔" اس کے چھوٹے بھائی نے باپ کو بتایا۔

باپ نے بے بسی سے کمرے کی طرف دیکھا، کمرے میں اندھیرا تھا اور بیٹے کا اونچا ڈھیر نظر آ رہا تھا اس نے مایوسی سے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ رونے لگی۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں۔ باپ نے بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ایک ڈاکٹر کہتا ہے اسے کام پر لگا دو۔ دوسرا کہتا اس کی شادی کر دو، تیسرا کہتا ہے اسے خوش رکھو۔ جیسے یہ سب کچھ صرف ہمارے بس میں ہو۔

"پہلے مجھے وہ مل جائے جو مجھے اچانک اکیلا چھوڑ گیا ہے۔ وہ گھر سے باہر نکل گیا۔" میں اسے تلاش کرنے جا رہا ہوں وہ دیر تک سڑک پر گھومتا رہا۔ غور سے ہر راہگیر کو دیکھتا، ایک دو کو اس نے چھو کر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ بدک پیچھے ہو گئے۔ اس کا لباس، صورت اور حالت ہی کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر دور ہو جاتے۔

"کیا تم بھی میری طرح خالی ہو۔" اس نے ایک شخص سے پوچھا۔

"بکو نہیں۔" وہ چلا گیا۔

وہ ہنس دیا۔ اس نے سوچا۔ یہ لوگ بھی اس کی طرح شیشے کی دیواروں میں قید ہو کر رہ گئے ہیں اور کسی سے آزادانہ مل یا بات نہیں کر سکتے۔ ان سب کے گرد حصار کھنچے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یا تو اندر سے خالی ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ اسے دکھ تھا کہ ان تھوڑے سے دنوں میں باہر سب کچھ بڑی تیزی سے بدل گیا تھا، ہر شخص ایک سا تھا۔ وہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا شاید یہ سانحہ صرف آدمیوں پر ہی گزرا ہے۔ اس نے ادھر سے توجہ ہٹا کر مکانوں اور دکانوں کو دیکھا۔ سب ایک سے تھے۔ کمال ہے! ایک ہی رنگ کہیں زرد، کہیں گہرا، کہیں ہلکا، سڑک کے کنارے اینٹ کے پنجرے دور تک چلے گئے تھے، جن پر تختیاں لٹک رہی تھیں۔ ناموں کی تختیاں اور ان میں سے لوگ آ جا رہے تھے۔ وہ ایک شخص کو جو شکل سے مدبر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی، روک کر بولا۔

"پچھلے دنوں آپ یہیں تھے یا باہر گئے تھے۔"
اُس شخص نے حیرت سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا:
"آپ کون ہیں؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"
"میرے سوال کا اس سے کوئی تعلق ہے کیا۔؟"
"میرا راستہ چھوڑ دو" وہ اسے دھکیلتا ہوا چلا گیا۔
اس نے وہیں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر سوچا کر وہ غلط نہیں ہے۔ واقعی سب کچھ بدل گیا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی آدمی کو نہ پہچانے۔ ضرور ان چند دنوں میں کچھ ہو گیا ہے۔ وہ کب سے غیر حاضر ہے؟"
اس نے سر اُٹھایا۔ وہ عینک والا شخص چلا جا رہا تھا۔ وہ بھی چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر اُس نے دیکھا کر وہی شخص سامنے چلا آ رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پہلا آدمی جا رہا تھا۔ وہ اُلجھ گیا۔ وہ جا بھی رہا ہے اور آ بھی رہا ہے۔ اُس نے آنے والے کو روک کر اپنا سوال دہرایا۔
"میں تو اس شہر میں اجنبی ہوں۔" وہ شخص معصومیت سے بولا۔
"کمال ہے!" اس نے آہستہ سے کہا۔ کس سے پوچھوں؟"
اجنبی اُسے اُس حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔
وہ کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اس کی نظر ایک مضبوط ڈیل ڈول والے باوردی شخص پر پڑی جو بیدار مستعدی کھڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس شخص نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔
"آپ پہرے پر ہیں؟"
"ہاں۔ کیوں۔!"
"پھر تو آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کب اور کیسے ہوا۔"
"کیا۔ کب اور کیسے ہوا؟"۔
"یہ شہر، یہ لوگ، کیسے بدل گئے۔"؟۔
"بدل گئے! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا۔!"
"آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔"
"جاؤ اپنا کام کرو۔" اس شخص نے ڈانٹ دیا۔
وہ ہٹ کر شوکیس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے شیشہ چھو کر دیکھا، اندر جھانکا اور تھوڑا بلند کیا
"مل گیا، مل گیا۔"
"کیا شور مچاتا ہے۔؟" باوردی شخص گرجا۔
"وہ دیکھو" اس نے شوکیس میں کھڑے، خوبصورت پتلے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ میں ہوں۔ ڈھونڈ لیا۔" وہ

پہریدار سے مخاطب ہوا۔

"میں عرصے سے اسے تلاش کر رہا تھا۔ میں یہاں سے گیا تو پیچھے سب کچھ بدل گیا۔ تم بھی شاید سو گئے تھے۔ خیر اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پہریدار نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا غیر ارادی طور پر اس کی نظر ایک بار پتلے کی طرف بھی گئی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ پہریدار ہے، اس نے حکم دیا۔

"جاؤ یہاں سے۔"

"کون جائے؟" وہ کھڑا رہا۔ "میں اکیلا کیسے جا سکتا ہوں! اسے بھی نکالو۔ اس کے بغیر میں ادھورا ہوں۔"

پہریدار نے اسے بازو سے پکڑ کر سڑک پر دھکیل دیا۔

ایسا کئی بار ہوا تھا۔ سڑک پر وہ منہ اٹھائے چلنے لگا اور سوچنے لگا لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کیا یہ سب ہی ادھورے تو نہیں۔ مکمل ہوں تو سمجھیں۔

راستے میں وہ ایک شکستہ دیوار پر چڑھ گیا۔ اور چاروں طرف دیکھا۔ وہ شہر سے دور نکل آیا تھا۔ ہر طرف تیز دھوپ تھی اور بخار میں اسے یاد آیا پہلے یہاں باغات ہوا کرتے تھے، ٹھنڈے سائے اور خوشگوار ہوا کی سرگوشیاں، لوگ لکڑیاں کاٹ کر لے گئے اور سب کچھ اجڑ گیا۔

وہ دیوار سے اتر آیا اور درختوں کی قوس کی طرف چلنے لگا جو بہت دور تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دریا کے کنارے پہنچ گیا جہاں سورج ڈوب رہا تھا۔ اسے دکھ ہوا۔ اب اندھیرے میں وہ کیا کرے گا۔ وہ لوٹ آیا۔ واپسی میں اسے وہ لڑکی ملی جو بار بار اس کو ذہن نشین کرانا چاہتی تھی کہ وہ بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور کہ وہ اس کے سامنے والے مکان میں رہتی ہے، اور کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس پر وہ ہنسا۔

"کیسی عجیب بات ہے لوگ اب بھی محبت کرتے ہیں"

وہ رونے لگی۔

"رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم بھی شیام کو ڈھونڈ رہی ہو، میں بھی اس کی تلاش میں ہوں، اس کے پرے ہی کچھ ہو سکے گا۔"

وہ اداس ہو گئی۔ وہ اسے چھوڑ کر گھر آ گیا اور اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔

کئی دن تک وہ باہر نہیں آیا۔ گھر والوں نے جب کوئی آواز بھی نہیں سنی تو دروازہ توڑ دیا۔

وہ کمرے میں نہیں تھا۔ اس گہرے گڑھے میں پڑا تھا جو اس نے کھودا تھا۔

سب نے اس کا نام لے کر پکارا، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

"اسے نکالو" ماں نے پریشانی سے کہا۔

لیکن کوئی گڑھے میں جانے کو تیار نہیں تھا۔

رشید امجد

کہانی

رات شہر کے گرد اگرد کنڈل مار کے بیٹھی ہوئی ہے
اور شہر جو کبھی تھا
(اب خیال آتا ہے کہ شاید کبھی بھی نہیں تھا)
اندھیرے میں بتاشے کی طرح گھل رہا ہے۔
اور یہ کہانی برسوں پرانی ہے۔
وہ چادر کا کونہ ہٹا کر سر اندر کرتا ہے۔
" چادر کے نیچے ہی میں تمہارے ساتھ موجود ہوں۔
سرسراہٹیں سارے کمرے میں گونجنے لگتی ہیں۔
میں میز سے کتاب اٹھاتا ہوں۔
سارے لفظ بے معنی ہو چکے ہیں۔ کتاب میں لکھا ہے انسان نے صدیوں کی مسافت طے کر کے جدید دور میں رکھا۔ غلامی کا دور ختم ہوا۔
سرسراہٹیں
سرسراہٹیں میرے گھر کی دیواروں پہ دستک دیتی ہیں
" میں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام حاضر ہوں"
وہ میرے لکھنے کی میز پہ بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کی لمبی سُرخ زبان اس کے جبڑوں سے باہر لٹک رہی ہے۔
کتاب میں لکھا ہے
کتاب میں سب بکواس لکھا ہے، جھوٹ
" میں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام حاضر ہوں"

نکڑوں اور گلیوں میں کتے تازہ خون کی مہک سونگھتے پھر رہے ہیں۔
کنٹرول روم میں بیٹھا وہ ایک بٹن آف کرتا ہے۔
چاروں طرف گونجتی آوازیں اور تصویریں اپنی شناخت کھو دیتی ہیں۔
وہ ہنستا ہے — ہنستا ہی چلا جاتا ہے۔
صرف ایک بٹن آف کرنے کا وقفہ۔
وہ دوسرا بٹن آن کرتا ہے۔
ایک لمحہ میں چاروں طرف نئی آوازیں، نئی تصویریں، ایک ہی پل میں پرانی تصویر کی جگہ نئی تصویر۔
ایک بٹن آف، دوسرا آن، ایک لمحہ کا وقفہ (سارے منظر تبدیل)
وہ بڑے چوک میں آتا ہے، ہجوم کو دیکھتا، پوچھتا ہے۔ "یہ کون ہیں"
"لوگ جناب۔"
"یہ لوگ ہیں۔" وہ ہنستا ہے۔ "اچھا تو یہ لوگ ہیں"
مینار پر لگی گھڑی وقت کے گزرنے کا اعلان کرتی ہے — لمحہ بہ لمحہ۔ لمحہ بہ لمحہ
"یہ کیا ہے ؟"
"گھڑی جناب۔ وقت بتاتی ہے۔"
"لیکن ہمیں تو وقت کی کوئی ضرورت نہیں، اسے بند کرو۔ اور کیلنڈر کو پیچھے لے جاؤ۔"
زمین پیاس سے ہانپ رہی ہے، بہتر آدمی سینہ تانے دیوار بنے میدان میں ڈٹے ہیں۔
وہ غراتا ہے۔ نیزے پر ٹنگے ہوئے سر کو دیکھ کر غراتا، پنجے مارتا، ہوا میں سونگھتا ہے
عورت برف سے سر اوپر اٹھاتی ہے: "اب اجازت ہے بیٹے کی لاش سولی سے اتار لوں۔"
وہ پھر غراتا، پنجے مارتا، ہوا میں سونگھتا ہے۔
میری بیوی چائے کی پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہتی ہے۔ معلوم نہیں چائے کی پیالی میں چمچ سے ساتھ چینی ہلانے کی اجازت ہے یا نہیں۔
میں سر ہلاتا ہوں۔ معلوم نہیں۔
میری بیٹی کہتی ہے۔ ابو آپ کو تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ میری کتاب میں لکھا ہے انسان عظیم ہے۔ وہ چاند پر پہنچ گیا ہے
"تم نے اس زمانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں پڑھا، بوڑھا چچا برف ہونٹوں اٹھاتا ہے۔" جنگ کے زمانے میں

،جب شہر میں داخل ہوتا تو خوف سڑکوں پر کنڈلی مار کے بیٹھ جاتا۔ وہ سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کو گریبانوں
پڑ پکڑ کر ٹھڈے مار مار کر پوچھتے ۔"کون ہو تم؟"
"کون ہو تم"
"میں ۔ میں"
بوڑھا چچا سر اٹھاتا۔" دشمن کے سپاہی گھروں میں گھس جاتے اور عورتوں کو ۔ لڑکیوں کو۔"
میری پیٹھ پر ٹکور کرتی بیوی اچھل کر بیٹی کو گود میں اٹھا لیتی ہے۔
" دروازہ تو بند ہے نا"
" بند ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"
رات دبے پاؤں چلتی آپ ہی آپ مسکراتی ہے۔
اندر ہی اندر کھلکھلاتی ہے
میری بیٹی سبق یاد کرتی ہے۔ انسان بڑا عظیم ہے۔ انسان بڑا عظیم ہے۔ انسان۔
میں خواب دیکھتا ہوں کہ خوبصورت باغ ہے۔ چاروں طرف پھول کھلے ہیں۔ پھل شاخوں سے جھول رہے ہیں۔
رسے چہچہا رہے ہیں۔
میری بیوی کہتی ہے۔" کتنی اچھی خوشبو ہے"
" امی پھول کتنے پیارے ہیں۔" میری بیٹی چہکتی ہے، مگر اس کی آواز تیز شور میں ڈوب جاتی ہے سوروں کا
،گروہ شور مچاتا، دندناتا، باغ کی دیواروں کو توڑتا، روشوں، کیاریوں اور پودوں کو روندتا چاروں طرف
پھیل جاتا ہے۔
میری بیٹی ۔ میری بچی۔ میں اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ درد کی ٹیس ۔ خون کا فوارہ۔
ایک لمبی چیخ۔
"کیا ہوا۔" سامنے والے پلنگ پر سوتی بیوی اور بیٹی ہڑبڑا کر جاگ اٹھتی ہیں۔ کیا ہوا۔
"کچھ نہیں۔ شاید خواب تھا۔ شاید
مست بپھرے ہوئے سوّر شور مچاتے گلیوں اور بازاروں میں دوڑ رہے ہیں، ٹکریں مار رہے ہیں، ڈکار رہے ہیں
اور نفرت شہر کے گرداگرد کنڈلی مار کے بیٹھی ہوئی ہے اور شہر جو کبھی تھا اب خیال آتا ہے کہ شاید کبھی بھی نہیں تھا)
اندھیرے میں بتاشے کی طرح گھل رہا ہے، گھل رہا ہے، گھل رہا ہے۔

محمد منشا یاد

کیلنڈر

اس کے اندر اتنے زور کا بادل گرجتا ہے کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور بار بار بجلی کوندتی ہے۔ تپائی سے گھڑی اٹھا کر اس کی اندھیرے میں چمکتی ہوئی سوئیاں دیکھتا ہے۔ نصف رات بیت چکی ہے مگر نئے دن کا سورج طلوع ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے۔ ہر سو گھپ اندھیرا ہے۔ جب بجلی کوندتی ہے تو لحظہ بھر کے لیے درخت، بجلی کے کھمبے اور صحن کی دیواریں روشن ہو جاتی ہیں مگر پھر پلک جھپکتے ہی تاریکی میں ڈوب جاتی ہیں۔ کھڑکی سے ٹھنڈی اور بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔ وہ دوبارہ سو جانا چاہتا ہے مگر کسی انجانے دکھ کا احساس اسے پریشان اور بدمزہ کر دیتا ہے۔ وہ ذہن پر زور دیتا ہے کہ اس دکھ کی نوعیت یاد آ جائے جس نے آنکھ کھلتے ہی اسے دبوچ لیا ہے مگر اسے بالکل یاد نہیں آتا۔

کچھ عرصہ سے بھول جانے کا مرض کافی بڑھ گیا ہے اس نے کئی بار سوچا ہے کہ کسی ماہر معالج سے رجوع کرے مگر ہر بار وہ بھول جاتا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ اب اسے معالج سے مشورہ کرنے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے بلکہ کل ہی مشورہ کرنا چاہیے وہ آنے والا دن اور تاریخ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ گھڑی سے دن اور تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اندھیرے کی طرف دیکھتا ہے اندھیرے کی وجہ سے کیلنڈر بھی صاف پڑھا نہیں جاتا۔ اٹھ کر بتی جلاتا ہے مگر بتی نہیں جلتی۔ اسے یاد آتا ہے کہ جب بھی تیز بارش ہوتی ہے بجلی چلی جاتی ہے وہ ماچس جلا کر کیلنڈر پڑھتا ہے اسے تاریخ یاد آ جاتی ہے مگر وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ اس تاریخ کے گرد پہلے سے دائرہ بنا ہوا ہے۔ ذہن پر بہت زور دیتا ہے کہ اس نے کب اور کیوں یہ دائرہ لگایا مگر اسے بالکل یاد نہیں آتا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس تاریخ کی کیا اہمیت ہے پتہ نہیں اگلے روز سوئی گیس، بجلی یا ٹیلی فون کا بل جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے یا کسی لائسنس کی تجدید کرانے کی۔ اسے کسی سفر پر روانہ ہونا ہے یا کسی مقدمے کی پیروی کرنی ہے۔ کیا پتہ کسی مہمان کے آنے کا دن ہو، یا شہر میں کوئی اہم تقریب ہو رہی ہو؟ مگر اس سے پہلے اس نے کبھی کسی تاریخ کے گرد دائرہ نہیں لگایا تھا یقیناً یہ کوئی نہایت ہی اہم بات تھی مگر کیا؟ اسے کچھ یاد نہیں آتا۔

وہ اٹھ کر سگریٹ سلگاتا ہے اور لمبے لمبے کش لے کر کھانسنے اور سوچنے لگتا ہے۔

یہ اس کا برتھ ڈے بھی نہیں ہے۔ کسی بچے کی تاریخ پیدائش ہے نہ کسی رشتہ دار کی برسی۔ اسے یاد آتا ہے کہ رات جب وہ سونے لگا تھا تو اس کی نگاہ ہر روز کی طرح کیلنڈر پر پڑی تھی اور کیلنڈر پر یہ دائرہ بالکل موجود نہیں تھا۔ اس کی ساری توجہ اسی ایک نکتے پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ یہ دائرہ کب، کیوں اور کس نے لگایا؟ اگر یہ دائرہ اس نے خود لگایا ہوتا اور وہ کام جو اسے اس تاریخ کو سرانجام دینا تھا ضرور یاد آتا رہتا۔ لیکن اگر یہ دائرہ رات سونے سے پہلے کیلنڈر پر موجود نہیں تھا تو پھر کہاں سے آگیا؟ گھر کے سب لوگ پہاڑ پر گئے ہوئے تھے اور گھر میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پھر دروازہ بند تھا۔ اور اگر دروازہ بند نہ بھی ہوتا تو کیا کوئی اس کے کمرے میں محض تاریخ کے گرد دائرہ لگانے کے لیے گھس آتا؟ اور کیوں؟

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ کہیں اس نے سوتے میں اٹھ کر خود ہی یہ حرکت نہ کی ہو مگر اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی اسے نیند میں چلنے کی عادت ہے پھر یہ دائرہ؟ اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہو اس خواب کا تعلق اس تاریخ سے ہو۔ اسے خواب بہت آتے تھے مگر اکثر بھول جاتے تھے۔ دن کو چلتے پھرتے دفتر یا گھر کا کام کرتے ہوئے خواب سے مماثل کوئی صورت حال یا خواب میں دیکھا ہوا کوئی شخص مل جاتا تو لمحہ بھر کے لیے اسے خواب کا متعلقہ حصہ یاد آجاتا پھر فوراً ہی ذہن سے اتر جاتا۔ وہ خواب یاد کرنے لگتا ہے مگر اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ وہ بچپن سے لے کر اب تک اپنے ماضی کے سارے اہم واقعات اور حادثات کو ذہن میں لا کر تجزیہ کرتا ہے شاید اسے کسی ایسی بات کا سراغ مل جائے جس کا تعلق اس تاریخ سے ہو مگر اسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اسے نیند میں چلنے کی بیماری لگ گئی ہے اور اس نے خود ہی نیند میں اٹھ کر کیلنڈر پر دائرہ لگایا ہے ——

وہ اپنے شک کی تصدیق کے لیے دوبارہ دیا سلائی جلا کر کیلنڈر کے قریب آتا ہے اور یہ جان کر ششدر رہ جاتا ہے کہ جس رنگ کی سیاہی سے وہ دائرہ لگا ہوا ہے اس رنگ کی سیاہی اس کے قلم میں نہیں ہے۔ پھر یہ دائرہ کب کیوں اور کس نے لگایا اس کی حیرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سر کو ہاتھوں سے تھام کر بستر پر دراز ہو جاتا اور سوچنے لگتا ہے۔

وہ حیرت سے کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔

یہ وہ کمرہ نہیں ہے جہاں وہ رات کو سویا تھا اور جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے تک موجود تھا لیکن کمرہ جانا پہچانا ہے اسے اس مانوسیت کی ایسی خوشبو آتی ہے جیسی اپنے جسم کے پسینے سے آیا کرتی ہے۔ اچانک وہ چونک پڑتا ہے یہ تو وہی کمرہ ہے جہاں برسوں پہلے وہ اسے چھوڑ کر چپکے سے چلا آیا تھا۔ وہ حیرت سے چیزوں کو دیکھتا ہے سب کچھ ویسا ہی ہے کھڑکیوں کے پردے —— فرنیچر —— گدیوں کے غلاف —— میز پوش —— ٹیبل لیمپ —— ریڈیو —— گلدان میں وہی پھول سجے ہیں جو دونوں نے اس شام فلم دیکھ کر لوٹتے ہوئے خریدے تھے۔ وہ ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھتا ہے گیلے جوتوں کے نشانات بتاتے ہیں کہ وہ ابھی ابھی بارش میں بھیگتا اس کمرے میں داخل ہوا ہے۔ دیوار پر کیلنڈر موجود ہے، مگر اس کا ڈیزائن اور سائز اس کیلنڈر سے مختلف ہے جو تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنے اس کمرے کی دیوار پر دیکھا تھا جہاں وہ برسوں سے رہتا، سوتا جاگتا اور زندگی گزارتا ہے۔ وہ کیلنڈر کو غور سے دیکھتا ہے اور دنگ رہ جاتا ہے بوسیدگی سے

نا آشنا۔ وہ تیس برس پہلے کا کیلنڈر ہے مگر اسی تاریخ کے گرد اسی رنگ کی سیاہی سے دائرہ بنا ہوا ہے جیسا اس کے اپنے کمرے کے کیلنڈر پر دیکھا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ وہ اپنے اسی کمرے میں جہاں وہ برسوں سے زندگی گزار رہا ہے سو گیا پڑا ہو اور یہ سب کچھ خواب کی حالت میں دیکھ اور محسوس کر رہا ہو۔ کیا پتہ تیس برس بعد اس کے اندر یاد دل پادل اتنے زور سے گرجا ہو کہ اس کی آنکھ برسوں پہلے کے زمانے میں جا کھلی ہو۔ مگر وہ کہاں ہے؟ اس کے دل پر اسے دیکھنے کی خواہش نشتر چبھونے لگتی ہے۔ اسی لمحے غسل خانے کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ بالکل وہی برسوں پہلے کا لباس پہنے اور وہی تولیہ سر پر لپیٹے باہر آتی ہے اور اس کی طرف دیکھے بغیر سنگھار میز کے سامنے بیٹھ جاتی اور کنگھی کرنے لگتی ہے۔ وہ حیران رہ جاتا ہے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا وہ بالکل ویسی ہی ہے تروتازہ اور جوان۔ لگتا ہے اس کی عمر میں ایک دن کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے:

"کون؟"

اس کی آواز میں وہی زرخیزی اور ترنم ہے

"میں ہوں" وہ جواب دیتا ہے "تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھتی ہے

"کون ہیں آپ؟"

"میں ــــ میں ہوں" وہ پریشان ہو جاتا ہے۔

اور جس طرح ہوا تھم جائے تو پانی کی سطح پر تیرتی موجیں چت لیٹ جاتی ہیں اس کی پیشانی پر پڑے ہوئے ہموار ہو جاتے ہیں اور وہ حیرت اور خوشی سے چیخ پڑنے کے انداز میں پوچھتی ہے۔

"ارے آپ؟"

"ہاں میں" وہ کہتا ہے "میں شرمندہ ہوں۔ یقین جانو۔ میں زندگی بھر پشیمان رہا" وہ اداس ہو جاتی ہے لگتا ہے جذبات پر قابو پانے کے لیے تگ و دو کر رہی ہے اسے اس کے اندر ٹپ ٹپ آنسو گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے مگر اس سے پہلے کہ ضبط کی برسوں لمبی سکی کا گونہ ادھڑنا شروع ہو جائے وہ اپنے مخصوص دلربا انداز کی چادر پھر سے اوڑھ لیتی ہے اور کہتی ہے

"یہ آپ نے بڑھاپے کا سوانگ کیوں بھرا ہے؟"

"یہ سوانگ نہیں حقیقت ہے"

"شاید تیس برس بعد آپ ایسے ہی نظر آئیں گے"

"نظر آؤں گا نہیں" وہ کہتا ہے "تیس برس بعد ایسا نظر آ رہا ہوں"

"بھئی کیا مذاق ہے ـــــ ہٹائیے ـــــ میرا دل خراب ہوتا ہے"

"یہ مذاق نہیں ہے۔ میں تیس برس کی ازدواجی زندگی گزار کر آ رہا ہوں"

"وہ کیسے؟" وہ حیرت سے پوچھتی ہے "کس کے ساتھ؟"

" تمھیں تم جانتی تو ہو ــــ وہی تمہاری کولیگ ۔ چودھری علی محمد کی بیٹی سے میری شادی ہو گئی تھی ــ اس سے میرے بہت سے مسائل حل ہو گئے تھے ۔ صرف ایک مسئلہ " " آپ پھر مذاق کرنے لگے " وہ اس کی بات کاٹ کر کہتی ہے " ایسا نہیں ہو سکتا " " ایسا ہوا ــــ اس سے میرے بہت سے بچے ہیں اور تمہاری شادی بھی تو ہو گئی تھی ؟ "

" میری شادی ؟ "

" ہاں ــ میں نے سنا ہے کہ تمہارے بچے بہت ہونہار ہیں اور تمہاری بیٹی کی شکل تم سے بے حد ملتی ہے "۔
وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے ، ہنسے چلی جاتی ہے اس کی ہنسی کی آواز ویسی ہی خوبصورت اور دلکش ہے جیسی ہوا کرتی تھی ہنسی کا دورہ تھمتا ہے تو وہ سنجیدہ ہو کر پوچھتی ہے " مجھے سب معلوم ہے "

" کیا معلوم ہے ؟ "

" یہی کہ آپ مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں "

" کیا مطلب "

" مطلب یہ کہ آپ کے کیلنڈر سے ایک تاریخ چوری ہو گئی ہے اور آپ یہ جانتے ہوتے بھی کہ میرا اس تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ۔ آپ اس کی گمشدگی میں مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں "

" یہ تم کیا کہہ رہی ہو ــــ تاریخ کیسے چوری ہو سکتی ہے "

" آپ سب جانتے ہیں مگر آپ تلخ حقائق کا سامنا کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں آپ نے میرے ساتھ بھی یہی کچھ کیا تھا اور اب تاریخ کے سلسلے میں بھی آپ جان بوجھ کر سائیڈ ٹریک کر رہے ہیں "

" کیا تم مجھ سے بہت ناراض ہو "

اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ۔ وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے کھڑکی سے بارش کی بوچھاڑ اندر آ رہی ہے ۔ وہ اٹھ کر کھڑکی بند کرتا اور بتی جلا کر پہلے گھڑی دیکھتا اور پھر کیلنڈر پڑھتا ہے اور یہ جان کر کہ وہ تاریخ جس کے گرد کیلنڈر پر دائرہ لگا ہوا تھا ، آئے بغیر گزر چکی ہے ۔ وہ سر پکڑ کر رہ جاتا ہے ۔

مرزا حامد بیگ

پارس

ٹیگور نے لکھا؛
کشتی نے اشنان گھاٹ کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں کے قریب لنگر ڈالا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ملاح تختۂ کشتی پر ہی نماز مغرب ادا کرنے لگا۔ ہر رکوع و سجود کے بعد اس کی سیاہ شبیہ شفق آلود آسمان کے پیچھے زیرِ آب کھنچ جاتی۔

لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ ہر طرف ہاہاکار مچی تھی۔
اور وہ بوڑھا، تنہا تھا۔ اور بس یونہی اس طرف نکل آیا تھا جیسے کوئی بھی اپنی زندگی میں بغیر کسی مقصد کے کسی بھی سمت نکل جائے۔

سوکھا چمڑا، جلی اور چھنی ہوئی چمڑی میں ہڈیوں کی محض ایک مٹھی، بوڑھا۔
پر ہر طرف ہاہاکار مچ گئی تھی۔
اور اُس سے تو خود اپنا آپ سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ ہر ہر قدم پر ٹھوکر کھاتا، کنکر پتھروں میں دھول مٹی، ہنستا، پیادہ پا یہاں اس جگہ تک آیا تھا۔

پر جانے کہاں کدھر سے تھا۔
اس کی کمر کمان تھی اور اس کا ایک اکڑا ہوا بازو اس کے گھٹنے پر سہارا۔ دوسرا ہاتھ کنکر پتھروں کی اُٹھا پٹخ میں خود اس کی ذات کو بھولا ہوا۔

وہ اپنے آپ میں گمن، ہر طرف ٹٹولتا، نہایت احتیاط سے زمین پر ہر طرف بکھرے پتھروں میں سے ہر ایک کو اُٹھا کر پہلے اپنے گلے میں لٹکتی دھول مٹی میں اٹی زنجیر تک لاتا۔ ایک لحظہ مسل کر دوسرے پتھر کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا۔ بس ایسے ہی آگے، آگے اس طرف بڑھتا چلا آیا تھا۔

پر جانے کہاں کدھر سے تھا۔
ماٹا کہ وہ ہڈیوں کی مٹھی، خود اپنے گلے میں زنجیر کئے، ہر جا بکھرے ہوئے پتھروں کو سمیٹتا، اُٹھاتا، پٹختا یہاں تک چلا آیا

پر وہ آیا کدھر سے تھا۔ کسی کو معلوم نہیں۔

(۲)

خزاں کے دنوں میں وہ یقیناً سب سے اُداس دن تھا۔ سب پھٹے ہوئے بادبان اور ٹوٹے ہوئے مستول کو سنبھالے ایک مٹے ہوئے نقش و نگار والی بڑی سی کشتی دور سمندر کی وسعتوں سے یکایک نمودار ہوئی اور ایک پُرشور پانی کے ریلے کی اُٹھتی ہوئی، کنارے سے کچھ ہی پرے ریت میں گڑ گئی۔

اُس سمے میرے ننگے پیروں تلے نیم گرم، کند نوکوں والے سنگ ریزے ہانپ رہے تھے اور میں نیند کے خمار میں یونہی گھومتے گھماتے سمندر کی طرف نکل آیا تھا۔

اور خزاں کے دنوں میں وہ یقیناً سب سے اُداس دن تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس بوڑھے نے مٹے ہوئے نقش و نگار کے بھاری تختوں سے نیچے کمر تک جھک کر کھارے کھاری پانی میں زقند بھری ہے۔

پہلی نظر میں تو مجھے یوں لگا جیسے اُس کے انگ انگ میں بجلیاں بھری ہیں۔ لیکن پھر وہ رفتہ رفتہ جیسا تھا ویسا نکلا اس نے چکر کھاتے ہوئے پانی میں دوسرا قدم عجب انداز سے اُٹھایا تھا۔ دور سے دیکھنے پر مجھے یوں لگا جیسے پانی میں غوطے کھانے کو ہے۔ لیکن وہ کشتی کے ٹوٹے ہوئے مستول کی طرح ہر طرف جھولتا آگے ہی بڑھتا چلا آیا تھا۔

یہاں تک کہ نرم ریت گزار کر وہ ہانپتے ہوئے سنگریزوں تک آیا۔

اس کی کمر دوہری ہو کر کمان ہو رہی تھی۔ اور اس کا ایک اکڑا ہوا بازو اس کے گھٹنے پر سہارا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے ادھر ہر طرف بکھرے ہوئے کنکر پتھر سمیٹتا، ایک کے بعد ایک، اُٹھا کر اپنے گلے میں لٹکتی زنجیر تک لاتا، اس سے چھواتا اور پھینک دیتا۔ وہ اپنے آپ میں بہت معروف تھا۔

تب میں نے آگے بڑھ کر اس سوکھے چمڑے منڈھی ہڈیوں کے پنجر کو سہارا دیا ہے۔ محض اس لئے کہ خنک ساحلی تیز ہوا سیٹیاں مارتی اُس کے آر پار گزر رہی تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اُس نے مجھ سے صرف اتنا کہا ہے:

"مجھ پر ترس کھاؤ اور چھوڑ دو۔ مجھے پارس پتھر کی تلاش ہے۔ حیران مت ہو۔ میں نے خود اپنے آپ کو زنجیر کیا۔ دیکھو میں صدیوں کا سفر کر کے یہاں تک آیا ہوں۔ اُس طرف کا سارا علاقہ میں نے چھان مارا۔"

وہ ایک کے بعد ایک پتھر اُٹھاتا۔ اپنے گلے میں لٹکتی زنجیر تک لاتا اور اس سے چھوا کر پھینک دیتا۔

"مجھے یقین ہے بیٹا ان آگتا دینے والی دھوپوں میں سے ایک پہر یہ زنجیر پارس سے چھو کر سونا ہو جائیگی۔"

میں نے اتنا سنا تھا اور چیخ اُٹھا تھا۔

"بابا۔ نظر کرو۔ تمہارے گلے میں لوہے کی نہیں، سونے کی زنجیر ہے۔"
وہ سنگریزے سمیٹنے میں جٹا ہوا تھا
جب میرا کہا اسے سمجھ میں آیا ہے تو اس نے تڑپ کر گلے کی زنجیر اتار لی اور اسے اپنی سفید پڑتی ہوئی آنکھوں کے قریب لاتے ہوئے ڈوبتی آواز میں بولا۔
"یقیناً خالص سونا۔ لیکن اے میرے خدا، میں پارس کہاں چھوڑ آیا۔"
اس نے دو ہتھڑ مار مار کر چہرہ لہولہان کر لیا اور پیچھے کی طرف بھاگا۔
وہ ریت میں گڑی ہوئی کشتی کو کھینچنے کے قابل نہیں تھا اور کشتی کے پھٹے ہوئے بادبان اور ٹوٹا ہوا مستول۔
میں نے اسے کشتی کے جوڑے تختوں تک پہنچتے ہوئے خود دیکھا ہے۔
میں یقیناً مایوس ہو کر یا انتہا کے جوش میں پیادہ پا ہی سمندر کی وسعتوں میں نکل گیا۔
اب جبکہ پوری آبادی سمندر کے تند ریلے کی طرح ہر طرف سے اُمڈ آئی ہے۔
روتے کرلاتے بچے اور ان کے آگے آگے،
ایک دوسرے کو دھکیلتے، پچھاڑتے، بانکے نوجوان۔
ننگے سر واویلا کرتی عورتیں۔
ہانپتے بوڑھے۔ اشنان گھاٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے۔
سب اس کی تلاش میں ہیں۔ البتہ اس جیسی مایوسی میں اور انتہا کے جوش میں پیادہ پا ہی آگے نکل جانے کی بجائے سب اس مٹتے ہوئے رنگوں والی کشتی کو گھیرے ہوئے ہیں۔
جانے وہ آیا کدھر سے تھا۔ جانے ——
اس شور میں چاروں اطراف کی سسکی ہوئی ہوا کشتی کے تختوں سے پرے ٹھٹک گئی ہے۔
اندر کشتی میں وہ ہر جگہ بکھرا ہوا ہے۔ درشت لکڑی کی کرسی پر جھولتے ہوئے بادبان میں اس کا خون آلود چہرہ، کشتی کے ہچکولوں سے نیچے اوپر تلے رکھے تختوں پر الٹے ہوئے نایاب قلمی نسخے اور ان کے پیچھے سے سر اٹھاتے بے معنی سوالات کے دستے، لیکن پانی سے نم ایک تختے کے نیچے پڑی جرابوں میں اس کے گلے ہوئے پاؤں اور ایک تختے کے نیچے چیکٹ بستر، چیتھڑوں کا غلاف، میلی تھیلیاں جن میں سے اس کی آپس میں الجھی پسلیوں کے چٹخنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔
فرش پہ اس کے بدحال بوٹوں کے تلووں پر لگے ہوئے تمباکو کے ساتھ اس کی آنکھیں اور ریت کے ذرے ایک دوسرے میں گُم
اور وہ جو یقیناً مایوس ہو کر یا انتہا کے جوش میں پیادہ پا ہی سمندر کی وسعتوں میں نکل گیا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں۔

جمیل زبیری

عکس در عکس

آپا جی سے ہمارا رشتہ ہوا کی لہروں کے ذریعے قائم ہوا۔ ان کا نام تو زبیدہ تھا مگر وہ جگت آپا جی تھیں۔ اُن کے گھر والے، عزیز و اقارب، محلے والے، ملنے جلنے والے، غرض ہر شخص انہیں آپا جی ہی پکارتا تھا۔

وہ ریڈیو سننے کی بڑی دلدادہ تھیں اور ہر ہفتے بڑی باقاعدگی سے خطوط لکھا کرتی تھیں، جن میں پروگراموں پر تبصرے، تنقید، ناراضگی، پیش کرنے والوں سے شکایات، محبت اور خلوص سبھی کچھ ہوتا تھا۔ اور سب سے زیادہ ہم لوگوں سے ملنے کی خواہش۔ وہ ہمیشہ لکھتیں، جمیل کونسا دور ہے۔ بچو کسی روز آ کر مجھ سے ملو، ایک وقت کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ ہمارے لئے بھی وہ بڑی محترم تھیں۔ ہم سب ہی ان کا تذکرہ بڑی دلچسپی اور عقیدت سے کیا کرتے تھے اور ان کے خطوط کے جواب ریڈیائی لہروں کے ذریعے ان تک پہنچانا اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔

وہ فون کرتی رہیں، خط لکھتی رہیں، ہم نہ جانے کے بہانے بناتے رہے۔ آخر ایک روز مجبور ہو کر ہم ایک چھوٹے سے قافلے کی صورت میں ان سے ملنے روانہ ہو گئے۔ میں راستے بھر سوچتا رہا کیسی محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ کیا اس دُنیا میں اب بھی تھوڑا بہت خلوص باقی ہے۔

میں نے سُنا تھا وہ بہت پیسے والی ہیں۔ ان کے کارخانے ہیں جن کی دیکھ بھال ان کے بھائی کرتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی بڑے سے بنگلے میں رہتی ہوں گی جہاں کا چوکیدار ہمارا خیر مقدم کرے گا۔ مگر میری توقع کے بالکل برعکس جب ہم ان کے گھر کے سامنے کار سے اُترے تو اندازہ ہوا کہ وہ ایک پُرانی وضع کا بنا ہوا مکان تھا جس کے باہر چھوٹا سا ایک چبوترہ تھا۔ سامنے ایک دالان اور اس کے پیچھے ایک کمرہ۔ میں سوچنے لگا یا اللہ اس مکان میں داخل ہونے کا راستہ کہاں ہوگا۔ پھر ہمیں بتایا گیا کہ اس کمرے کی دائیں جانب ایک نہایت تپلی گلی تھی وہی اس گھر میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ وہ گلی اتنی پتلی تھی کہ ایک موٹا آدمی اس گلی سے مشکل سے گزر سکتا تھا، اور گلی کے اختتام پر گھر میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔

ہم سب لوگ دروازے پر دستک دے کر بے دھڑک گھر میں داخل ہو گئے۔ سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا اس کے ایک جانب ایک دالان، اس دالان کے ایک جانب چق لگی تھی جہاں ایک بھینس اور ایک گائے بندھی تھی۔ دوسری طرف

کے دروازے اسی دالان میں کھلتے تھے۔ صحن کی بائیں جانب سے ایک زینہ اُوپر جاتا تھا اور دالان کی مخالف سمت
باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ

صحن کے ایک کونے میں ایک بہت پرانی بیل اُگی ہوئی تھی جس کی موٹی موٹی شاخیں کچھ اس طرح زمین پر پھیلی تھیں جیسے
گھر میں آنے والوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہی ہوں۔

سامنے برآمدے کے بیچ میں آپا جی ایک چوکی پر اس طرح بیٹھی تھیں جیسے بیٹھی نہ ہوں بلکہ رکھی گئی ہوں۔ کیونکہ ان کا جسم
خاصہ بھاری تھا مگر ان کی ٹانگیں جسامت کے لحاظ سے بہت چھوٹی چھوٹی تھیں جن کو انہوں نے تقریباً لپیٹ کر اپنی گود میں
رکھا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک ٹرانسسٹر رکھا تھا۔ ایک طرف ٹیلیفون پڑا تھا۔ گاؤ تکیے پر جس کے سہارے وہ بیٹھی تھیں بہت سے
ڈاک کے لفافے، ٹکٹ، خط لکھنے کے کاغذ اور بال پین رکھے تھے۔ دوسری جانب کئی اخبار تھے، نوائے وقت، جنگ، حریت،
اخبار جہاں اور اخبار خواتین جن کا روزانہ تفصیلی مطالعہ بھی ان کے معمولات میں شامل ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔ ان کے سامنے
ایک چھوٹا سا پاندان تھا۔ چوکی سے لگا ہوا نیچے اُگال دان پڑا تھا اور اسی کے قریب ان کی جوتی رکھی تھی۔ سامنے دو کرسیاں پڑی تھیں۔

ہمیں دیکھ کر وہ ایکدم کھل پڑیں۔ ان کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا اور بڑی ہی مخلصانہ مسکراہٹ ان کے چہرے
پر پھیل گئی۔ انہوں نے کافی اونچی آواز میں کہا "آیئے، آیئے، خوش آمدید"ـــ "منی اومنی چھیتی نال کرسیاں
لے آ" ــــ ایک لڑکی جس نے بڑا سادہ سا لباس پہنا ہوا تھا ذرا شرمائی شرمائی کمرے سے دو کرسیاں اٹھائے ہوئے
برآمد ہوئی۔ پھر وہ اور کرسیاں لائی۔ ہم لوگ بیٹھ گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہم میں سے کئی لوگ ایسے تھے جو ان سے پہلے مل
چکے تھے۔ میرا اور باقی لوگوں کا تعارف کرایا گیا۔ وہ ذرا ہی دیر میں ہم سے اس طرح باتیں کر رہی تھیں جیسے ہمیں مدتوں
سے جانتی ہیں۔

ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے کہا "آپ لوگ سفر سے تھک گئے ہونگے۔
منہ ہاتھ دھو ڈالیں۔ میں چائے لگواتی ہوں"۔ پھر انہوں نے زور سے آواز لگائی۔ "سکینہ او سکینہ! چھیتی نال
چائے لے آ۔" میں نے دیکھا دوسرے کمرے سے ایک عورت برآمد ہوئی اور تیز تیز چلتی ہوئی باورچی خانے میں
چلی گئی۔ جہاں غالباً پہلے سے دو خواتین موجود تھیں۔ پھر ان تینوں نے مل کر ہمارے سامنے میزیں رکھیں، چائے کے برتن
لگائے اور کھانے کے لئے سویاں اور گاجر کا حلوہ اور کئی طرح کے بسکٹ لا کر سجا دیئے۔

ــــ ہم لوگ چائے پیتے رہے اور باتوں کا لامتناہی سلسلہ جاری رہا۔

آپا جی بہت بولتی تھیں اور لگاتار بولتی تھیں۔ ذرا ذرا بات پر خوب دل کھول کر ہنستی تھیں۔ ذرا ذرا دیر میں
وہ اللہ اور رسول کا ذکر کرتی تھیں اور بار بار توبہ کرتی تھیں۔ معلوم نہیں انہوں نے کون سے گناہ کئے تھے۔ جن کی سزا
کا خوف ان سے بار بار توبہ استغفار کراتا تھا۔ ہنستے ہنستے وہ ایک دم سنجیدہ ہوجاتی تھیں اور ان کی آنکھوں میں

رنے لگتے تھے۔

میں خاموش بیٹھا انہیں غور سے دیکھ رہا تھا اور ان کے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی اپنے ۔۔کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ سب سے عجیب بات جو مجھے محسوس ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھر کے ۔ے یا زینے سے مختلف عمر کی خواتین برآمد ہوتی تھیں۔ کوئی پانی بھر کر رکھ کر چلی جاتی تھی، کوئی باورچی خانے کھانا پکانے میں مشغول ہو جاتی تھی۔ کوئی کپڑے دھونے لگتی تھی، کوئی گائے اور بھینس کو چارہ ڈال رہی تھی۔ اسی ایک عورت سر پر ایک پوٹلی رکھے دروازے سے داخل ہوئی اور سلام کر کے آپا جی کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ نے بڑی شفقت سے اس سے پوچھا

"سناؤ جی۔ حال اے نوراں تیرا ؟"

"شکر ہے آپا جی"۔ نوراں نے کہا اور وہ کپڑے کی پوٹلی آپا جی کے سامنے رکھ دی۔ آپا جی نے اسے کھولا۔ اس ۔ موٹی باجرے کی میٹھی روٹیاں تھیں۔ انہوں نے ایک روٹی توڑ کر ذرا سا ٹکڑا چکھا۔ پھر دوسری طرف منہ پھیر ۔ے محسوس ہوا شاید ان کا مزہ اچھا نہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے تھوڑا تھوڑا ٹکڑا ہم سب کو دیا اور ایک ٹکڑا خود بھی کھایا۔ ۔می چکھا۔ واقعی وہ خاصی بدمزہ تھی۔ میں ایک نوالے کے بعد دوسرا نہ کھا سکا۔

جب وہ عورت اٹھ کر چلی گئی تو آپا جی کہنے لگیں بڑی بدمزہ ہے۔ مگر وہ بڑی محبت سے بنا کر لائی تھی۔ میں نے ۔ر میں نے نہ چکھی اور آپ لوگوں کو نہ دی تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے یہ گاؤں کے دیہاتی لوگ سادہ لوح مگر بڑے ہی محبت کرنے والے ہیں۔

پھر کھانے کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے پھر آواز لگائی "نصیبہ او نصیبہ"۔ اوپر سے آواز آئی "آ رہی ہوں آپا جی"۔ اور ۔ے اتر کر ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی جس کی عمر تقریباً بیس بائیس سال ہو گی ہمارے سامنے آن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ۔ ہم سب کی طرف دیکھا، پھر نگاہیں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ دیہاتی خوبصورتی کا اس سے بہتر نمونہ میں نے اپنی زندگی میں ۔ہیں دیکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اللہ بخش کی کسی پینٹنگ میں جان پڑ گئی ہے۔ آپا جی اسے بڑی محبت سے قریب بلا ۔ے پاس بٹھایا اور بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "یہ نصیبہ ہے۔ میری نصیبہ"

"جا بیٹے۔ کھانا لے آ۔"

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں غیر ارادی طور پر اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ میں چوری چوری اسے دیکھتا ۔ر مجھے احساس تھا کہ میرے ساتھی نہ معلوم کیا سوچیں۔ اس لئے کوشش کر کے میں بار بار اپنی توجہ آپا جی کی باتوں کی ۔ مبذول کرانے کی کوشش کرتا رہا مگر مجھے ناکامی ہوتی رہی۔ کھانا لگانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی زینے

کی طرف چلی گئی۔ اس وقت میں نے آپا جی کی نگاہوں میں جو کچھ دیکھا وہ ایک پوری زندگی کی کہانی معلوم ہوتی تھی۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جس میں شاید ان کی پوری داستان دہرادی گئی تھی۔ یہ ایک لمحہ پھیلتے پھیلتے ایک دائرہ بن گیا تھا جس کے حصار میں وہ مقید نظر آتی تھیں۔ پھر نصیبہ نگاہوں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ زینے سے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی وہ اوپر چلی گئی تھی۔

پھر کھانا کھایا گیا۔ آپا جی کی گفتگو جاری رہی۔ وہ بتا رہی تھیں بظاہر یہ گھر چھوٹا سا لگتا ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا اب ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے بہت سے حصے کر کے دالان اور کمرے بنوا دیئے ہیں، کچھ اوپر اور کچھ نیچے اور کچھ باہر۔ جن میں مختلف بے سہارا عورتیں اور لڑکیاں اور بچے رہتے ہیں۔ کئی بیوہ ہیں، کئی بے ماں باپ کی بے سہارا بچیاں ہیں جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ ان سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ یہ میری ملازمائیں نہیں ہیں۔ بس یونہی محبت میں میرا تھوڑا بہت کام کاج کر دیتی ہیں۔ لڑکوں کو میں نے اسکول میں ڈال دیا ہے۔ وہ باہر والے کمرے میں رہتے ہیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا۔ "آپا جی۔ ایک بات بتائیں" میرے سوال پر وہ ایک دم چونک پڑیں۔ مگر پھر سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"آپ کے اپنے بچے نہیں ہیں؟"

وہ میرے سوال پر مسکرائیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر اداسی کا ایک سایہ چھا گیا۔ "تم سب میرے بچے ہو اور یہ میرے آس پاس جو ہیں سب ہی میرے بچے ہیں۔"

میں نے ذرا مسکرا کر دوبارہ کہا "آپا جی۔ یہ تو میرے سوال کا جواب نہ ہوا۔"

پھر انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگیں "بچے میں تمہیں کیا بتاؤں، میں نے زندگی میں جس کے لئے سب کچھ قربان کر دیا تھا وہ تو مجھے بہت دن پہلے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پھر میں نے نصیبہ کو اپنی زندگی دے دی اور بڑے چاؤ سے اس کا رشتہ کیا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی کی۔ مگر میری قسمت دیکھو اس پر میرا ایسا سایہ پڑا کہ اس کا شوہر بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ بس تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو نصیبہ کو دیکھ لو۔ یہ بس میرا ہی عکس ہے۔ میں اسی آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا کرتی ہوں۔"

پھر شام ہو گئی اور میں اس روز اپنے سینے میں ایک کسک لئے واپس آگیا۔

مسلم جدون

یادگار

سب سے پہلے کرم خان نے مزار پر حاضری دی۔ مزار پر پہنچنے سے پہلے وہ جس راستے سے گزرا وہ مانوس تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے
ئی چہرہ مانوس ہوتا ہے۔ لیکن لباس وغیرہ بدل جانے سے اس مانوسیت میں کس قدر تبدیلی آجاتی ہے۔ کرم خان نے اس تبدیلی کو نوٹ کیا
لین اس پر غور نہیں کیونکہ سب سے پہلے وہ مزار پر جاکر فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا اور وہ چادر چڑھانا چاہتا تھا۔ جس کی اس نے منت مانی
ہوئی تھی۔ کوئی پندرہ سال پہلے نہایت ہی ناگفتہ حالات میں اس نے اپنے آبائی گھر اور بستی کو چھوڑا تھا۔ وہ مزار پر حاضر
ہوا تھا اور اس نے نہایت ہی دُکھے دل کے ساتھ دعا مانگی تھی کہ "باباجی میں اس جگہ کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ میں تم سے دور بھی
ہیں جانا چاہتا کیونکہ جب بھی مجھ پہ مشکل وقت آتا تھا میں یہاں آکر سکون حاصل کرتا تھا۔ لیکن اب حالات میرے بس سے باہر
یں۔ میں یہاں لوٹ کر ضرور آؤں گا۔ بشرطیکہ زندہ رہا۔ میرے حالات بدل گئے۔ تو میں آپ کے مزار پہ چادر چڑھاؤں گا۔

پندرہ سال کے طویل عرصے میں اس نے ذہنی طور پر باباجی کو نہ بھلایا تھا۔ بلکہ وہ ہر رات سونے سے پہلے فاتحہ پڑھتا
اور باباجی کو یاد کرتا تھا۔ اپنی بستی سے دور جاکر اس نے اپنی بستی کو بھی نہیں بھلایا تھا۔ وہ بستی اُسے اسی طرح یاد آتی تھی جیسے
اُسے اپنی مرحومہ ماں لوگوں کے سامنے اس نے کبھی مرحومہ ماں کا نام نہیں لیا۔ لیکن وہ اس کے تصور میں ہر وقت موجود رہتی ایسا
ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے آس پاس ہے اسے دیکھ رہی ہے اور بس اس سے آگے اس کا تصور کبھی نہ گیا۔ یہی حال
بستی کا تھا۔ بستی کا ہیولا اس کے ذہن کے افق پر نمودار ہوتا اور غائب ہوجاتا وہ بستی کو یاد کرکے اس طرح کبھی نہیں
جیسے ماں کو یاد کرکے وہ نہیں روتا تھا اس نے تو کبھی زبان سے یہ بھی نہیں کہا شدید سے شدید دکھ اور مشکل میں بھی کہ
"ہائے ماں میری" پھر بھی اسے مرحومہ ماں سے پیار تھا اور اسی طرح بستی سے بھی۔

پندرہ سال وہ بستی اور مزار سے دور رہا، بہت دور۔ اس نے اپنی قسمت کو بدلا وہ قسمت کو بستی میں نہ بدل سکا۔ اس
لئے نہیں کہ وہ محنتی نہ تھا۔ فعال اور مستعد نہ تھا۔ بلکہ اس لئے کہ وہاں قسمت بدلنے کے مواقع ہی نہ تھے۔ جن سے وہ فائدہ
پردیس میں اسے موقع ملا۔ ایک، دوسرا، تیسرا وہ ان سے فائدہ اٹھاتا رہا اور قسمت بدلتا رہا۔ وہ اپنی ... سے

تو نکلا تھا بلکہ باہر جانے کا کرایہ بھی اس نے ادھار لیا تھا۔ وہ آج اس کا بینک بیلنس تھا۔ خاصی بڑی رقم اس نے پردیس میں مکان خرید لیا، جائیداد نہ بنائی۔ بس کام کیا اور کام۔ وہ پردیس میں خون پسینہ بہاتا رہا اور معاوضہ پاتا رہا۔ آج وہ ساری دولت ساتھ نہیں لایا تھا۔ تاہم اس کا واپس جانے کا بھی ارادہ نہ تھا۔ اور یہ ارادہ بھی نہیں تھا کہ وہ بستی میں ہی قیام کرے گا۔ اور اپنے عزیزوں اور بستی والوں کو دکھائے گا کہ دیکھو اب میں تمہارے معیار سے دولت مند ہوں، میری عزت کرو۔ وہ تو پندرہ سال بعد مزار پہ حاضری دینے آیا تھا۔ اپنی ماں اور باپ کی قبر دیکھنے۔ اپنے اس گھر کو دیکھنے جو اس کا ہوتے ہوئے بھی اس کا نہیں رہا تھا۔ ابھی اسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ بستی میں ہی رہ جائے یا واپس اسی جگہ چلا جائے جس نے اسکے سر پہ دستِ شفقت رکھا تھا۔

مزار پہ اس نے چادر چڑھائی مزار پہ حاضر چند اور معتقدین نے چادر کے کونے پکڑے اور آہستہ سے مزار پہ اسے رکھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے بابا کے مزار پہ چادر چڑھائی اور پھر پاس ہی رکھے بکس میں اس نے سو سو کے پانچ نوٹ ڈال دیئے۔ پہلے جب وہ مزار پہ آتا تھا تو چند سکے مزار پہ ڈال دیتا تھا جنہیں شام کے وقت مجاور اور خدمت گزار اٹھا لیتے تھے لیکن اب مزار پہ لوہے کا سیف پڑا تھا۔ جسے قفل لگا تھا اور سیل کیا ہوا تھا۔ یہ تبدیلی نئی ضرور تھی لیکن ایسی بھی نہیں کہ اسے حیرانی ہوتی۔ کیونکہ اس نے پڑھا اور سنا بھی تھا کہ اکثر مزار محکمہ اوقاف کی تحویل میں آ گئے ہیں۔ اور باباجی والا مزار بھی محکمہ اوقاف کے پاس چلا گیا ہے۔ پرانے مجاوروں کو درگاہ بدر کر کے نئے "مجاور" بٹھانے کے پہلوؤں پر اس نے غور کرنا مناسب ہی نہ سمجھا کیونکہ یہ بات اس کے لئے غور طلب تھی ہی نہیں وہ پہلے بھی سوچتا تھا کہ مزار کے آس پاس کے دوکاندار، جوتے رکھنے والے بھکاری، ملنگ، مجاور سبھی تو باباجی کے فیض سے ہیں اگر مزار نہ ہوتا تو یہ لوگ بھی نہ ہوتے یہ باباجی کا فیض ہے کہ کچھ لوگوں کا پیٹ پل رہا ہے۔ اور یہ محکمہ جو بنا ہے اور اس میں جن کو روزگار مل رہا ہے۔ آخر مزارات ہی کا تو فیض ہے۔ اس کی نظر پھر بکس پر پڑ گئی۔ سیل کیا ہوا سیف اسے کھول کر اس سے پیسے سبھی محکمہ والوں یا مجاز آدمی کے سامنے نکالے جاتے ہوں گے۔ اور پھر جمع کرائے جاتے ہوں گے۔ سرکاری حساب میں مزار کے حساب میں لیکن، لیکن اگر، سبھی مل جائیں تو مزار کا دو سو ہتھیا لیں تو کیا۔ ؟ اس نے ایک دم سے سر کو جھٹکا دیا کہ وہ کیسی باتیں سوچنے لگا ہے، کچھ بھی ہو باباجی کا فیض ہے۔ سیف سے اس کا دھیان پھر ایک بات کی طرف چلا گیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہاں کوئی ایسی مشین لگا دی جائے کہ جو جتنا نذرانہ دے وہ مشین اپنے پاس لکھتی چلی جائے اور برسوں کا نذرانہ جمع کرتی چلی جائے۔ اور ہر دیکھنے والے کو معلوم ہو سکے کہ چھ ماہ سال میں کتنا جمع ہوا اور پھر مشین سے رقم لے کر اخباروں کے ذریعے ہر ایک کی اطلاع کے واسطے مشتہر کیا جائے کہ باباجی کے مزار کا نذرانہ اتنا ملا ہے ؟ اس نے پھر سر کو جھٹکا دیا کہ وہ کیسی باتیں سوچنے لگا ہے اس سے پہلے تو اس نے ایسی باتیں نہیں سوچی تھیں۔ اس کا دھیان یہاں سے چادر کی جانب چلا گیا۔ جس کے ساتھ ایک اور چادر ڈالی جا چکی تھی "۵۰۰ روپیہ تو سیف میں گیا لیکن چادر اگر شام کو کوئی کارندہ اسے اٹھا لے جائے تو ۵۰۰ کی چادر اس کا ثبوت کہ میں نے یا کسی اور نے چادر چڑھائی ہے۔ اس نے پھر سر کو جھٹکا دیا کہ مزار پہ پہلے بھی چادریں چڑھائی جاتی تھیں۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کہاں چلی جاتی ہیں۔ باباجی کا فیض ہے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ اتنے میں ایک معتقد آیا۔ اس نے چادر چڑھائی اور مزار پہ موجود کارندے

سے رسید لے لی" اوہو اچھا اس کا بھی حساب کتاب ہے۔ لیکن یہ کارندہ ہر ایک کو رسید خود کیوں نہیں دیتا۔ مثلاً اس نے مجھے رسید نہیں دی، میرے بعد آنے والے کو نہیں دی۔ اب اس صاحب نے طلب کی تو تب اسے دی گویا دو چادریں کسی حساب کتاب میں نہیں!؟ اس نے پھر سر کو جھٹکا دیا وہ کیسی باتیں سوچنے لگا ہے وہ پہلے تو یہ باتیں نہیں سوچتا تھا۔

مزار کی طرف منہ کر کے وہ پچھلے پاؤں چلتا ہوا مزار کے احاطے سے باہر جانے لگا۔ وہ باباجی کی طرف پیٹھ کر کے بے ادبی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چادر، چادر، چادر پھر اس کے ذہن پر سوار ہو گئی۔ وہ میرے تایا رحیم خان بھی تو مجاور تھے۔ رحیم خاں کا نام آتے ہی ساری یادیں تازہ ہو گئیں۔ اللہ بخشے کیسے نیک دل اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ ان کا تکیہ کلام ہی تھا، "اللہ معاف فرمائے" اور "بندہ حقیر، پر تقصیر"۔ پابند صوم و صلوٰۃ ہاتھ میں تسبیح، کرم خان کو اپنے چچا کا حلیہ یاد آنے لگا۔ ۱۶، ۱۷ سال پہلے والے رحیم خاں، بستی کے لوگ ان کی عزت بھی کرتے تھے اور نہیں بھی عزت کرنے والے ظاہر کو دیکھتے تھے اور عزت نہ کرنے والے باطن پر نظر رکھتے تھے۔ رحیم خان ہی تو تھا جس نے کرم خان کے والد کو گھیر گھار کر اور مقدموں میں پھنسا کر اس سے زمین بکوا دی تھی اور زیادہ تر خود ہی خرید لی تھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب کرم خاں کے والد کو اپنا مکان فروخت کرنا پڑا اور درمیان کے ایک آدمی کے ذریعے سے وہ بھی رحیم خان نے خرید لیا تھا اور یوں وہ دن بھی آیا جب اپنے چچا کی "کارستانیوں" کی وجہ سے کرم خان اور اس کے والد کو کسی کا مزارع بن کر رہنا پڑا اور یوں ان کی عزت دو کوڑی کی ہو گئی تھی۔ کرم خان کا خاندان ہی رحیم خان کی "کارستانیوں" کا شکار نہیں ہوا تھا۔ بلکہ گاؤں اور بستی کے اور بھی لوگ اس کے ستائے ہوئے تھے وہ ہمیشہ مٹھائی میں لپٹا ہوا زہر استعمال کرتا تھا۔ وہ درپردہ وار کرتا تھا وہ پیٹھ میں چھرا گھونپتا تھا۔ بستی کے بعض جہاندیدہ لوگ اس کے لئے "بغل میں چھری منہ میں رام رام" والا ہندوانہ محاورہ استعمال کرتے تھے۔ جہاں وہ "خدمت خلق" کے اور کام سرانجام دیتا تھا وہاں وہ باباجی کے مزار پر مجاوری بھی کرتا تھا۔ پارٹ ٹائم سجاوری، لیکن وہ سبھی مجاوروں کا سردار بنا ہوا تھا اسے باقاعدہ نذرانہ سے حصہ ملتا رہتا تھا اور یوں رحیم خان ایک دولت مند آدمی بن گیا تھا۔ دولت تو اس کے ہاتھ آ گئی تھی۔ دنیا تو اسے مل گئی تھی لیکن دین ؟ کرم خاں اس بارے میں کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ رحیم خان کے بارے میں اس کی ساری معلومات کا منبع اس کی مرحومہ والدہ تھی وہ اسے بتایا کرتی تھی کہ کس طرح رحیم خاں نے اپنی بیوی کو مار مار کر اذیت دے کر گھر سے نکالا۔ اور کس طرح اس نے اور نوجوان لڑکی سے بیاہ کیا۔ کس طرح اس کی پہلی بیوی کے لڑکے اس کے خلاف ہو گئے۔ لیکن۔ رحیم نے بستی میں اپنے طرز عمل کے قابل قبول جواز گھڑ رکھے تھے۔

جب کرم خان نے بستی کو چھوڑا تو اس سے ایک سال پہلے رحیم خان کا انتقال ہوا تھا اور اس کی وصیت کے مطابق بابا کے مزار سے متعلق قبرستان میں دفنایا گیا تھا۔ بستی والے سال ہا سال باباجی کے مزار کے اردگرد کے علاقے کو قبرستان کے طور پر استعمال کرتے آ رہے تھے۔ مزار کے اردگرد کی زمین ناہموار تھی چھوٹے چھوٹے کھیت، ٹیلے، چٹانیں مزار کے پاس ہی ایک قدرتی چشمہ تھا جس سے بستی کے لوگ اور زائرین پانی لیتے تھے۔ چشمہ کا پانی ندی کی صورت اختیار کر کے نیچے کی جانب کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ مزار کے اردگرد کے علاقے میں قبرستان کوئی یک جا قبرستان نہ تھا۔ بلکہ چند قبریں ایک جگہ چند دوسری

جنہیں جہاں ہموار جگہ ملی وہاں قبریں بنالیں گئیں. کرم خان کو یاد آرہا تھا کہ باباجی کے مزار پہ عُرس کے دنوں میں "میلہ" لگا کرتا تھا. میلے میں ناچنے، گانے والیاں، جوا کھیلنے والے، شراب اور بھنگ پینے والے بھی شامل ہوتے اور زائرین بھی زائرین کے ساتھ تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد بھی آتی تھی. کرم خان اپنی سادہ لوحی کی بنا پر اسے بھی باباجی کا فیض سمجھتا کہ لیل غیر ضرورت مندوں کے ہاتھوں سے رقم نکل کر ضرورت مندوں کو مل جاتی لیکن یہ "دھماچوکڑی" اس کی سمجھ سے بالاتر تھی. باباجی سے بھلا ان باتوں کا کیا تعلق؟ وہ سوچتا کہ باباجی ان بُرے لوگوں کی تباہی کے لئے خدا سے دعا کیوں نہیں کرتے؟ اور پھر خود ہی جواب دیتا نہیں. باباجی کسی کے حق میں بددعا نہیں کرتے. مسجد کے امام صاحب بھی یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے رسول نے کافروں کے حق میں بھی کبھی بدّعا نہیں کی. پھر باباجی کیوں بدّعا کریں. ہاں ان لوگوں کو راہ راست پہ لانے کے لئے دعا ضرور کرتے ہوں گے. دھماچوکڑی والوں کی دست بُرد سے قبریں بھی محفوظ نہ تھیں، کچی قبریں تو یوں ہی ملیامیٹ ہوگئیں بس البتہ پکی قبریں ذرا بچ جاتی تھیں لیکن انکے پتھر اکھڑ جاتے تھے میلے کے بعد بستی والے ان قبروں کی پھر کچھ مرمت کر لیتے کچھ پتھر رکھ لیتے لیکن مرنے والوں اور ان کی بھلا کون پرواہ کرتا ہے. مرے ہوئے سے کسی کو کیا فائدہ یا نقصان ہوسکتا ہے. اس لئے ان کا کون خیال کرے. کسی نے اپنے کسی عزیز کی قبر کو محفوظ رکھا تو شائد اس سے پیار کی وجہ سے یا اس کے اس فائدے کو یاد کر کے جو اس نے زندگی میں اسے پہنچایا تھا یا پھر خاندان کے سلسلے کو محفوظ کرنے کے لئے اور اولاد کو بتانے کے لئے یہ تمہارے والد، دادی، نانا، نانی، چچا وغیرہ کی قبر ہے. لیکن جونہی دوسری یا تیسری نسل آتی ہے تو وہ ان کو بھول جاتی ہے اور یوں قبریں زمانے کی دست بُرد کا شکار ہو جاتی ہیں. بستیوں کے اردگرد کے قبرستان ہوں تو اکثر اوقات نکالی جانے والی سڑکوں میں آتے ہیں. لوگ اپنی زمینوں کو بچا کر قبرستانوں کو سڑک کے حوالے کر دیتے ہیں. یا پھر قبرستان عیار اور چالاک لوگوں کے لئے دوکانیں اور میدان بنانے کے کام آتے ہیں. زندوں سے زمین اور وہ بھی مفت لینا تو آسان کام نہیں. البتہ مُردوں کے بسیروں اور آرام گاہوں پہ قبضہ کر لینا آسان کام ہے.

کرم خان اب مزار کے قریب والے بازار سے گزر رہا تھا. پرانی دوکانوں کی بجائے نئی دوکانیں بن چکی تھیں. ایک دوکاندار اسے واقف نظر آیا اس نے اسے سلام کیا. دوکاندار نے کل کے ۱۵، ۱۶ نوجوان کرم خان اور آج کے ۵۰ سالہ جوان کرم خان کو پہچان لیا اس کی آؤ بھگت کی حال احوال پوچھا. کرم خان نے تفصیلی ملاقات کا وعدہ کیا اور پوچھ لیا کہ یہ سب تبدیلیاں کیسے ہوئیں. اس پہ دوکاندار نے کرم خان کو بتایا کہ باباجی کے مزار کے اردگرد کے علاقے کو ایک سکیم کے تحت ٹھیک ٹھاک کیا جارہا ہے مقبرہ کو اور زیادہ خوب صورت کیا گیا ہے. زائرین کے لئے سہولتوں کا بندوبست کیا گیا ہے. مسجد بنائی جارہی ہے. لائبریری بنے گی. وغیرہ وغیرہ.

دوکاندار سے ملنے کے بعد کرم خان نے اپنے ایک عزیز کے گھر جانے کی ٹھانی وہ عزیز جس کے ہاں اس کی شادی ہونا تھی لیکن ۳۵ سال گزرنے پہ نہ جانے انہوں نے فریدہ کی شادی کس سے کر دی ہو گی. ظاہر ہے وہ لوگ اب شائد اس کا

ستبال خندہ پیشانی سے نہ کریں کیونکہ اس نے ان لوگوں کی ایک طرح سے بے عزتی کی ہے۔ پندرہ سال میں اس نے ایک بار بھی ان سے
ے پوچھا کہ ان پہ کیا بیتی ؟ فریدہ کا کیا ہوا ؟ فریدہ کے بارے میں اس کا کیا ارادہ ہے ؟

پھر وہ سوچنے لگا کہ وہ کسی کے گھر بھی جا سکتا ہے۔ کسی اور عزیز کے ہاں۔ اب وہ دولت مند ہے ہر کوئی اسے سر آنکھوں پر
انے گا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے وہ راہ لی جو قبروں کے پاس سے گزر کر بستی تک جاتی ہے۔ اسے پھر رحیم خان یاد آ گئے اسے
آیا کہ رحیم خان نے مرتے وقت اپنی اولاد سے کہا تھا کہ وہ اس کی قبر پہ ایک یادگار تعمیر کریں۔ ہو سکتا ہے اس کی اولاد نے
یا کیا ہو۔ لیکن جب اس نے بستی چھوڑی تھی اس وقت تو رحیم کی قبر پختہ بھی نہ تھی۔ قبر کو پتھروں سے بندھوایا گیا تھا
مر کو سیمنٹ سے ایک دوسرے سے جوڑا گیا تھا اور بس شاید اب تک رحیم خان کی اولاد نے یادگار تعمیر کر دی ہو کیونکہ
ے یادگار کے لئے اس نے خاص طور پہ دولت چھوڑی تھی۔ بلکہ وہ دولت یادگار ہی کے لئے جمع کرتا رہا تھا اس کا ارادہ تھا کہ
ہ اپنی زندگی میں ہی اپنے لئے اپنی قبر بنائے اور اس پہ یادگار تعمیر کرے۔ لیکن زندگی نے اسے مہلت نہ دی تھی وہ اچانک
ر ہوا تھا اور قریب الموت ہوا تو اس نے اولاد کو ساری دولت دے دی اور وصیت کی کہ وہ اس دولت سے اس
، شاندار قبر بنائیں اور اس پہ یادگار تعمیر کرائیں۔ کرم خان سوچتا سوچتا راستے کے ٹیلے عبور کرتا جا رہا تھا۔ واقعی بابا جی کے
زار کے ارد گرد کے علاقے میں انقلاب آ گیا تھا۔ بسوں کے اڈے کے آس پاس کی خود رو دکانیں مسمار کر دی گئی تھیں۔
زار سے کچھ فاصلے پہ بنائے گئے مکانات بھی غائب تھے اب وہاں میدان تھا۔ مزار کے قریب مزار کے ٹیلے ہموار کر دیئے
ئے تھے۔ ندی پہ نیا پل تعمیر کر دیا گیا تھا۔ ندی کے ارد گرد باغ لگا دیئے گئے۔ پھول بھی عجب بہار دکھلا رہے تھے۔ وہ چلتے
تے ایک جگہ رک گیا اور ذہن پہ زور دینے لگا۔ ہاں یہاں کہیں رحیم خان کی قبر بنائی گئی تھی لیکن اب ؟ قبر کہاں ہے ؟
مانہ اسے دھوکہ ہوا ہے۔ شاید قبر یہاں نہیں تھی۔ کہیں اور تھی لیکن کہاں تھی قبر مل جائے تو وہ فاتحہ تو پڑھے۔ رحیم خان دشمن
ا بھی لیکن میرا چچا تھا۔ یوں بھی فاتحہ پڑھنا ثواب کا کام ہے"۔ اتنے میں پاس سے ایک آدمی گزرا۔ کرم خان نے اسے روکا وہ کوئی
الیس پینتالیس سال کا ہو گا۔ کرم خان نے لاشعوری طور پہ اس سے پوچھ لیا "کیا آپ یہاں کے رہنے والے ہیں ؟" "جی ہاں" اسے
اب ملا اس پہ کرم خان نے پھر پوچھا "ایک صاحب تھے۔ رحیم خان آج سے کوئی پندرہ سال پہلے ان کی وفات ہو گئی تھی۔ ان کی قبر
ہاں کہیں بنائی گئی تھی۔ باقی چند قبریں تو ادھر ادھر موجود ہیں مگر رحیم خان کی قبر دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے رحیم
ہ مرتے وقت اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پہ ایک یادگار بنائی جائے"۔ کرم خان نے کہا "لیکن آپ کون ہیں کہاں سے آئے
ہیں" راہ گیر نے پوچھا۔ "میرا نام کرم خان ہے میں صمد خان کا بیٹا ہوں، صمد خان اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میں یہاں سے ۱۵ سال
ہلے چلا گیا تھا" "ارے تم کرم خان ہو۔ میں نے پہچان لیا۔ میں گل احمد کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ زندہ ہے چلو ہمارے گھر۔ یار تم ایسے
ئے کہ پھر تم نے اپنے زندہ یا مردہ ہونے کی اطلاع نہ دی آخر کہاں گزارے اتنے سال ؟ راہ گیر نے پوچھا "بتاؤں گا بتاؤں گا آرام سے
بھی کچھ بتاؤں گا۔ پہلے مجھے رحیم خان کی قبر بتا دو میں فاتحہ پڑھ لوں" "اتنا جلدی کیا ہے ؟ رحیم خان کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے کی جلدی کیا ؟

ہے اپنے والدین کی قبروں پہ چلیئے وہاں فاتحہ پڑھیئے پہلے" وہ پڑھوں گا۔ مجھے معلوم ہے ان کی قبریں دور وہاں وہ سامنے
ں۔ مجھے دکھائی دے رہے ہیں۔ سردست مجھے رحیم خان کی قبر کی تلاش ہے نہ جانے میرا دل اس کے لئے بے قرار کیوں ہے
ں اس کی قبر اداس پہ بنی یادگار دیکھنا چاہتا ہوں۔" "اتنے سال گزرنے کے بعد بھی تمہیں سبھی باتیں یاد ہیں" راہ گیر نے کہا "لیکن ہاں تم
حیم خان کو کیسے بھول سکتے ہو۔ اس رحیم خان کو جس نے تمہارے خاندان کے ساتھ زیادتیاں کیں۔ اس بستی کو تم سے چھڑانے کا بھی وہی
ہیم خان ذمہ دار تھا" راہ گیر نے کہا "ان باتوں کو سردست رہنے دیجئے مجھے قبر کا پتہ بتایئے" کرم خاں نے اصرار کیا۔ "قبر کرم خان
جب تم گئے تھے تو شاید قبر پہ چند پتھر موجود تھے۔ پھر آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ پتھر بھی غائب ہوگئے
میلے اور عرس پہ آنے والوں کے قدموں نے جہاں پتھر غائب ہوئے وہاں انہوں نے قبر کے نشان بھی مٹا دیئے۔ گاؤں والے
کوشش کرتے رہے کہ ان پتھروں کو دوبارہ قبر پہ رکھ دیں۔ لیکن کہاں تک ؟ قبروں کا خیال تو مرنے والوں کی اولاد ہی رکھ
سکتی ہے۔ لیکن رحیم کی اولاد ؟ وہ کہتے ہیں نا" چنگا یاں تو مندے" اچھوں کی اولاد بڑی ہوتی ہے سو وہی بات ہوئی اولاد بڑی
نکلی، وہ پیسے لے کر شہر چلی گئی۔ پیسے اڑا دیئے۔ شرابی کبابی بن گئے، غنڈے بن گئے اور یوں وہ رحیم خان کی ایک اچھی یادگار
ثابت ہوئے۔ اب اس کے لڑکے سنا ہے۔ شہر میں تانگہ بانی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بہن کی بھی شادی وہیں کہیں کر دی ہے۔ وہ
یہاں شاید دو تین بار آئے اور وہ بھی باپ کی چھوڑی ہوئی زمین فروخت کرنے کے سلسلے میں باپ نے کس قدر محنت سے زمین خریدی
تھی ؟" راہ گیر داستان بیان کرتا جا رہا تھا۔ کرم خان نے بات کاٹ دی۔ "ہاں میں جانتا ہوں کہ کس قدر محنت اور کس قدر حیلوں اور کس قدر خیر جانے
دو، بتاؤ قبر کہاں تھی ؟" کرم خان نے کہا" جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے رحیم خان کی قبر یہاں چند قدم کے فاصلے پر جو ٹیلہ ہے بلکہ تھا اس پر تھی
وہ ٹیلہ الگ تھلگ تھا تمہیں یاد ہے نا ؟" پھر جب مزار کے آس پاس گرد کے علاقے کو ترقی دی گئی تو بلڈوزر آ گئے۔ انہوں نے ٹیلے ہموار کر دیئے۔
مکانات گر گئے۔ دوکانیں اکھڑ گئیں۔ بھلا بے نشان قبر کا کسے خیال ہو سکتا ہے۔ سو ٹیلے ہموار ہوئے۔ اور رحیم خان والا ٹیلہ بھی ہموار ہو گیا ہموار
جگہ پہ عمارتیں بن گئی ہیں۔ زائرین کی سہولت کے لئے مسافر خانے، طعام خانے، وضو کرنے کی جگہ، نہانے کی جگہ اور بیت الخلاء وغیرہ یہ سامنے
بیت الخلاء ہے یہ اسی ٹیلے پہ بنا ہے۔ جہاں کبھی رحیم خان کی قبر ہوا کرتی تھی ۔ ۔

عبدالوحید

اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے اُسے روتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بعض دفعہ ہنسی میں رو دیا کرتا تھا۔
ءآنسوؤں سے رویا ۔ شاید وہ ہنس رہا تھا ۔

ایسے لوگ جو کرتے ہیں۔ بہروپ میں کرتے ہیں یا پھر کچھ بتانے میں اتنی دیر کر دیتے ہیں کہ سننے والا آگے نکل جاتا ہے۔
روتے ہیں تو اتنی تاخیر سے کہ ہنسی کا لمحہ آ پہنچتا ہے۔

لیکن کون ؟

آپ اب تک اُس سے ناواقف ہیں۔ میں اس کا تعارف کیا کراؤں کہ اس کی پہچان کے لئے آپ سے سارا قصہ کہنے
اہوں۔

یہ کہانی شاید آپ نے پہلے بھی سُنی ہو گی بڑی مختصر سی ہے۔

میر تنہا یوسفی کا اصل نام خادم علی ہے۔ وہ میرا ہم جماعت ہے۔ یونیورسٹی میں وہ پہلے کئی ایم اے کر چکا ہے سائیکالوجی
انگریزی میں چار سال میڈیکل کالج میں لگا چکا ہے۔ کچھ عرصہ دوائیوں کی دکان چلائی۔ تین سال ایک دفتر میں کام کیا۔ پھر
ب چھوڑ چھاڑ کر بقول خادم علی، بن باس لے لیا اور جب گیان ملا تو یونیورسٹی میں آ دھمکا۔

ہم میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ دن تو یوں لگا جیسے کسی پارک میں خشک حوض ہوتا ہے۔
مگر آہستہ آہستہ اس حوض میں تری آتی گئی اور پھر تو وہ بھر گیا، لبا لب، پورا پورا۔

کلاس میں ڈاکٹر صفدر نے پوچھا
خادم علی کون ہے
یوسفی کھڑا ہوا یوں، گویا اب کھڑا نہ ہو گا۔
تو اس طرح سے پتہ چلا یوسفی کے چھلکے میں خادم علی ہے۔ مگر وہ چھلکا اتارتا ہی نہیں۔ اندر جھانک کر خادم علی کو
ر کواڑ اور سختی سے بند کر لیتا ہے

منیر محمد خیال

ورزیں اتنی ہیں کہ وہ لاکھ چھپے، پرانی عورت کی طرح نئی زپ میں نہیں سماتا۔ چھلک پڑتا ہے۔
ہمارا تعارف یوں ہوا وہ بہت دن تک کینٹے میں اکیلا بیٹھا سوٹے لگاتا اور چائے چسکارتا رہا، کچھ
ایسا تھا کہ لڑکیوں کے لئے آرزو کی چھال بن گیا تھا۔
گول چہرہ، ایک شلوار اور کرتہ جس کے گریبان پر بٹنوں کی جگہ پن لگی ہوتی۔ شاید وہ کوئی منفرد چیز
کر لگائی گئی تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ، آنکھ پر عینک اور سر پر بال ایسے جس طرح سردیوں میں گھاس جو جل
ہے۔ ایک روز اس نے فزکس کے ایک لڑکے کا ہاتھ دیکھا۔ چند لوگ اور متوجہ ہوئے اور لڑکیاں بھی آ
اس منظر ممنوعہ کے سائے تلے جا کھڑی ہوئیں۔
میرا پرابلم نعمینہ تھی کسی اور بکھیڑے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ آصف کے ذریعے ہمارے گروپ میں
ہوا تھا۔ بے فکرا ہر طرف سے۔ گیانی۔
اس کا مقولہ تھا

I damn care

پڑھائی میں شاید تجربے کی بنیاد پر نمبر حاصل کر لیتا۔ کیونکہ پڑھتے تو اسے کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔
پہلے سمسٹر کے خاتمے تک میری اور نعمینہ کی "آپ" ختم ہو چکی تھی۔ اب موقع تاڑ کر میں کھڑاک
کے موڈ میں تھا

نعمینہ یوسفی سے خاصی متاثر تھی۔
"بڑا قابل ہے، بھئی اس کا وسیع تجربہ ہے"
ایک روز میں نے یوسفی سے پوچھا۔
"یار یوسفی! کیا خیال ہے کہہ دوں صاف صاف"
اس نے کش لگایا، سکون سے،
"وہ تمہاری عزت کرتی ہے، مجھے معلوم ہے اس کی منگنی ہو چکی ہے کسی کیپٹن سے، وہ سمارٹ ہے!
خیر یوسفی، جو کیپٹن ہو وہ سمارٹ اور کزن تو خواہ مخواہ ہوتا ہے"
وہ آصف کی طرف مڑا۔

"look at him"

کیسا احمق ہے، ذلیل آدمی، تو خود سوچ۔
وہ پیار سے شروع ہوا۔
"وہ بڑی بلند کردار لڑکی ہے اور ہر شخص سے اپنی معصوم طبیعت کی وجہ سے بے تکلف ہو جاتی ہے

دماغ ایسی آلائشوں سے پاک ہے۔

" مگر یار! وہ میرے ساتھ بائیک پر سپر گئی اور برگر کھا کر آئی۔ آخر وہ ہر شخص کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتی "

یوسفی نے سگریٹ دور پھینک دیا۔

" تو جاکر آپ اسی وقت اظہارِ محبت کر دیں۔ اور نتائج سے ہم کو مطلع ضرور کرنا۔ اور فلمیں ذرا کم دیکھا کیجئے۔

میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں حتی المقدور غلط فہمی میں رہنا چاہتا تھا۔ اس دھند میں گر کر دو ماہ اور گزار دیئے۔

اس عرصے میں نعیمہ نے مجھے ایک ڈائری لا کر دی جس پر لکھا تھا " لائف " چنانچہ میرے ارادے پھر لرزنے لگے

فلم کی دعوت دی تو بولی۔

" خیریت، نیت کیا ہے "

میں نے اپنی ازلی سستی کو پرے دھکا دیا اور نیت کی ساری خرابی بیان کر دی۔

آنکھیں نکال کر بولی۔ " فلرٹ "!

" EXACTLY NOT " ایگزیکٹلی ناٹ

" WHAT THEN " دٹ دن

لمبا پلان ہے، لائف لانگ

" THEN ALL RIGHT " دن آل رائٹ

ویسے بجُو جی بڑا اچھا موڈ ہے تمہارا

" اوہ نو! یو آر ہارڈ اینف YOU ARE HARD ENOUGH

وہ یوں ہنسی جیسے سکّے پکے فرش پر گرتا ہے، اُچھلتا ہے اور چھنکتا ہے

اس طرح یہ قصّہ ختم ہوا۔

روسٹ چکن پر میں نے نویدِ مسرت سنائی۔

آصف گلے ملا۔ سہیل نے ایک دو روسٹ چکن کا آرڈر پاس کیا۔ یوسفی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کسی شریف لڑکی پہ الزام مت لگاؤ، کیوں جھوٹ بولتے ہو۔"

آصف اور سہیل بددل ہوئے ذرا سے، مجھ پر بھی گھٹا سی لہرائی۔

" یار مت مانو، میرا مسئلہ حل ہوا، اب لوگ جو سمجھیں۔

یوسفی نے تعلق تو ختم نہ کیا البتہ اس کا رویہ مجھ سے یکدم تبدیل ہو گیا۔

آپ نے اگر کبھی محبت کی ہے تو جانتے ہوں گے کہ انسان اس میں الجھے تو سب تعلقات وقتی اور محبت کُل وقتی
ہو جاتی ہے۔

دوسرے سمسٹر کے خاتمے تک نعیمہ سے میری لڑائی ہو گئی کسی بات پر۔ اور اس عرصے میں یوسفی نے اُسے دو ٹرم
پیپر اور چند اسائمنٹ لکھ کر دیں اور مجھ سے برابر کہتا رہا۔

"وہ تیری CARE نہیں کرتی تو سراسر غلط فہمی کا شکار ہے"۔

میں غصے میں تھا اور نعیمہ ناراض تھی۔

ایک روز میں نے دیکھا وہ رو رہی ہے چنانچہ میرا غصہ اور اس کی ناراضگی ختم ہو گئی۔ دراصل اس کی رنگ گم گئی
تھی وہ تو خیر مل گئی اور ہم بھی پھر دوبارہ ناراض نہیں ہوئے۔

یوسفی پھر کترانے لگا

آصف کے کمرے میں سب نے میری بے راہ روی کی بات چھیڑ دی سب کا فیصلہ تھا کہ ٹو گیا۔

یوسفی چپ تھا اس کے گہرے سانولے چہرے پر لمبوری سی چھایا تھی جنگلی بیری کی، کوتاہ، اور بھرپور کچھ چھدری؟
نعیمہ فلرٹ ہے، بکواس لڑکی ہے، کیا ہے اس میں، رضوان بیگ سے کیوں ملتی ہے، عقیل کے ساتھ ڈیبیٹ
میں کیوں جاتی ہے۔ پارٹنر بنانے کے لئے صرف سمارٹ لڑکے ہی کیوں نظر آتے ہیں۔
لائف دیتی ہے۔ یہ شخص بے وقوف ہے اور حقائق کو تسلیم نہیں کرتا۔ ان دی لانگ رن IN THE LONG RUN یہ
پچھتائے گا"

وہ رُندھ گیا، میں تلملایا، سب کو بُرا لگا۔ ہم چپ رہے۔

میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ یوسفی اس مسئلے پر جذباتی کیوں ہو جاتا ہے۔ سب اسے ایک ہمدرد کی ہمدردی
انتہا سمجھتے رہے۔

تیسرا سمسٹر شروع ہو گیا۔

ہم فیلڈ ورک کے لئے آزاد کشمیر چلے گئے راولاکوٹ، جس سٹیشن پر لڑکیاں تھیں ہم وہاں سے خاصی دور تھے۔
یوسفی اور قاسم قریب تھے۔ وہ تواتر سے لڑکیوں کی خیریت معلوم کرنے جاتے رہے جن میں نعیمہ بھی تھی۔

یوسفی نے نعیمہ کو بھی بارہا بچپن کی اس جذباتی لہر کی رو سے بچانے کی کوشش کی اور وہ بالکل ٹھیک تھا کہ ایسے
فیصلے فریقین کو بقول اُس کے "خراب کرتے ہیں"۔

وہ پھل اور ضروریات جو وہاں میسر نہ تھیں لے کر جاتا تھا۔ نعیمہ نے بتایا کہ تمہارا ذکر بالکل نہیں کرتا۔ اور اگر کرتا ہے
تو یہ کہہ کر کہ وہ جلد باز، بے صبرا اور کسی حد تک بات کا کچا بھی ہے

دوست مذاق میں سب کہتے ہیں

نعیمہ سے یوسفی کے خوشگوار تعلقات میرے لئے باعثِ اطمینان تھے۔ وہ ٹھیک ہو رہا ہے اور معاملات سمجھ رہا ہے۔"

فیلڈ سے واپسی پر میری اور نعیمہ کی منگنی ہو گئی۔

یوسفی شریک ہوا۔ مجھے تحفہ دیا۔ نعیمہ کو تحفہ دیا، ہنستا رہا۔ پچھلے ہفتے کلاس روم خالی تھا میں اور نعیمہ تنہا ۔ جس کرسی پر وہ بیٹھی تھی میں اس کی ہتھی پر بیٹھ گیا

پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جس میں میری پہنائی ہوئی انگوٹھی تھی۔ ایک دم صادق آ گیا۔ وہ چپڑاسی ہے اس کے پیچھے یوسفی تھا۔ میں جلدی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

صادق مسکرایا اور ایک کرسی اٹھا کر لے گیا، یوسفی چند لمحے تکتا رہا پھر مڑ گیا۔

شام کو ہوسٹل کے پیچھے گراؤنڈ میں ہم اکٹھے ہوئے چند لمحے خاموشی رہی۔ جیسے بارش سے پہلے ہوا رک جاتی ہے یوسفی آہستہ سے بولا۔

"کل تم کیا کر رہے تھے۔"

" کچھ نہیں" میں مسکرایا، عام سی ہنسی ۔

"تم کو شرم نہیں آتی، صادق نے دیکھا، وہ کیا سوچتا ہوگا۔"

" یوسفی بھائی ! یہ عام سی بات ہے ! وہ عادی ہے!"

"وہ تیری گرل فرینڈ نہیں ہے کل کو تو اس سے شادی کرے گا۔ خیال کر ذرا!"

"اسی لئے تو عام سی بات ہے۔"

پھر جیسے دریا میں موڑ آتا ہے اور شور ہوتا ہے ۔

" عام سی بات ہے، بے غیرتی ہے یہ، تو چپڑاسیوں کے سامنے کیا دکھانا چاہتا ہے۔

مجھے تاؤ آ گیا۔

"یوسفی ! آج تو مجھے بتا، تجھے کیا پریشانی ہے۔ آخر یہ تیرا معاملہ تو نہیں ہے ۔ میں جو کروں میری مرضی میری منگیتر ہے۔

بری کیا لگتی ہے۔ ہ"

سفی بیٹھ گیا۔ اور جاڑے کی آدھی رات کے مینہ کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ا سوچ رہا ہوں

کیوں رو دیا تھا

پر نعیمہ پر، یا اس لمحے پر جو تاخیر سے شروع ہوا۔ اور ہاتھ مدہ کھنوگا۔

اوپندرناتھ اشک
وحید رضا بھٹی

گورمکھی سے براہِ راست ترجمہ

گردباد

اپنی دو بیگھے کی تھوڑی سی اراضی میں ہل چلا کر، بیج بو کر، پانی دے کر رحیم نے سنہری گوشے پیدا کئے۔ اُدھر بیساکھی کے ڈھول بجے اور اِدھر اُس نے درانتی ہاتھ میں لے لی۔ دھڑا دھڑ کٹائی کر کے اُس نے پانچھے کی مدد سے گندم کی ڈھیری لگا دی۔

دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی اور اس میں چمکتے دانے اس کی آنکھوں کے سامنے خوشحال دنوں کی تصویر کھینچ رہے تھے کیونکہ وہ یعنی نجمہ، اس کی شریکِ حیات وہ خود اور اُن کے بچے بھوک سے نو دس ماہ کے لئے چھٹکارہ حاصل کر سکیں گے۔ قرضہ اور لگان کی ادائیگی کے لئے آدھی فصل منہا کر کے اتنی گندم تو بچ ہی جائے گی کہ وہ اور اس کا خاندان چند مہینوں کے لئے اپنا گذارہ کر سکیں۔

پانچھے سے بکھرے ہوئے بھوسے کو اس کی ڈھیری پر پھینکتے ہوئے اُس نے دل ہی دل میں کئی خیالی پلاؤ پکا لئے۔ گھریلو استعمال کے علاوہ وہ ساری گندم بیچ ڈالے گا۔ اور ایک بار امرتسر ضرور جائے گا کتنے برس بیت چکے تھے وہ نجمہ کی ایک بھی خواہش پوری نہ کر سکا تھا۔ اسے یاد آیا نجمہ نے ایک بار تھوڑے سے خوشبودار تیل کی فرمائش کی تھی، لیکن خوشبودار تیل تو رہا ایک طرف وہ تو اسے سرسوں کا تیل بھی بمشکل ہفتے میں ایک بار دے سکتا۔ ایک بار اس نے ہاتھ منہ دھونے والے انگریزی صابن کی فرمائش کی تھی۔ لیکن اُن کے تو کپڑوں تک کو دیسی صابن چھ چھ مہینے گزر جاتے تھے اور پھر ایک بار اُس نے چہرے پر لگانے والی کریم کی فرمائش کی تھی جو گاؤں میں شیشیوں میں بھری جاتی ہے۔ جب وہ دانے چھڑنے گئی تو لالہ اتم چند کی بہو کو اپنے سیاہ مہاسوں والے چہرے کریم لگا کر رگڑتے ہوئے دیکھ آئی تھی اور جب شام کو وہ گھر لوٹا تو وہ رہ نہ سکی۔ وہ ناراض ہو گیا۔

پگلیئے اِن لاٹیوں کی ضرورت تو اُن کو ہوتی ہے جن کے منہ کالے ہوں۔ میری بنّو کا مکھڑا تو ویسے ہی لوٹے کی طرح چمکدار ہے اور پھر اس نے اُسے بغل میں لے کر تان کھینچی تھی

ہائے نی تیرا رنگ نی بنّو!

جیویں کنکاں پکیاں نیں

لیکن بنّو کے چہرے پر ایک بدلی سی پھر گئی تھی۔ تب رحیم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی یہ سب چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کر کے دم لے گا۔

لیکن اس کے ہاں پہلے ایک بچہ ہوا پھر دوسرا اور پھر تیسرا اور وہ بنّو کی ایک بھی فرمائش پوری نہ کر سکا۔ بنّو کی فرمائشیں بھی اب بدل چکی تھیں۔ اپنے لئے تیل صابن یا کریم کی بجائے وہ اب کریم کے لئے کُرتے، نسیم کے تہبند اور شمیم کی قمیص کے لئے شور مچایا کرتی تھی۔ اب اس کی سب سے بڑی حسرت یہ رہ گئی تھی کہ وہ چاندی کے تعویذ بنوا کر اُن پر پیر قلندر علی سے دم کروا کر انہیں اپنے بیٹوں کے گلے میں ڈال دے تاکہ وہ نظرِ بد سے بچے رہیں۔

رحیم نے گندم چھڑنے والے کو نہیں بلایا تھا۔ دو بیگھے اراضی دانے ہی کتنے پیدا کر سکتی تھی؟ پچھلے دو برسوں کا لگان واجب الادا تھا۔ لالہ اتم چند کا قرضہ اس کے سر پر تھا۔ گندم چھڑنے والے کو معاوضہ کے طور پر جس قدر گندم دیتا اُسی کو بیچ کر کیوں نہ وہ بنّو کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرتا؟ اپنی دانست میں اُس نے ٹھیک سوچا تھا۔

دن تپ رہا تھا۔ چاروں طرف آگ برس رہی تھی۔ سامنے نظر نہیں ٹکتی تھی۔ سائے میں بیٹھے مویشیوں کی زبانیں نکلی ہوئی تھیں۔ اُس نے پانچ چھ دانے بھرے اور سر سے اوپر لے جا کر اسے پھٹکنے لگا۔ تب ہی دائیں جانب کچھ دُور سی مٹی اُڑی۔ اس میں مزید گرد شامل ہو گئی اور پھر چکر کھانے لگی۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ یہ چکر لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ گرد وہ بگولہ اسی تیزی اور سرعت کے ساتھ چکر لگاتا، گرد اُڑاتا، آسمان کی اُور اُڑا، اس کی جانب آیا۔ اس تندی کے ساتھ کہ چھاج اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کے کھڑے کھڑے اس کی ڈھیری کی طرف ایک ننھا سا بگولا اُٹھا۔ گندم کے دانے بکھر گئے، بگولہ تھوڑے سے دانوں اور بھوسے سمیت آسمان کی جانب چڑھ گیا۔

اس کی نظروں کے سامنے بگولا اُڑا چلا جا رہا تھا۔ اس میں بھوسے کے تنکے چکر کھاتے آسمان کو چھو رہے تھے۔ رحیم کو لگا جیسے وہ تنکے نہ ہوں بلکہ تیل کی شیشیاں، بچوں کے کپڑے اور تعویذ ہوں۔ لیکن یہ تو پہلا دن تھا۔ دن بھر کئی بگولے اُٹھے، بھوسے کا تنکا تک نہ رہا اور دانے بھی خاصی مقدار میں اُڑ گئے۔

دوسرے روز جب اُس نے کوٹھڑی میں سارے دانے لا پھینکے تو اس کی شریکِ حیات بنّو نے پوچھا "بس —! اور کچھ؟" حسرت بھری مسکان کے ساتھ رحیم نے کہا: "غریبوں کے لئے بگولے ہی جھکڑ ہوتے ہیں!"

جاوید ناصر

وُہ سایہ تھا

میرے بچپن کے کئی سال اپنے چچا کے ساتھ گزرے تھے وُہ فارلینڈ میں ورکر کے عہدہ پر متعین تھے۔ یہ میرے لیے بڑا کٹھن وقت تھا۔ بہت زیادہ کام اور تنہائی سے واسطہ رہتا تھا۔ کھیل اور تفریح کے لیے کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ میرے چچا اتنے سخت گیر تھے کہ فرار ہوکر تنہائی کا حاصل کرنا آہستہ آہستہ میرے لیے خوشی کا باعث بن گیا۔ اگر اتفاقاً کوئی فارغ وقت مجھے مل جاتا تو میں جنگل میں گھس جاتا۔ یا گرجا گھر کا رُخ کرتا اور قبروں اور پگڈنڈیوں کے درمیان گھومتا پھرتا۔ خواب دیکھتا، سوچتا اور اپنے آپ سے بلند آواز میں باتیں کرتا۔

چچا ورکر کی قیام گاہ غیر معمولی طور پر خوبصورت منظر پیش کرتی جو گلیمر دریا کے ساتھ تھی۔ ایک ایسا دریا جو کافی چوڑا تھا اور گولائی میں پھیلا ہوا تھا۔ دن رات اس کی آواز گونجتی رہتی۔ دن میں ایک وقت تو گلیمر شمال کی جانب بہتا اور دوسرے وقت جنوب کی طرف۔ یہ تبدیلی وقت کے مدّوجزر کے ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔ لیکن وہ اپنا سرمدی نغمہ مسلسل گنگناتا رہتا۔ اس کا پانی گرمی اور سردی کے موسم میں اپنے پسندیدہ رستے پر ایک ہی رفتار سے حرکت کرتا رہتا۔

گرجا اور گرجے کا قبرستان ایک ہی پہاڑی پہ واقع تھے اس کی عمارت پرانے طرز کے گرجے کے نمونہ پر بنائی گئی تھی۔ یہ صلیب کی صورت رکھتی تھی۔ گرجے کے قبرستان کی حفاظت کے لیے کسی قسم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس کی قبریں ہمیشہ پھولوں سے خالی ہوتی تھیں۔ لیکن پتھروں کی دیوار سے کچھ اوپر رس بھری کے درخت افراط میں اُگنے کے عادی تھے۔ یہ پھل لمبا اور رس دار ہوتا ہے۔ جو نیچے کی زرخیز زمین سے غذا حاصل کرتا ہے۔ میں ہر قبر اور ہر کتبہ سے واقف تھا۔ میں نے ایسی کئی نئی صلیبیں گڑی ہوئی دیکھیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

کمزور ہو جاتیں یہ قبریں آخر کار کسی طوفانی رات ڈگمگا کر گر جاتیں. جن قبروں پر پھول نہیں ہوتے تھے وہاں گھاس بکثرت اگتی تھی. یہ گھاس تمام قبرستان میں پھیلی ہوئی تھی یہ لمبی اور کھردری تھی کہ میں اکثر اس میں بیٹھ جاتا اور اس میں سے گزرتی ہوا کو سنتا جو انتہائی گھنے گھاس میں سے سائیں سائیں کرتی آتی اور کمر کو چھوتی. اس سی سی کرتی ہوا کے بعد ہمیشہ گرجا گھر کا بادنما اس کے بلند مینار پر جھولتا اور زنگ آلود پرانے وقتوں کے لوہے کی جھنجھلاتی ہوئی آواز گھر کے صحن میں شکایت کرتی ہوئی کانوں میں پڑتی. ایسے لگتا تھا جیسے لوہے کا یہ ٹکڑا لوہے کے کسی دوسرے ٹکڑے پر غصے سے دانت پیس رہا ہو.

جب سیکسٹن کام کر رہا ہوتا تھا میں اس سے ہمیشہ بات چیت کرتا. وہ ایک سنجیدہ مزاج شخص تھا جو شاید زندگی کے کسی لمحے میں مسکرایا ہو. اس کا میرے ساتھ انتہائی دوستانہ رویہ تھا. وہ جب قبر کے لیے زمین میں سے نکال رہا ہوتا تھا تو وہ مجھے خبردار کرتا اور وہاں سے چلے جانے کے لیے کہتا. اس لیے کہ اس وقت اس کی کدال پر ایک نگ کی لمبی ہڈی ہوتی تھی یا کوئی زہر خند کھوپڑی.

اکثر قبروں پر ہڈیوں کے حصے ملتے جو میں ہمیشہ واپس زمین میں دبا دیتا جیسا کہ سکیسٹن نے مجھے بتایا تھا میں کا اس حد تک عادی ہو گیا تھا کہ میں ان انسانی پنجروں کے ملنے پر کسی قسم کا خوف نہ کھاتا اور نہ پس و پیش کرتا. جے کے کونے میں مردے دفنانے کے لیے ایک تہ خانہ تھا جہاں ہڈیوں کے انبار بکھرے پڑے ہوتے تھے میں محرابی جگہ میں گھنٹوں بیٹھا رہتا، کسی چیز پر ٹھک ٹھک کرتا رہتا یا بھربھری ہڈیوں سے فرش پر کئی قسم کے نے بناتا رہتا.

ایک دن مجھے گرجے کے قبرستان میں ایک دانت گرا ہوا ملا. یہ سامنے کا دانت تھا. جو سفید چمکدار رنگت کا اور مضبوط تھا. میں نے یہ دانت بغیر کسی وجہ کے اپنی جیب میں ڈال لیا. میں شاید اسے کسی کام میں لاتا. کوئی نمونہ نے میں استعمال کرتا یا اسے ان بے شمار حیران کن چیزوں میں سے کسی ایک میں ٹانک دیتا. یہ دانت میرے ساتھ مر آ گیا.

یہ خزاں کا موسم تھا. دن جلد ہی ڈھل جاتا تھا. مجھے پکے بعد دیگرے کئی کاموں سے واسطہ پڑا. میرا خیال ہے باورچی خانے میں جا کر دانت پر کام کرنے کے لیے دو گھنٹے کی دیر ہو چکی تھی اس دوران چاند — نصف چاند ہو چکا تھا.

باورچی خانے میں بالکل اندھیرا تھا. اور میں تن تنہا بالکل اکیلا! میں نے بتیوں کو جلانا ضروری نہ سمجھا. چونکہ ان پر مداو میں کیڑے مکوڑے اور پتنگے آ جاتے تھے. میں سٹور کے ایک سوراخ سے روشنی باہر نکالنے کا انتظام کرنے تھا کہ آگ بجھنے لگی اس لیے میں باہر شیڈ سے لکڑی لینے چلا گیا. شیڈ میں اندھیرا تھا جب میں لکڑی ٹٹول کر

تلاش کر رہا تھا۔ میں نے اپنے سر سے صرف ایک انگشت بھر اوپر۔ روشنی جلتی ہوئی محسوس کی۔ میں تیزی سے گھوما لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو مارا۔ لیکن کسی کو محسوس نہ کیا۔ میں نے پوچھا یہاں کوئی ہے لیکن اس کا کوئی جواب نہ ملا۔

میں ننگے سر تھا۔ میں نے اپنے سر سے اوپر اور اس حصے میں ہاتھ بلند کیا۔ جہاں مجھے روشنی کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کے بالمقابل کسی شے کو برف کی مانند سرد محسوس کیا اور میں نے فوراً ہی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی "یہ کتنا حیرت انگیز واقعہ ہے"۔ میں نے دوبارہ سر کے اس حصے کو چھوا لیکن وہ خنکی دور ہو چکی تھی۔ خیال کیا کہ کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جو چھت پہ سے گری ہو اور میرے سر پہ لگی ہو"۔ میں نے ہاتھ بھر لکڑیاں لیں اور باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ چولہا جلایا اور سوراخ سے روشنی برآمد ہونے تک انتظار کیا۔ اس کے بعد میں نے دانت اور فائل کو باہر نکالا۔ اسی وقت کھڑکی کے کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔

میں نے اوپر دیکھا۔ کھڑکی سے باہر آ گئے۔ وہاں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس کا چہرا کھڑکی کے شیشے کے ساتھ چپکا ہوا تھا وہ میرے لیے اجنبی تھا میں اسے نہیں جانتا تھا اگرچہ میں اپنی آبادی کے ہر فرد کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی بڑی سرخ داڑھی تھی۔ ایک سرخ سکارف گلے پہ باندھا ہوا تھا۔ اور ایک . . . . اس کے سر پہ تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت جو خیال نہ آیا تھا اور جو بعد میں میں نے سوچا وہ یہ تھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ کہ اس کا سر اتنی تاریکی میں بھی کیسے اتنا واضح نظر آیا"۔

جب نصف چاند اپنی چاندنی بکھیر رہا تھا تو مکان کے ایک حصے سے مجھے اس کا چہرہ خوفناک حد تک سفید نظر آیا تھا یہ زرد تھا کسی حد تک سپید اور اس کی آنکھیں سیدھی مجھ پر گڑی تھیں۔ ایک منٹ گزر گیا۔ اس کے بعد اس آدمی نے مسکرانا شروع کر دیا جسم میں ناقابلِ بیاں لرزش پیدا کرنے والی ہنسی نہ تھی۔ لیکن اس کا منہ کھلا تھا۔ اس کی آنکھ نے گھورنا جاری رکھا۔ ۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

میرے ہاتھوں میں جو کچھ تھا۔ گر پڑا۔ اور سر سے لے کر پاؤں تک کانپنے لگا۔

میں جیسے ٹھٹھک گیا اور وہ مجھے کرب کی حالت میں ٹکٹکی جمائے دیکھتا رہا۔ دوسرا منٹ بھی گزر گیا۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے پہ گہرا سبز ہوا۔ اس کے بعد گہرا سرخ۔ لیکن مسکراہٹ، وہیں کی وہیں، بدستور موجود تھی۔ میں اپنے ہوش میں تھا۔ میں اپنے بارے میں ہر چیز سے باخبر تھا۔ آگ چولہے کی خالی جگہ میں واضح طور پر مسلسل جل رہی تھی۔ حتیٰ کہ زرد رنگ کا عکس، سامنے کی دیوار کے ساتھ بنی ہوئی سیڑھیوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ دیوار کی دوسری جانب، خادمہ کے کمرے میں کلاک کی ٹک ٹک کی آواز بھی میرے کان سن رہے تھے۔ میں ہر چیز اتنی صاف اور واضح دیکھ رہا تھا کہ . . . . . .

اس کے بعد اس شخص نے کھڑکی کے شیشے کے ساتھ سر نیچا کرنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ نیچے۔ بہت نیچے
آخرکار وہ کھڑکی کے نیچے تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ زمین میں اتر گیا ہو۔ میں اُسے زیادہ نہ دیکھ سکا۔
میں انتہائی خوفزدہ تھا۔ مجھ پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ میں فرش کی طرف کھسک گیا تاکہ دانت تلاش کر سکوں۔
رتے وقت میں نے اپنی آنکھیں کھڑکی پر سے ہٹانے کی جرأت نہ کی۔ کہیں وہ چہرہ دوبارہ ظاہر نہ ہو جائے۔
جب مجھے وہ دانت مل گیا مجھے اسے گرجا گھر کے قبرستان میں لے جانا چاہیئے تھا لیکن ایسا کرنے کی جرأت
ئی۔ میں دیر تک اس طرح تنہا بیٹھا رہا۔ میں حرکت نہ کر سکتا تھا۔ میں نے باہر صحن میں قدموں کی آوازیں سُنیں میں نے
،خادمہ کو کھڑاؤں کے ساتھ کھٹ کھٹ کرتے دیکھا۔ لیکن اُسے بلانے کی ہمت نہ تھی اور اس طرح۔ قدم۔ دُور
تے چلے گئے۔ ایک ابدی لمحہ گزر گیا۔ آگ نے چولہے میں جلنا شروع کر دیا۔ بچاؤ کی کوئی راہ نہ پا سکا۔ اس کے بعد میں نے
ں کو ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے دبایا اور اُٹھا میں نے دروازہ کھولا اور اسے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ رسوئی
باہر۔ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے۔ جہاں وہ شخص کھڑا ہوا تھا۔ جب میں باہر صحن میں آگیا تو اصطبل کی طرف ہوا کی
ں دوڑتا گیا۔ جہاں سے میں اصطبل کے کسی لڑکے کو ساتھ لے کر قبرستان کی طرف جا سکتا تھا۔ لیکن اصطبل میں لڑکے
و نہ تھے۔

اسی دوران کھلے آسمان تلے مجھ میں جرأت آگئی اور میں نے اکیلے قبرستان کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سے
بڑھ کر یہ ہوا کہ میں نے اپنے آپ کو کسی کی گرفت میں محسوس کر کے اپنے آپ کو چھڑانا چاہا۔ اور شاید اس کے
میں نے خود کو اپنے چچا کے بازوؤں میں پایا اور مجبور ہوا کہ انہیں اپنی ساری رام کہانی سناؤں۔ میں تنہا پہاڑی کے
آگیا اور اس وقت وُہ دانت میری جیب میں، ایک رومال میں موجود تھا۔

قبرستان کے دروازے کے قریب میں رک سا گیا میری جرأت اور بہادری نے زیادہ دیر تک ساتھ دینے
نکار کر دیا۔ میں نے دریا کی سرحدی آواز سنی لیکن اس کے علاوہ ہر ایک چیز پر سکوت طاری تھا۔ قبرستان کے
میں کوئی دروازہ وغیرہ نہ تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی گزرگاہ تھی۔ جہاں سے گزر کر آپ قبرستان جا سکتے تھے۔
، بغلی راستے میں ایک طرف ساکت وصامت کھڑا ہو گیا اور اپنے سر کو احتیاط سے اس کے سوراخ میں داخل کیا۔
یکھ سکوں کہ آیا مجھے آگے بڑھنا چاہیئے یا نہیں؟ اس کے بعد اس راستہ پر میں گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ گیٹ سے
ہی دور قبروں کے درمیان، میرا مطلوبہ شخص، سمندری آدمیوں جیسا ہیٹ پہنے کھڑا تھا۔ اس کا اُسی طرح سفید چہرہ
رہ تھی وہ میری طرف مڑا۔ اس نے مجھے اپنی طرف بڑھنے پر مجبور کیا۔ اس طرح کہ میں قبرستان میں داخل ہو جاؤں
۔ میں اسے حکم ہی کہہ سکتا ہوں۔ لیکن میں نے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کی میں وہاں کافی دیر ٹھہرا رہا۔ اور اس آدمی
ت دیکھتا رہا۔ میں نے اس سے درخواست کی۔ التجا کی۔ لیکن وُہ وہیں خاموش کھڑا رہا۔ اس وقت ایسا واقعہ ہوا جس

سے مجھے دوبارہ حوصلہ ہوا میں نے اصطبل کے چند لڑکوں کو ..... کے نیچے اپنے قریب ہی کسی کام کے سلسلے میں نقل و حرکت کرتے سنا بشرمندگی کی اس نشانی نے مجھے جگا دیا اور اُٹھ بیٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ آدمی آہستہ آہستہ غائب ہو جانے کے لیے جنبش میں آیا۔ وُہ چلا نہیں بلکہ قبروں پر سے لہراتا ہُوا گیا۔ اور مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کرتا رہا۔ میں نے گیٹ کے اندر قدم رکھا۔ آدمی نے مجھے اس (گیٹ) کے اور قریب ہونے کے لیے آہستہ آہستہ تھپکی دی۔ میں چند قدم آگے بڑھا اور بالکل ساکت کھڑا ہو گیا۔ میں اور آگے نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اس دانت کو اپنے رومال سے نکالا اور پوری طاقت سے قبرستان میں پھینک دیا۔ اس لمحے چرچ کے مینار میں لوہے کے گھنٹے کی آواز گونجی اور اس کی کاٹتی ہوئی چیخیں میری ہڈیوں اور .... میں گھستی چلی گئیں۔ میں ایک دروازے سے، نشیب کی طرف سے گھر کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ میں .... میں آیا۔ تو انہوں نے دیکھا کہ میرا چہرہ برف کی مانند سفید تھا۔

اس واقعہ کو کئی برس گزر چکے ہیں۔ مگر اب بھی یہ واقعہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ میری آنکھیں اب بھی اپنے آپ کو، قبرستان کے دروازے میں گھٹنوں کے بل جھکے ہوتے، اس آدمی کو سرخ داڑھی سمیت دیکھنے کا منظر دیکھتی ہیں۔ میں اس کی عمر تک کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اس کی عمر بیس برس بھی ہو سکتی ہے اور وہ چالیس برس کا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس بارے میں میں نے اُس وقت خیال نہیں کیا تھا۔ جب میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اس کے متعلق میں نے بعد میں سوچا۔ لیکن میں اب بھی نہیں جانتا کہ اس کی عمر کے متعلق کیا کہنا چاہیئے۔

وہ آدمی اکثر شام کے وقت آیا۔ اور کئی بار رات کے وقت بھی۔ وُہ کھلے منہ کے ساتھ نمودار ہوتا جس کی وجہ سے اس کا خالی دانت نظر آتا اور وہ پھر غائب ہو جاتا۔

برف باری کا موسم آ گیا۔ اور میں اس دانت کو زمین میں دفن کرنے کے لیے قبرستان میں نہ جا سکا اور وہ آدمی بڑے بڑے وقفوں کے ساتھ مسلسل تمام موسم سرما آتا رہا۔ میرا شدید خوف دور ہو گیا۔ مگر اس نے میرے دن نہایت ناخوشگوار بنا دیئے۔ ناقابلِ فراموش حد تک برے اور ناخوش۔

ان دنوں کئی بار اس خیال سے بڑی تھوڑی خوشی ہوئی کہ میں اپنے آپ کو گلا دریا میں سیلاب کے وقت گرا کر ذہنی اذیت سے نجات پا سکتا ہوں۔

پھر بہار آگئی۔ اور وہ آدمی بھی اس کے ساتھ ہی غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی؟ ..... نہیں! مکمل طور پر نہیں۔ لیکن تمام موسم گرما کے لیے۔ اگلی سردیوں میں وہ دوبارہ ظاہر ہو گا۔ وہ صرف ایک مرتبہ آیا اور پھر کافی طویل مدت تک آنے سے باز رہا۔ اس سے ملاقات کے تین برس بعد میں فارلینڈ کو ایک سال کے لیے چھوڑ گیا۔ جب میں واپس لوٹا تو میں پختہ ذہن کا مالک ہو چکا تھا اور اپنے آپ کو نوجوان آدمی محسوس کرتا تھا۔ میں نے چچا ڈکر کی رہائش گاہ میں زیادہ عرصہ قیام نہ کیا بلکہ اپنے والدین کے ساتھ ٹھہرا۔

ایک دن موسم خزاں میں جبکہ میں سہ پہر کے وقت سویا ہوا تھا۔ ایک سرد ہاتھ میری پیشانی پر رکھا گیا۔ میں نے اپنی
نکھیں کھولیں اور اپنے بستر کے قریب ہی کرسی میں ایک آدمی کو بیٹھے ہوئے پایا۔ میں کمرے میں اکیلا ہی نہیں سو رہا تھا۔
ـہ دو بھائی بھی میرے ساتھ (ہی سو رہے) تھے۔ میں نے کسی کو نہ جگایا جب میں نے اپنی پیشانی پر سرد ہاتھوں کا دباؤ
حسوس کیا۔ میں نے اپنے ہاتھ بلند کر کے کہا "یہاں سے چلے جاؤ"

جب آدمی کو ساکن بیٹھے ہوئے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو آگے پیچھے جھلانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ
ساتھ وہ بلند ہونا شروع ہو گیا۔ حتیٰ کہ وہ جھولتے جھولتے چھت سے جا لگا۔ جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ اور زیادہ
نے نہیں جا سکتا۔ وہ اٹھا اور بے جان قدموں کے ساتھ فرش پر سے تیرتا ہوا سٹور کی طرف گیا، جہاں وہ غائب ہو گیا۔

وہ اس سے قبل مجھ سے اتنا قریب نہیں ہوا تھا۔ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں
ـ کی نگاہیں خالی خالی سی تھیں اور جھکی جھکی سی۔ اس نے میری طرف دیکھا تھا لیکن ایسے جیسے کہ سیدھی مجھ میں سے گزر
ہوں، بہت دور کسی دوسری دنیا میں۔ میں نے غور کیا کہ اس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ اس نے اپنے اعضاء کو حرکت نہ دی
ـ، وہ مسکرایا تک نہیں۔ جب میں نے اس کے ہاتھ کو اپنی پیشانی سے پرے ہٹایا۔ اور کہا "چلے جاؤ" اس نے
ـنی سے اپنا ہاتھ پرے ہٹا لیا تھا۔ اس دوران تمام وقت وہ میرے بستر کے قریب بیٹھا رہا اور اپنی آنکھیں تک
جھپکیں۔

چند مہینوں کے بعد جب کہ موسم سرما آ چکا تھا۔ میں اپنا گھر چھوڑ چکا تھا۔ میں ... ایک سوداگر، مسٹر ڈبلیو کے
کچھ مدت مقیم رہا۔ میں نے مسٹر ڈبلیو کو دکان اور دفتر کے کام میں مدد دی۔ یہاں مجھے اس آدمی سے آخری بار ملنا
ـدر میں لکھا) تھا۔

میں ایک شام اپنے کمرے میں گیا، لیمپ کو روشن کیا، اور کپڑے اتارے معمول کے مطابق اپنے جوتے کو
ـر رہا تھا کہ انہیں لڑکے کو صفائی کے لیے دے دوں۔ جوتوں کو ہاتھوں میں لیے میں نے دروازہ کھولا۔ وہاں وہ
ـیار میں کھڑا تھا، بالکل میرے سامنے! وہ سرخ داڑھی والا آدمی!

میں جانتا تھا کہ میرے ملحقہ کمروں میں افراد موجود ہیں اس لیے میں قطعاً خوفزدہ نہ ہوا۔ میں کچھ واضح الفاظ میں منمنایا۔
ـ"کیا تم پھر آ گئے ہو"

اس کے بعد اس آدمی نے اپنا منہ کھولا اور مسکرانے لگا۔ اس نے کوئی زیادہ کربناک تاثر پیدا نہ کیا۔ لیکن اس بار
ـن کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ گمشدہ دانت اپنی جگہ پر واپس آ چکا تھا۔

شاید اُسے کسی شخص نے زمین میں ڈال دیا تھا۔ یا کئی سال گزرنے کی وجہ سے یہ بھربھرا ہو چکا تھا اور اس قابل ہو چکا
ـہ کہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتے۔ جہاں سے اسے علیحدہ کیا گیا تھا۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بہتر جانتی ہے۔

ہے۔

آدمی نے اپنا منہ بند کر لیا۔

لیکن میں پھر بھی راہداری میں کھڑا رہا۔ وہ مڑا اور سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر وہاں غائب ہو گیا جہاں سیڑھیاں خ
ہوتی ہیں۔ میں نے اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ کئی سال گزر گئے۔

یہ آدمی ۰۰۰۰۰۱

وادیٔ موت کا پیغام!

ناقابلِ بیان خوف کا مالک تھا۔ جو اس نے میرے بچپن میں پیدا کیا اور جس نے مجھے بہت نقصان پہنچایا
میں نے اس کے بعد بھی اسے ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھا۔ ایک سے زیادہ عجیب و غریب منظر دیکھا۔

لیکن کسی اور نے مجھے اس سے زیادہ بھرپور طور پر متاثر نہیں کیا! شاید۔ اس نے مجھے صرف نقصان ہی نہیں
پہنچایا۔ ایسا واقعہ مجھے کئی بار پیش آیا۔ میں یقین کر سکتا تھا کہ اس کی ذات ان وجوہات میں سے ایک وجہ ہے جو
بدولت میں اپنے دانت بھینچ کر رکھتا ہوں اور اپنے آپ کو چست اور ہوشیار محسوس کرتا ہوں۔ بعد کی زندگی میں
یقیناً اس بات کی ضرورت تھی۔

(ماخوذ)

شاعری

فیض احمد فیض

With dusk lit up pale-faced lights
In endless rows along lanes & alleys
And from their beggar-bowls rained forth
The frustrations of this crowded city.
Far off
Beyond the horizon's panorama
The signposts of past grandeur
Began to bedim
While right before the eye
A shadow clinging to a wall's shade
In the hope of a fellow shadow
Speechlessly, to his wont
Holds in his breath
The preface of time's callousness
And a stragner
Dodging these lights and ghostly shadows
Bends back to his dreamless den!

IKRAM AZAM

اس نظم کا انگریزی ترجمہ اکرام اعظم نے کیا ہے

پیرس

دن ڈھلا، کوچہ و بازار میں صف بستہ ہوئیں
زرد رُو روشنیاں
ان میں ہر ایک کے کشکول سے برسیں رِم جھم
اس بھرے شہر کی ناسودگیاں
دور پس منظرِ افلاک میں دھندلانے لگے
عظمتِ رفتہ کے نشاں
پیش منظر میں
کسی سایۂ دیوار سے لپٹا ہوا سایہ کوئی
دوسرے سائے کی موہوم سی اُمید لیے
روز مرّہ کی طرح
زیرِ لب
شرحِ بے دردیٔ ایّام کی تمہید لیے
اور کوئی اجنبی
ان روشنیوں سایوں سے کتراتا ہوا
اپنے بے خواب شبستاں کی طرف جاتا ہو

فیض احمد فیض

آج پھر درد و غم کے دھاگے میں
ہم پرو کر ترے خیال کے پھول

ترکِ الفت کے دشت سے چن کر
آشنائی کے ماہ و سال کے پھول

تیری دہلیز پر سجا آئے
پھر تری یاد پر چڑھا آئے

باندھ کر آرزو کے پلے میں
ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

قتیل شفائی

مٹا کر بے درو دیوار کر دے ۔۔۔ مرے مولا مجھے مسمار کر دے

نہیں ہے مجھ میں کوئی بھی سلیقہ ۔۔۔ مجھے اس دور کا فنکار کر دے

انا کی لذتوں سے بے خبر ہوں ۔۔۔ کسی کا حاشیہ بردار کر دے

نہیں مجھ کو سمجھ اچھے بُرے کی ۔۔۔ قبیلے کا مجھے سردار کر دے

میرے اجداد نے جن کو سنوارا ۔۔۔ اب اُن راہوں کو ناہموار کر دے

بُری شے ہے یہ رسمِ دوست داری ۔۔۔ مجھے احباب سے بیزار کر دے

نہیں لگتا مرا دل جھونپڑوں میں ۔۔۔ بڑا سا اک محل تیار کر دے

زمین و زر کی خواہش، زن کی خواہش ۔۔۔ مری سب خواہشیں بیدار کر دے

ٹکوں اوپر تو گر جاتی ہے پگڑی ۔۔۔ بہت نیچا مرا معیار کر دے

تری مخلوق کو میں نے ڈبویا ۔۔۔ مگر تو میرا بیڑا پار کر دے

بہت بالواسطہ لکھے قصیدے
مجھے اب شاعرِ دربار کر دے

رئیس امروہوی

شاعرِ عہدِ نو

وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ شاعرِ دل نوازِ ہستی
وہ محرمِ سوز و سازِ ہستی
وہ پردہ کشائے رازِ ہستی
وہ نازشِ ہست و نازِ ہستی

جو فکر و نظر پہ حکمراں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ جس کا پیامِ زندگانی
وہ جس کا مقامِ جاودانی
مغلوب ہے جس سے کامرانی
مسحور ہے جس سے نوجوانی

جو زندہ و باقی و جواں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ جس کا مذاق شاعرانہ
وہ جس کا مزاج خسروانہ
وہ جس کی گزر قلندرانہ
وہ جس کی نظر پیمبرانہ

جو روحِ حیاتِ جاوداں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ فاتحِ ممکناتِ تخلیق
وہ خالقِ کائناتِ تخلیق
صورت گرِ وارداتِ تخلیق
میزانِ مضاعفِ قواتِ تخلیق

جو مطربِ غیب کی زباں ہے

احمد فراز

عشق کا شہر بھی دیکھو کیا نیرنگ بھرا ہے
اب دیوانے کا دامن بھی سنگ بھرا ہے

اب یہ کھلا ہے کتنی پرانی دشمنیاں تھیں
یاروں میں ہر ایک کا خنجر زنگ بھرا ہے

میرے بدل جانے پر تم کو حیرت کیوں ہے
میں نے یہ بہروپ تمہارے سنگ بھرا ہے

قتل گہوں کا رستہ اوروں سے کیا پوچھیں
لہو کے چھینٹوں سے اک اک فرسنگ بھرا ہے

بولتی آنکھوں کی چپ بھی قاتل ہے، لیکن
اس کے سکوتِ چشم میں جو آہنگ بھرا ہے

کچھ تو فرازؔ اپنے قصے بھی ایسے ہی تھے
اور کچھ کہنے والوں نے بھی رنگ بھرا ہے

محشر بدایونی

اُٹھائے بوجھ گراں سر میں راستے میں تھا
سُلگ رہا تھا مرا گھر میں راستے میں تھا

یہاں تو خاک بھی دامن میں اب نہیں باقی
ہوائے گُل سے تو بہتر میں راستے میں تھا

برائے شامِ غریباں تھا جب چراغ بدل
تو خود اُجالوں سے باہر میں راستے میں تھا

سزا اسی کی ہو شاید یہ میری غرقابی
کہ چاہتوں کا سمندر میں راستے میں تھا

ثمر ملا تو رفاقت کا حق بھی تم بھولے
تبر چلے تو برابر میں راستے میں تھا

یہ اب کُھلا ہے جب اپنی جگہ نہیں ہوں میں
بہت گراں کوئی پتھر میں راستے میں تھا

بلندیوں نے کہاں پستیوں کا ساتھ دیا
پرندے دوشِ ہوا پر، میں راستے میں تھا

سنہری شام تھی، کچھ دل میں ولولے تھے ابھی
کدھر گئے وہ پرندے جو اُڑ رہے تھے ابھی

گرج چمک بھی عجب ہے ذرا سی پھوار کے بعد
بکھر گئے جو اُجالوں کے سلسلے تھے ابھی

کیا نہ غنچہ کفوں کا بھی دھیان پانی نے
جو سیپیاں ہی کناروں پہ چن رہے تھے ابھی

لہو لہو سروپا ۔ زخم زخم دوش و کمر
سنبھل گئے کہ سنبھلنے کے حوصلے تھے ابھی

ہوا کی زد پہ شکستہ دلانِ بے ساماں
نکل چلے کہ نکلنے کے راستے تھے ابھی

ہمارے آتے ہی کیسی اُٹھیں یہ دیواریں
پسِ غبار کئی اور قافلے تھے ابھی

فارغ بخاری

اپنے دریا کی پیاس

صداقتوں کے جنوں کا
ہم ایسا آئینہ ہیں
جو اپنے عکسوں کا مان کھو کر
شکستگی کا عذاب سہنے میں مبتلا ہیں
ہم ایسے طوفاں گزیدہ پیڑوں کا ماجرا ہیں
جو ٹوٹتے، پھوٹتے، بچھڑتے سے
اپنے اعصاب کے بکھرنے کی آس میں ہیں
جو تشنہ لب ساحلوں کی مانند
اپنے دریا کی پیاس میں ہیں
جو وحشتِ امکاں کی ہواؤں کے
برگزیدہ۔ مگر دریدہ لباس میں ہیں

میں کس منزل کا راہی ہوں

نہ دوزخ مجھ کو بھاتی ہے
نہ جنّت راس آتی ہے
یہ کس کی یاد ہے جو
ہر گھڑی مجھ کو ستاتی ہے
یہ کس شمشیر کی بّرش ہے
جو چرکے لگاتی ہے
یہ کیسی روشنی کی
اسقدر ہے جستجو مجھ کو
لئے پھرتی ہے کس کی
آرزو یہ کو بہ کو مجھ کو
ڈبونے کو بلاتی ہے
یہ کیوں ہر آبجو مجھ کو
میں کس منزل کا راہی ہوں
میں کس سچائی کی زندہ گواہی ہوں

باقی صدیقی

یہ کر پھول، شرارے دیکھے
ری قدرت کے نظارے دیکھے

یاس میں جیسے اُمیدوں کی لَویں
دیر تک رات ستارے دیکھے

ی رحمت کی گھڑی جب آئی
منے اپنے کنارے دیکھے

تیرا ایک ایک کرم یاد آیا
جب بلکتے ہوئے دھارے دیکھے

ا نے اللہ کو دیکھا باقی
نے اللہ کے پیارے دیکھے

زنجیرِ نفس دل کو رہائی نہیں دیتی
کیا جلتی ہوئی آگ دکھائی نہیں دیتی

دنیا کے لئے بھول گئے اپنے خدا کو
کیا قبر کی آواز سنائی نہیں دیتی

قارون کی اولاد ہے یہ قوم زر و سیم
پربت تو بڑی چیز ہے رائی نہیں دیتی

دنیا کی ہے کیا بات اِدھر اور اُدھر اور
انساں کو تو یہ زیب برائی نہیں دیتی

کیا اپنے سوا کوئی نظر آئے نہ ہم کو
کیوں دل کو سکوں بات پرائی نہیں دیتی

جو مانگنا ہے مانگئے اللہ سے اپنے
تسکین کبھی دنیا کی گدائی نہیں دیتی

احساسِ سفر سے یہ گرہ کھلتی ہے باقی
منزل کی خبر آبلہ پائی نہیں دیتی

وزیر آغا

وہ پرندہ ہے کہاں شب کو چہکنے والا
رات بھر نافۂ گُل بن کے مہکنے والا

ٹکڑا ابر تھا۔ بس دیکھنے آیا تھا مجھے
کوئی بادل تو نہیں تھا وہ چھلکنے والا

راکھ میں، آنکھ میں پھولوں پہ کسیلی شب میں
بے ضرورت بھی تو چمکا ہے چمکنے والا

کس کی آواز میں ہے ٹوٹتے پتوں کی صدا
کون اِس رُت میں ہے بے وجہ سسکنے والا

چاند ہو، روز بدلتے ہو، تمہارا کیا ہے
میں سمندر ہوں اب تک نہ بہکنے والا

پی لیا؟ لوٹ گیا؟ خشک ہوا؟ کچھ تو بتا
کیا ہوا آنکھ سے آنسو وہ ٹپکنے والا

تُو بُھلا دے گا کسی روز مجھے جانتا ہوں
نقش تیرا بھی نہیں بھول نہ سکنے والا

سلیم احمد

باغباں مجھ پہ توجہ کی نظر رکھتا تھا
میں تہی شاخ نہ تھا برگ و ثمر رکھتا تھا

میری آشفتہ مزاجی کی تو کچھ بات ہے اور
وہ تو باہوش تھا دنیا کی خبر رکھتا تھا

شب نوردانِ محبت کے اُجالے کے لئے
میں چراغوں کو سدا جانبِ در رکھتا تھا

اب سفینے کو مرے راہِ سفر کون دکھائے
ڈوبنے والا ستاروں پہ نظر رکھتا تھا

کیا خبر تھی کہ اندھیرے میں بھٹک جائے گا
وہ ستاروں کو سرِ راہ گزر رکھتا تھا

کم عیارانِ زمانہ نے مری قدر نہ کی
میں تہی دست سہی نقدِ ہنر رکھتا تھا

منظور عارف [1]

آ، مرے ساتھ پار کر دریا
آج تو ہے کمر کمر دریا

سیپیں کر ساحلوں پہ یوں نہ بکھیر
اپنی تہہ میں چھپا گہر، دریا

عمر کٹتی نہ کاش رو رو کر
کاش بہتا نہ عمر بھر دریا

دل بھی اشکوں میں کھو گیا ہے کہیں
لے گیا ساتھ میرا گھر دریا

پھیر کر رُخ بنا ہی لیتا ہے
کوہساروں میں رہگذر دریا

اپنی ہستی پہ کتنا نازاں تھا
کھو گیا بحر میں مگر دریا

آنکھ سے دل میں اب اُتر آؤ
آرزو منتظر ہے گھر آؤ

سب نظر کا فریب ہے نہ ڈرو
کام ہمت سے لو، گزر آؤ

تم بھی تنہا ہو، میں بھی ہوں تنہا
کیوں نہ مل کر کریں بسر آؤ

تم کہ تخلیق میرے ذہن کی ہو
جسم و جاں لے کے بھی نظر آؤ

آج آؤ کہ دل ہے مشکل میں
چاہے پھر تم نہ عمر بھر آؤ

تم سا موتی کسی صدف میں نہیں
بحر کی تہہ سے اب اُبھر آؤ

---

[1] افسوس صد افسوس!
منظور عارف اب ہم میں نہیں ہیں، یہ غزلیں مرحوم بطورِ خاص نیرنگِ خیال کو دے گئے تھے۔

احمد ظفر

یہ موسم ہجر کا موسم

لہو شاخِ الم سے رس رہا ہے
پھول روتے ہیں
جدائی کتنی تصویریں دکھاتی ہے
ترے آنے کا موسم جا چکا ہے
پھر نہ آئے گا
ترے جانے کا غم بھی آئینہ ہے زرد پتوں کا
خزاں نے ہاتھ جیسے رکھ دیئے ہیں میرے ہونٹوں پر
میں اپنے آپ میں کھویا ہوا چپ چاپ چلتا رہتا ہوں
کہ اب تو آہٹیں بھی زلزلہ آثار ہیں میری سماعت میں
بصارت ریزہ ریزہ ہو گئی ہے
چاند بکھرا ہے

مسافت کی صعوبت دوش پر کہسار ہو جیسے
صدا کے دائروں سے دور گویائی
کسے آواز دوں
میں اجنبی ہوں اپنے جیسے آشناؤں میں
سیہ ابرِ رواں ، وحشت کا دریا
یاس میں ڈوبی ہوئی آنکھیں
وہی منظر دکھاتی ہیں
جسے میں دیکھ کر مرتا رہا برسوں
وہی منظر کہ تو مجھ سے گلے مل کر بچھڑ جائے
یہ دل کا داغ ہی رختِ سفر ہے
کون سمجھائے ۔ مجھے اب کون سمجھائے

احمد ظفر

دوری سے مرے دل میں کئی پھول کھلے ہیں
بچھڑے ہوئے کچھ لوگ تصور میں ملے ہیں

سینے میں کوئی داغ لئے پھرتا ہے وہ بھی !!
اس چاند سے کب چاک مرے دل کے سلے ہیں

تصویر اک ایسی میرے البم میں لگی ہے
کہ بات کوئی میں نے تو لب اس کے ہلے ہیں

پھولوں کے کسی کنج میں جو چھوڑ گئے تھے
آئینۂ شبنم میں وہی لوگ ملے ہیں

کچھ دوست جو بیٹھے ہیں یہاں میری صفوں میں
دشمن سے بھی در پردہ کئی بار ملے ہیں

رہتا تھا ظفر جس کا طرفدار زمانہ
اس پھول کے ہونٹوں پہ زمانے کے گلے ہیں

خلش بہار کی دل میں رہی مدام خلش
گلِ خزاں نے بھی لکھی ہے میرے نام خلش

کسی کی جنبشِ لب سے کھلے ہیں دروازے
کسی کے گیسوئے عنبر فشاں کا دام خلش

وہ مجھ سے کہہ نہ سکا دل کی بات میں اس سے
کہ گفتگو تھی ہماری خیال خام خلش

رفاقتوں میں گزاری تھی زندگی جس نے
تمام ہو نہ سکی اس کی نا تمام خلش

کسی نے اپنا ہو میکدہ بنا ڈالا !!
کسی کے ہاتھ میں آئی ہے جام جام خلش

یہ عمر بھر کی مسافت بتا رہی ہے ظفر
سحر کسی کی خلش ہے کسی کی شام خلش

رئیس فروغ

یہ سناؤ کہ اپنے پرائے ہوئے
ملو سارے ملال چھپائے ہوئے

ڈھلی رات کی باس ہواؤں میں ہے
چلو آنکھوں میں خواب سجائے ہوئے

نئی کلیوں کی چاپ فضاؤں میں ہے
مری پلکوں سے تال ملائے ہوئے

کسی کنج میں تھی کوئی شاخ سمن
مرے نام کے پھول کھلائے ہوئے

کوئی چاندنی تھی کسی راستے میں
مرے لئے آس لگائے ہوئے

کئی طرح کے لوگ ہیں پچھلے پہر
مرے حرف کی چھاؤں میں آئے ہوئے

کوئی صبح تلک مرے ساتھ رہے
سبھی اپنے چراغ جلائے ہوئے

کوئی جاگیریں، کوئی زر چاہے
دل پیار بھرا پیکر چاہے

دھرتی سے لپٹ کر سو جانا
لہروں میں گھرا ساگر چاہے

جو کبھی برسوں میں نہ ہو
اُس بات کو جی اکثر چاہے

بادل میں رہے متوالی سی
جو چاند کے دل میں گھر چاہے

اس رات میں پاگل ہو جانا
تو لاکھ نہ چاہے پر چاہے

اپنی تو کوئی چاہت ہی نہیں
بس یہ ہے کہ جو دلبر چاہے

خورشید انصاری فرید آبادی

پیری بھی آئے گی کبھی کب یہ گمان تھا! جب ہم جوان تھے تو زمانہ جوان تھا

اُن کے مکاں کے پاس جب اپنا مکان تھا دونوں طرف سے سارا جہاں بدگمان تھا

آساں گو خرد کا بہت امتحان تھا مجبور تھے کہ پائے خرد درمیان تھا

میری جبیں کا خون جہاں اب ہے رونما پہلے وہاں تمہارے قدم کا نشان تھا

دل پر گراں نہیں تری نامہربانیاں یادش بخیر تو بھی کبھی مہربان تھا

اب کس کو باغباں سے شکایت کا حوصلہ وہ پھول چن لیا جو گلستاں کی جان تھا

وہ پاس رہ کے دور رہے اہلِ درد سے یہ امتحانِ عشق بڑا امتحان تھا

صحرائے بے گیاہ میں سائے کا کام کیا بس اک درخت تھا جو مرا سائبان تھا

باغِ بہشت جس سے نکالا گیا ہمیں شاید ہمارے رتبے سے کم وہ مکان تھا

فرہاد و قیس و وامق و رانجھا کہاں گئے ہم اہلِ عشق کا بھی بڑا خاندان تھا

میں نے زباں جو کھولی تو دنیا خموش ہے سب محوِ گفتگو تھے تو میں بے زبان تھا

پیری میں کائنات سے ٹکرا کے گر گیا میں ناتواں تھا اور زمانہ جوان تھا

خورشید میں نے صبح سے تا شام طے کیا
اک رہ گزار میرے لئے آسمان تھا

حنیف فوق

ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

(نذرِ اقبال)

عظمتِ آدم کا بُت ٹوٹا پڑا تھا خاک پر
پھر کسی بُت گر کی صنعت سے ہے معراجِ نظر
آدمیت حاصلِ تخلیق و کارِ آگہی
آدمیت سے فروزاں خاکدانِ زندگی

پھر گراں خوابی سے چین و مصر و ایران کو نجات
خسروی پھر تیشۂ فرہاد سے کھاتی ہے مات

خاک کے پتلوں کی پھر پرواز ہے سوئے قمر
رفتہ رفتہ اُٹھ رہے ہیں سب حجاباتِ نظر
کارگاہِ شیشہ گر ہے اور سنگِ آرزو
عرصۂ آفاق سے آگے ہے ذوقِ جستجو

چہ زمان و چہ مکاں یک لحظہ و یک گام ہے
گردشِ افلاک بھی دورِ زمیں کا نام ہے

فضل حق

مرگِ رُومیل

(فیلڈ مارشل رومیل کو ہٹلر نے زہر دلوانے کے بعد سرکاری اعزاز سے دفن کیا تھا۔ عرلجین رومیل کا آبائی گاؤں ہے جہاں وہ دفن ہوئے۔ موسم خزاں کا تھا۔)

موجِ بہار، دشت میں، خاکِ گراں میں گم
وادی ہے عرلجین[1] کی سکوتِ خزاں میں گم

دامان کوہسار کا گرجا ہے دم بخود،
بام و در وصلیب ہیں، مرگِ اذاں میں گم

اِک سمت، ایک نعش گلوں میں لدی ہوئی
تابوت میں پڑی ہے خود اپنے بیاں میں گم

کچھ دور موجِ درد میں ڈوبی شکستہ دل
مریم[2] کھڑی ہے گردشِ ہفت آسماں میں گم

رومیل کی شریکِ محبت حیات میں
مرگِ رمیل پر ہے نہ جانے کہاں میں گم

طوفانِ داستاں ہے یہ لب کھولتی نہیں
ہر بات جانتی ہے مگر بولتی نہیں

پوچھا یہ ایک شخص نے "اے پیکرِ الم
شوہر ترا مقامِ شجاعت میں محترم

کیا مرض تھا، علاج نہ کیوں کارگر ہوا
المانیہ پہ کس طرح ٹوٹا یہ کوہِ غم

اٹھی وہ اشکِ صبر میں بھیگی ہوئی نگاہ
بولی وہ کر کے اپنے خیالات کو بہم

المانیہ کی روح کو لاحق ہے وہ مرض
جو لا دوا ہے، دفترِ اقوام کی قسم

ناسورِ آمریت آدم سے الاماں
ہے المنی کے بخت میں مرگِ زبوں رقم

وہ قوم جو خود اپنی حفاظت نہ کر سکے
ممکن نہیں کہ واں کوئی عزت سے مر سکے

---

[1] رومیل کا آبائی گاؤں اور مدفن

[2] رومیل کی بیوہ

صمد انصاری

ہر ساعتِ جمال کو اِک نام چاہیئے
عمرِ رواں کو صورتِ ایام چاہیئے

محمل سراب ہو گئے صحرائے نجد کی
اب حلقۂ وفا کو نیا نام چاہیئے

لیل و نہار بند ہیں ناموسِ وقت میں
تزئینِ روزگار کو الزام چاہیئے

دامن پہ جس کے فصلِ بہاراں رقم نہ ہو
برگِ خزاں کو ایسا گل اندام چاہیئے

حرفوں سے لوگ اپنی شبیہیں تراش لیں
اتنا تو حسنِ شعر میں ابہام چاہیئے

صورت سے اپنی اس کو تربیت نصیب ہو
آغازِ کائنات کو انجام چاہیئے

مسلک وہی ہے جس کو زمانہ کرے شعار
اثباتِ رہگذر کو رہِ عام چاہیئے

جس میں صمدؔ سنوار لیں خود کو نئی شبیں
اتنی سی روشنی تو سرِ شام چاہیئے

آنکھوں کی نمی زخم کا پرچم نہیں بدلا
مدت ہوئی گھر کا مرے موسم نہیں بدلا

ڈھلے ہیں نم صبح نے کتنے نئے سورج
کرنوں سے مگر قطرۂ شبنم نہیں بدلا

مایوس نہیں ابر مرا کشتِ وفا سے
مانا کہ ابھی شیوۂ آدم نہیں بدلا

شاید کہ اُسی راگ پہ چھنکے نئی پائل
اِک بار بھی جس راگ کا سرگم نہیں بدلا

ہوتا ہے جراحت سے جراحت کا مداوا
بدلے ہیں کئی زخم پہ مرہم نہیں بدلا

تھی گرچہ پرو بال میں تاثیر ہوا کی
افلاک سے پرواز کا نیلم نہیں بدلا

بدلے تو بہت رات نے زینت کے قرینے
گیسوئے شبِ تار کا ریشم نہیں بدلا

جو رنگ تھا شیشے میں وہی عکس تھا اس کا
پتھر کا صمدؔ رشتۂ باہم نہیں بدلا

رشید قیصرانی

بحضور قائدِ اعظمؒ

عظیم بابا!
میں اپنے سائے کی اوٹ میں کب سے چپ کھڑا ہوں
کسی کرن نے جو حال پوچھا
تو میں کہوں گا
عظیم بابا مجھے مہکتا گلاب دے کر چلا گیا ہے
میں اس کی خوشبو سمیٹتا ہوں
میں رنگ و بُو کا پیام لے کر
بدلتی رُت کے عجیب سنگم پہ آ گیا ہوں
نظر کے آگے خزاں گزیدہ برہنہ پیڑوں کا ایک جنگل اُگا ہوا ہے۔
جو میری مٹی سے نم کی سوغات مانگتا ہے
میں اپنے ہاتھوں میں اپنا تازہ گلاب لے کر
خود اپنے سائے کی اوٹ میں کب سے چپ کھڑا ہوں
عظیم بابا!
میں بے بصر ہوں، میں بے خبر ہوں۔
مجھے نظر دے، مجھے خبر دے۔

راسخ عرفانی

دل ہی دل میں بکھر رہا ہوں میں
بحرِ جاں میں اتر رہا ہوں میں

پہلے خوشبو تھا گرد باد ہوں اب
دشتِ غم سے گزر رہا ہوں میں

یہ بنامِ سخن عرق ریزی
قطرہ قطرہ نتھر رہا ہوں میں

ٹوٹے غنچے لگا کے شاخوں سے
رنگ خوابوں میں بھر رہا ہوں میں

ایک چھوٹے سے گھر کی حسرت میں
عمر بھر در بدر رہا ہوں میں

کسی عقوبت کدے کا قیدی ہوں
جی رہا ہوں نہ مر رہا ہوں میں

بارِ گِراں اٹھا کے کاندھوں پہ
سہل تر سفر رہا ہوں میں

ہو کے اپنی ہی ذات میں راسخ
اپنے سائے سے ڈر رہا ہوں میں

سید مظفر حسین نقوی

غم اب آسان کچھ ایسا ہے کہ مشکل بھی نہیں
حسن وہ حسن نہیں دل ہے تو وہ دل بھی نہیں

داغ روشن ہیں اسی رنگ سے لیکن مرا دل
کیا کہیں اب کہ حریفِ مہِ کامل بھی نہیں

مئے رنگیں سے ہے آلودہ قبائے تہذیب
کون برپا کرے ہنگامہ کہ محفل بھی نہیں

اب وہ طوفان بھی نہیں جو سرِ ساحل پہنچے
سر کو ٹکرائیں کہاں اب لبِ ساحل بھی نہیں

موسمِ درد میں بے کیفیِ جذبات نہ پوچھ
صحنِ گلشن میں کہیں شورِ عنادل بھی نہیں

ایسے حالات میں کیا ہلیں ترے دیوانے
ترے قدموں کی صدا شورِ سلاسل بھی نہیں

حسن افسانۂ پارینہ محبت بے سود
زندگیِ فرسودہ کا رزق کوئی حاصل بھی نہیں

مضطر اکبرآبادی

چاند کے دل میں بھی برپا رات طغیانی ہوئی
چاندنی نے بھی تجھے دیکھا تو دیوانی ہوئی

لاکھ رم خوردہ سہی پھر بھی ہے پہچانی ہوئی
تیری خوشبو کا بدل کب رات کی رانی ہوئی

گردشِ ماہ و سال کے چہرے پہ تھے اتنے غلاف
آئینے کو بھی مری صورت پہ حیرانی ہوئی

حق ادا تیری رفاقت کا نہ مجھ سے ہو سکا
اے غمِ دوراں بہت تجھ سے پشیمانی ہوئی

کون جانے کس قدر آنسو بہائے رات نے
کیا خبر پھولوں پہ کتنی شبنم افشانی ہوئی

شام ہی سے برق و باراں کا تو برہم تھا مزاج
تیرا دھیان آتے ہی شب کچھ اور طوفانی ہوئی

درد کی خوشبو سے دل بے انتہا مانوس ہے
درد کی خوشبو ہے مضطرؔ جانی پہچانی ہوئی

اب مجھے جرمِ سخن کی یہ سزا دی جا[ئے]
نطق پر مُہرِ خموشی کی لگا دی جا[ئے]

وقت اگر کم ہے تو پھر اسکی یہی صورت [ہے]
اور کچھ کام کی رفتار بڑھا دی جا[ئے]

ہر طرف پھیلتی ظلمت سے لیا جائے خ[راج]
ہر نفس بڑھتی خموشی کو صدا دی جا[ئے]

چھوٹتی ہے کسی گیسو سے جو خوشبو ہر [...]
چاندنی بھی اسی خوشبو میں لبا دی ج[ائے]

کھینچ دی جائے مرے گرد تغافل کی د[یوار]
غم گساری کی یہ دیوار گرا دی ج[ائے]

ان گنت زخم عطا جس نے کئے ہیں [...]
سوچتا ہوں کہ اسے کتنی دعا دی [جائے]

سر برہنہ ہے خدا جانے یہ کب [...]
زندگی کو بھی تو اب کوئی ردا د[ی جائے]

میجر جنرل محمود الحسن

حسن کی ضد کا کیا ٹھکانہ ہے
عشق ہر رنگ میں یگانہ ہے

خوب آرام سے گذرتی ہے + نہ چمن ہے نہ آشیانہ ہے
ان کو شاید منا کے لے آئے + دل مجھے چھوڑ کر روانہ ہے
ڈھونڈتے ہو سکون دنیا میں! + ہائے کیا سہوِ عارفانہ ہے
کس محبت کی بات کرتے ہو + اب تو بدلا ہوا زمانہ ہے
اُن کی آنکھوں میں اور کیا ہوگا + اہتمام شراب خانہ ہے
زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں + یہ جو اک دکھ بھرا افسانہ ہے
شیخ تیرے خدا سے میرا بھی + رسم و آداب غائبانہ ہے

آنکھ محمود کیا ہٹے گی اب
اس سمندر میں ڈوب جانا ہے

دل جن کا بے قرار نہیں، آنکھ نم نہیں + وہ اور لوگ ہوں گے یقیناً وہ ہم نہیں
اب کیوں ہمارے حال پہ لطف و کرم نہیں + پہلے سے تم نہیں ہو کہ پہلے سے ہم نہیں
اب کوئی اضطراب نہیں کوئی غم نہیں + دل مبتلائے کشمکش بیش و کم نہیں
وہ دل نہیں جو سوزِ محبت سے فیض یاب + کچھ بھی ہو سنگ و خشت سے ہرگز وہ کم نہیں
دیکھے ہیں ہم نے راہِ محبت میں جس قدر + اتنے تو تیری زلف میں بھی پیچ و خم نہیں
دنیا ہمارے درپئے آزار ہے تو ہو + تم ہو ہمارے ساتھ تو پھر کوئی غم نہیں
کیا پوچھتے ہو حال دلِ بے قرار کا + اتنا ہے دوستو آج کہ بس آج ہم نہیں
ممکن نہیں کہ منزلِ مقصود پا سکیں + وہ جن کے راہبر ترے نقشِ قدم نہیں

میجر جنرل محمود الحسن

آنسو جو مرے دیدۂ خونبار سے نکلے + گوہر تھے کہ دریائے غمِ یار سے نکلے
پھر اُن کو ٹھکانہ نہ ملا کوئی جہاں میں + وُہ لوگ کہ جو کوچۂ دلدار سے نکلے
تابندہ مہ و مہر ہوئے اُن کی ضیا سے + جلوے جو ترے عارض و رُخسار سے نکلے
آجائیں مرے کلبۂ احزاں میں اگر آپ + انوار کا دریا در و دیوار سے نکلے
تسکین کی خواہش ہے اگر اُس کو تو پہلے + دل کشمکشِ اندک و بسیار سے نکلے
مائل بہ کرم ہو جو سروشِ نگہِ ناز + گنجینۂ ذو معنی مرے اشعار سے نکلے

اُس در پہ بھلا قصدِ صدا کون کرے گا
جو بات ہے دل میں وُہ ادا کون کرے گا

آئینِ وفا تُم نے مرتّب تو کیا ہے
پابندیٔ آئینِ وفا کون کرے گا

ظاہر ہے کہ سب ہم کو خطاوار کہیں گے
پر کہہ کے بھلا اُن کو خفا کون کرے گا

وعدے تو محبّت کے بہت تُم نے کئے ہیں
یہ بھی کبھی سوچا ہے وفا کون کرے گا

اب کوئی نہیں عشق کے مفہوم سے واقف
کُوچہ میں ترے حشر بپا کون کرے گا

مانوس نہیں لوگ رہ و رسمِ جنوں سے
اب تم ہی کہو چاک قبا کون کرے گا

محمود عطا کر کے مجھے دردِ محبت
کہتے ہیں کہ اس دُکھ کی دوا کون کرے گا

اطہر راز

سفر اپنی ذات کے اندر

(۱)

میں اپنی ذات سے آگاہ کیوں نہیں اب تک
یہ امتیازِ من و تو کا سلسلہ کیا ہے
میں فکر ہوں تو مجھے فکرِ روز و شب کیوں ہے
میں ابتدا کی خبر ہوں تو یہ خبر کیا تھی
یہ میرے ذہن میں کیوں میں ہی میں کے نعرے ہیں
میں خواہشوں کا قفس ہوں تو یہ قفس کیا ہے
میں ایک تارِ نفس ہوں تو یہ نفس کیا ہے
(ذات)

(۲)

مجھے تلاش ہے جس کی کہیں وہ میں تو نہیں
یہ کون ہے جو خیالوں کے پیش منظر میں
تصورات کے طوفان میں رقص کرتا ہوا
مرے شعور کی وادی میں گھومتا ہے کبھی
کبھی یہ خوف کے ساحل سے گھورتا ہے مجھے
کبھی سرود کی وادی میں گنگناتا ہے
کبھی حباب کی چنچلاہٹ سے مسکراتا ہے

(۳)

ازل سے کس نے تغیر کا ساز چھیڑا ہے
ہر آن رنگ بدلتے ہیں بادلوں کے ہجوم
ہر آن روپ بدلتی ہیں چاندنی راتیں
تغیرات کا مسکن ہے مادے کا وجود
اگر فریبِ تبسم میں مبتلا ہے شعور
نظر گداز لطافت بکھیرتی ہے فضا
دلوں میں ساز مسرت کا چھیڑتی ہے فضا
(تغیر)

(۴)

خرد شریعتِ فطرت کو جاننے کے لئے
تمام عالمِ امکان میں بھٹکتی ہے
یہ زندگی کے مسائل تو جانتی ہے مگر
کبھی یہ رازِ حقیقت سمجھ نہیں پاتی
یہ کیا ستم ہے کہ میرا سمندِ ذہن کبھی
مرے وجود کی گہرائی میں نہیں جاتا
مری حیات کا مقصد سمجھ نہیں پاتا
(فرد)

(۵)

اگر یہ ذات کسی اور کی امانت ہے
وہ اور کون ہے کیا ہے کہاں ہے کیسا ہے
وہ جس کے خوف کا سایہ مرے ضمیر میں ہے
یہ عکس خوف تصور کی جھیل میں جس کو
ذرا سی دیر میں وحشی گمان کی لہریں
ہجوم جوش میں آ کر بگاڑ دیتی ہیں
مرے سکون کی دنیا اجاڑ دیتی ہیں

سارا آندرے
مرفانہ عزیز

موضوعِ سخن

پوروچ میں بیٹھے ہوئے دوست سبھی
چسکیاں بھرتے ہوئے کافی کی
چھیڑ بیٹھے ہیں وہی ذکرِ وفا
اور موضوعِ سخن
چاہِ ذقن
زلف و قبا
رنگ سیزاں کے مگر نقش پکاسو کے بھلے لگتے ہیں
چاند سے جیسے در و بام بھلے لگتے ہیں
عورتیں ہوتی ہوں گی
آپ نے دیکھی ہیں کبھی ——؟
نامِ خدا
یہ باتیں تو سرِ شام بھلی لگتی ہیں ——
اور باہوں میں چلی آئیں تو برفاب بدن
یوں پگھلتے ہیں
جوں مرمریں خوابوں کا اُجالا جیسے
دودھیا چاندنی راتوں میں بکھر جاتا ہے
سیب کے ریشمی پھولوں کے تلے
یک بیک گونجا کسی نرم ہنسی کا جھرنا
شال سُلجھاتے ہوئے ویرا بولی
میرا محبوب شگال ہے ——

جس کے موہوم نقوش
ایک بے نام تصور کی طرح
خواب بھرتے ہیں اماوس کی سیہ راتوں میں
یہ بہک جاتے گی اس شام انہیں باتوں میں
گفتگو فن پہ ہو یا دہر کی زیبائی پر
اینجلو پر کہ پکاسو کی فسوں زائی پر
ایلیٹ پر ہو کوئی بات
کہ تہذیب کی رعنائی پر
'یہ تمباکو کی مہک' ——
پف اُڑاتے ہوئے پیٹر نے کہا ——
ایذرا پونڈ کی نظموں کی طرح
یاد دلاتی ہے مجھے کوئی سہانی خوشبو
سوچئے ظن بات بڑی ہے لیکن
آج لگتے ہیں فضاؤں کے کھنچے سے ابرو
اور اس دیدۂ پُرنم کا ہے مقسوم یہی
پیرِ حسن کوئی سرِ شام دکھائی دیتا
دور ساحل سے چلی آتی ہے پھر سرد ہوا
ایک جرعہ ہی سہی پیچ برانڈی دیتا

[illegible] sleeping [illegible] شاگال chagall ... Peach Brandy پیچ برانڈی

آفتاب اقبال شمیم

لو حسرتِ ناداری ہم دل سے نکال آئے
سکّے جیب میں جو تھے رستے میں اُچھال آئے

سر کہنیوں پہ ٹیکے، بیٹھے ہیں پیا سے ہم
منہ بند شرابوں میں شاید کہ اُبال آئے

تاریک مناظر نے آنکھوں کے نگر لوٹے
ہم منزلِ خواہش سے بے نقدِ خیال آئے

برسیں مری آنکھوں پر جب ٹوٹ کے دوپہریں
شاید مرے اندر کے سایوں کو زوال آئے

ہم خوار ہوئے کتنے انکار کے صحرا میں
سوچوں میں بگولے سے بن بن کے سوال آئے

جو جان کے گوہر سے قیمت میں زیادہ تھی
لو طاقِ زیاں میں ہم وہ چیز سنبھال آئے

نہیں کہ آگ تری انگلیوں کے مَس میں نہیں
پکارِ خون کی شاید مری ہوس میں نہیں

کروں زبانِ غزل میں اُسے ادا کیوں کر
وہ راز جو کہ اشاروں کی دسترس میں نہیں

ملیں جو قربتیں اُس شہر زاد کی تو کھُلا
کرن کا لونِ گُل کا رَس کے رَس میں نہیں

یہ فصلِ گُل ہے، مگر اے ہوائے آوارہ
وہ خوشبوؤں کا ترنّم ترے نفس میں نہیں

تضاد اور تصادم قدم قدم پہ ہے
جو آج بس میں ہے وہ کل ہمارے بس میں نہیں

وہی اندھیرے اُجالے کا رزق ملتا ہے
کہ رنگ کوئی نیا روز کے قفس میں نہیں

آفتاب اقبال شمیم

ریت کی پیاس

آؤ کہ مِل کے رات کا کالا نشہ پئیں
اِک پَل کی بے پناہیاں
بے انت آسماں
ہم کو دبوچ لیں
دیکھا ہوا کا بند کواڑوں کو کھول دے
نکلیں حویلیوں سے نظر بند لڑکیاں
آیات منظروں کی اُتر آئیں آنکھ پر
رونق عروج کی ہو فنا کی فصیل پر
پھر اُس کے بعد فرش پہ آئینہ گر پڑے
یہ کیا کہ زینہ زینہ اُترتے رہیں صدا
پچھلے مکاں میں
وہ روشنی کے چیتھڑے پہنے ہوئے کھڑی
عریانیوں کی ڈھکی ہوئی بھیک دے رہیں
اک خواب سے سراب کا جلوہ انڈیل دے
صحرا کی اذیک میں

حفیظ آذر

واپسی

رہگزاروں پہ برسی ہوئی چاندنی
جانے کب منجمد ہو گئی
اور میں
تیرے قدموں کی آہٹ پہ
کانوں کو اپنے لگائے ہوئے
فرشِ راہ دیدہ و دل کیے
جانے کب سو گیا
موت نے اپنی باہوں میں لے کر مجھے
مجھ کو تصویرِ غم اک حسیں جان کر
میرے رخسار و لب کے
ہزاروں ہی بوسے لئے
اور میں — بے خبر
جانے کب سو گیا
رہگزاروں پہ برسی ہوئی چاندنی
جانے کب منجمد ہو گئی
میرے اپنے لہو کی طرح —!

انور محمود خالد

بچھڑنے والے! ان آنسوؤں کا خیال رکھنا
مری امانت مرنے لئے یہی سنبھال رکھنا

شکایتیں بھی کسی تعلق کے واسطے تھیں
یہ ربط ٹوٹا تو جی میں کیسا ملال رکھنا

اُجاڑ صبحیں، اُداس شامیں مرے لئے ہیں
تمہیں مبارک، جلال رکھنا، جمال رکھنا

خزاں کے ہاتھوں لباسِ فصلِ بہار اُترا
ستم گروں کے نہ آگے دستِ سوال رکھنا

کبھی اُسے جاں کی سلطنت سے الگ نہ کرنا
عطا کیا ہے جو دل نے منصب بحال رکھنا

کھلے سمندر میں مچھلیوں کی غذا نہ بننا
پلٹنا منظور ہو تو مٹی میں جال رکھنا

ندا یہ مقتول ماں کے قلبِ حزیں سے آئی
سنبھل کے پاؤں زمیں پہ میرے لال رکھنا

یوسف حسن

زہر بہت جھڑ کا رگوں میں نہ کہیں جم جائے
پھر نمو جوش پہ آئے کہ یہ موسم جائے

شاخیں تکمیلِ خزاں کے لئے بے تاب، مگر
خشک پتوں کی دعا ہے کہ ہوا تھم جائے

میری بستی کے در و بام تو جاگ اُٹھے ہیں
مگر آنکھوں سے کہاں خواب کا عالم جائے

تیری دنیا میں فقط خواہشِ جنت لے کر
میں جہاں جاؤں مرے ساتھ جہنم جائے

استقامت بھی ہوئی ایک قیامت یوسفؔ
جو بھی آئے مرے کہسار سے برہم جائے

ثمینہ راجہ

اصحابِ کہف

آؤ کہ ہم بھی سو جائیں
ایک میں ہوں اور اِک تُو
ایک آرزوؤں کا
یہ سگِ وفا پیشہ
غار ڈھونڈ کر کوئی
نیم سرد تاریکی
اوڑھ کر زمانے کی
سنگدل نگاہوں کی
دسترس سے ہم تینوں
اور دور ہو جائیں
زندگی کے میلے سے
حادثوں کے ریلے سے
چھپ کے آج کھو جائیں
نیند سے کے قرنوں کی

جب وجود کے اندر
ایک روشنی جاگے
آنکھ جب کھُلے تو ہم
اپنی اپنی ہستی کے
کیفیت شناسا ہوں
اور غار سے باہر
زندگی نئی صورت
اوڑھ کر تھرکتی ہو
ظالموں کے سِکّوں کو
شہر بھر کہے کھوٹا
بس یہ فرق ہو، ہم سے
ہر کوئی شناسا ہو
ہم کو سب ہی پہچانیں

طاہر پرواز

بں وحشتوں کو مقدر بنائے پھرتا ہوں
صلیبِ دوش پہ اپنی اٹھائے پھرتا ہوں

بجا کہ پاؤں میں بیچارگی نے زخم کئے
قدم قدم پہ بہاریں لٹائے پھرتا ہوں

ہ اک عجیب ملاقات تھی کہ اس کے بعد
بں اپنے آپ کو اب تک بھلائے پھرتا ہوں

بزمِ مے ، نہ حسیں آنچلوں کی محفل سے
بے خیال سے خلوت سجائے پھرتا ہوں

یب عزم ہے طاہر، وہ تمنا میں
ساحلوں کو سمندر بنائے پھرتا ہوں

شمشاد نازلی

وُہ ساغرِ لب ساغرِ الماس نہیں ہے
کیوں جھوٹ کہوں میں کہ مجھے پیاس نہیں ہے

اِس پیار سے باہوں میں سمیٹا ہے کسی نے
اَب ذات کی تنہائی کا احساس نہیں ہے

ہم منتظر اس شخص کے تا عمر رہیں گے
جس شخص کے آنے کی کوئی آس نہیں ہے

ہم ہی تو نہیں اَور بھی خوش چہرہ بہت ہیں
کیا عشق تمہیں اَور کہیں راس نہیں ہے

وُہ شخص گوارا بھی نہیں ہے مجھے لیکن
ہوتی ہوں پریشان بھی جب پاس نہیں ہے

جب زلف مہک اُٹھی ہماری تو عجب کیا
گلشن کے کسی پھول میں گر باس نہیں ہے

ہیں تو سہی کچھ لوگ طبیعت کے موافق
اِس شہر کا ماحول اگر راس نہیں ہے

تخفیف کر اس میں سے حیا کو مری، پھر دیکھ
ہے یا مرا دل شوق کا عکاس نہیں ہے

ہم نازلی اس کو ورقِ دل پہ لکھیں گے
وُہ نام حسیں درخورِ قرطاس نہیں ہے

سلطان رشک

دُور سے دیکھ رہے تھے مرے احباب مجھے
اپنے ہمراہ بہا لے گیا سیلاب مجھے

استعارا ہوں نئے عہد میں گمشدگی کا
بھولتے جاتے ہیں ماضی کے حسیں خواب مجھے

میں کہ ساحل کا تمنائی تھا لیکن اب تو
اپنے آغوش میں لیتا نہیں گرداب مجھے

وہ ترے قرب کی خوشبو کہ بیاں ہو نہ نہاں
وہ حقیقت بھی نظر آتی ہے اک خواب مجھے

میں تو صدیوں کا تنہا سا ہوں مگر یہ تو بتاؤ
کیوں یہ ماحول نظر آتا ہے بے خواب مجھے

تیری ہستی تو اسی چشمِ گریزاں میں ملا
کیا ملا رشکؔ ترے منبر و محراب مجھے

بکھرے ہوئے اُس شہر میں چہرے بھی بہت تھے
اظہار کے انداز پہ پہرے بھی بہت تھے

ہم بے سروساماں تھے جاتے تو کدھر
دریا جو تھے اطراف میں گہرے بھی بہت

ہم سے بھی رہ و رسم نبھاتا رہا لیک
اُس چہرۂ شب تاب کے چہرے بھی بہت

اِک عدل ہی نایاب تھا بس شہر میں تیرے
منصف بھی تھے، مجرم بھی کٹہرے بھی بہت

کچھ ہم بھی تھے ناواقفِ آدابِ تمد
کچھ خواب زمانے کے سنہرے بھی بہت

یہ بات الگ ہے کہ سرِ دار رہا کون
حامی تو ترے شہر میں میرے بھی بہت تھے

سفرنامہ

انشائیے

سیاسی شکوہ و جوابِ شکوہ

معاشرے کی ناہمواریوں ، بے اعتدالیوں کی طنزیہ نشاندھی ، ضمیر کے فن کی ایک امتیازی خصوصیت ہے ۔ ان کی معرکہ انگیز نظم ـــــ سابق منسٹر ـــــ اسی قبیل کی تخلیق ہے۔ یہ نظم اولاً مجید لاہوری کے ہفت روزہ "نمکدان" کراچی میں شائع ہوئی ۔ کئی برس کے بعد ۲۳ جنوری ۱۹۷۱ء کے روزنامہ امروز لاہور میں چھپی ۔ اس پر ایک باذوق "سابق منسٹر" نے اس کا منظوم جواب "امروز" میں چھپوایا ۔ ہم "امروز" سے یہ دونوں نظمیں جو ایک نوع کے سیاسی شکوہ و جواب شکوہ کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ یہاں نقل کر رہے ہیں ۔

(س ۔ ب)

سید ضمیر جعفری

کرسی نہ دفتر فائل نہ افسر لیڈر نہ ووٹر
جھنڈا نہ موٹر

جلسہ میلا ریلا نہ ریلا
ڈنگل نہ منگل چیلی نہ چیلا
اتری جو پالش دھیلے نہ دھیلا
ودی سے ردی موٹر سے ٹھیلا
سنگی نہ ساتھی بالکل اکیلا

چند لاکھ برتے جی لاکھ ترسے نکلے نہ گھر سے
پبلک کے ڈر سے

کالر نہ جھالر ڈالی نہ ڈالر
یادوں کا البم خوابوں کا مندر
کوٹھی کے اندر

ہاتھوں میں کھرپا ٹانگوں پہ نیکر
بوئے چقندر کھائے ٹماٹر

سابق منسٹر
اللہ اکبر اللہ اکبر

—(۲)—

کیف بہاراں سیل نگاراں انبوہ یاراں
آغوش کاراں

وہ کج کلاہی وہ عرش جاہی
آگے کلکٹر پیچھے سپاہی
وہ بے نیازی وہ کم نگاہی
رخ پر سفیدی دل میں سیاہی
پھرتے ہیں پیدل ظل الٰہی
ہر شے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاپ گھٹنس کیا مرغ و ماہی

اک تازیانہ ٹوٹا فسانہ جام مغانہ
خواب شبانہ

یہ نظم حرف وحکایت جیسے مقبول کالم میں جو روزنامہ "احسان" لاہور میں شائع ہوتا ہے، چھپی تھی "حرف وحکایت" مصنف کا نوٹ بھی درج ذیل ہے۔

ہمارے ہاں کے بعض "سابق منسٹر" تو ماشاءاللہ مانے ہوئے لیڈر ہیں بلکہ بہت کم لیڈر ہیں جو "سابق منسٹر" نہیں ہیں، مگر جن سابق منسٹروں کے بے مثال مزاحیہ شاعر سید ضمیر جعفری نے خامہ فرسائی کی ہے، وہ کوئی اور ہی مخلوق ہیں کہ منسٹری سے الگ ہونے کے بعد سیاسی لحاظ سے اللہ کو پیارے ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ضمیر صاحب نے "سابق منسٹر" کے عنوان سے یہ نظم "چند قابل قدر مستثنیات سے معذرت کے ساتھ" چھاپی تھی۔ آج کے سیاسی پس منظر میں یہ نظم بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی اس لیے حاضر ہے۔

جاگا زمانہ بھاگا چھندر
کوٹھی کے اندر
ہاتھوں میں کھرپا ٹانگوں میں نیکر
بوئے چقندر کھائے ٹماٹر
سابق منسٹر
اللہ اکبر اللہ اکبر

(۳)

شعلہ فراے آہو ادائے صبح چہ صبحے
شامے چہ شامے

گندم چھپا لے ڈالر بھگا لے
عزت لٹا کر دولت کما لے
کانٹے بچھا کر پھولوں کو جالے
ملت بٹھا کر کوٹھی اٹھا لے
راگوں کو مارے ناگوں کو پالے
اڑسٹھ بھتیجے چھبیس سالے
سانجھے کی ہنڈیا بارہ مسالے
کس کس کو ٹوکے کس کس کو ٹالے
طوطا بھی کھا لے مینا بھی کھا لے
دل بھی حوالے "تن" بھی حوالے
پبلس بھاٹا چاول نہ آٹا ودڈں کھاٹا
موٹر سے ٹاٹا

طرہ نہ کلغی طغرل نہ سنجر
فرِ فریدوں چوبِ سکندر
کوٹھی کے اندر
ہاتھوں میں کھرپا ٹانگوں میں نیکر
بوئے چقندر کھائے ٹماٹر

سابق منسٹر
اللہ اکبر اللہ اکبر

(۴)

شعلوں کا خرمن پھولوں کا دشمن رنگوں کا مدفن
خوابوں کا مدفن

وہ خشک سالی وہ تر نوالی
کھیتوں پہ زردی چہروں پہ لالی
چاندی کا چمچہ سونے کی پیالی
دن کو دوالہ شب کو دوالی
بحثیں فروعی جھگڑے خیالی
دست و گریباں پالی سے پالی
نعرے سے نعرہ گالی سے گالی
چمچے سے چمچہ تھالی سے تھالی
پتے سے پتہ ڈالی سے ڈالی
گوری سے گوری کالی سے کالی
جھومر سے جھومر بالی سے بالی
مصروفِ خدمت سرکارِ عالی
کرتے ہیں گھر میں بیٹھے جگالی
بدھو کے بدھو خالی کے خالی

گوبھی اگائے گملے سجائے مرغے لڑائے
بچے کھلائے
بچوں کا ابا بھابی کا دیور بیوی کا شوہر
امی کا چندر
کوٹھی کے اندر
ہاتھوں میں کھرپا ٹانگوں پہ نیکر

جواب آں غزل

—— (۱) ——

جی! بندہ پرور　　کرسی نہ دفتر؟　　فائل نہ افسر؟
جھنڈا نہ موٹر؟

تم ہو سخنور　　ہم ہیں مچھندر
افسوس یہ ہے　　دیکھا نہ جھک کر
اپنی کہو کچھ　　بیاں ہے تونگر
جو کچھ کہا ہے　　خوب اور بہتر
لیکن برادر　　اس سے بھی بڑھ کر
اب تو لٹے ہیں　　لشکر کے لشکر
جب تھے منسٹر　　سابق منسٹر
گم تھے مجاہد　　چپ تھے قلندر
اللہ اکبر!　　اللہ اکبر!

—— (۲) ——

ہے شاخسانہ　　حسب زمانہ
کوئی شکاری　　کوئی نشانہ
کل تھا خزانہ　　آج ایک آنہ
کل ایک خرمن　　آج ایک دانہ
کیا لازمی تھا　　ڈھونڈو بہانہ
اس وقت کہتے　　گر یہ فسانہ
پھر ہم سمجھتے　　تم کو دلاور
جب تھے منسٹر　　سابق منسٹر
اللہ اکبر!　　اللہ اکبر!

—— (۳) ——

یہ جو کہا ہے　　از خیر خواہی
وہ کج کلاہی　　وہ عرش جاہی
بالکل بجا ہے　　بانکے سپاہی
جیسا ہو قائد　　ویسے ہی راہی
دیکھو تو مڑ کر　　اے میرے راہی
غماز ہوں گے　　خود نقش پاہی
جب آئے اٹھ کر　　کوٹھی کے اندر　　تب تم نے مارے　　یہ تیر و نشتر
اللہ اکبر!　　اللہ اکبر!

—— (۴) ——

"گندم چھپانا　　ڈالر بھگانا"
"عزت لٹانا　　دولت کمانا"

چند روز پہلے ہم نے اس کالم میں سید ضمیر جعفری کی ایک نہایت شگفتہ نظم "سابق منسٹر" کے عنوان سے پیش کی تھی۔ افسوس ہم یہ عرض کرنا بھول گئے کہ ہم نے یہ نظم چند برس پہلے کے اخبار "نمک دان" کی ایک اشاعت سے حاصل کی تھی یعنی یہ نظم حال کی تخلیق نہیں ہے۔ شاید اسی لیے سابق منسٹر نے اپنی نظم کے دوسرے بند میں طنز کیا ہے کہ اگر شاعر ماضی میں یہ بات کہتا تو ہم اسے دلاور مانتے۔ سو وضاحتاً عرض ہے کہ وہ نظم ماضی ہی میں کہی گئی تھی۔ بہرحال ہمارے ایک "باہوش" شاعر دوست کے توسط سے ایک سابق منسٹر نے ہمیں اس نظم کی جوابی کارروائی بھجوائی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس نظم کو شائع کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے تاکہ دونوں طرف کے جذبات سامنے آسکیں۔ انہوں نے یہ وضاحت بھی روی ہے کہ جس طرح پہلی نظم میں استثنار کی طرف اشارہ ہے اسی طرح اس نظم میں بھی مستثنیات ہو سکتے ہیں۔ سو یہ نظم حاضر ہے۔

یہ چاہیئے تھا اس کو جانا
جس کے نہ ہوتا پہلے بھی کھانا
پھتا وہ مزدور یا بے ٹھکانا
اپنا تو تھا ہی اونچا گھرانا
لاکھوں ہزاروں صرف آب و دانہ
دولت سے ہوگا دولت کمانا
کیا سادگی ہے آتا نہ جانا
ہر دو منوّر رشکِ گلِ تر ہم سے بچھڑ کر آنکھیں چرا کر
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

اس وقت کیا ہوں؟ موچی کہ مالی
در پر ہزاروں اب بھی سوالی
ریڈر کے ریڈر پالی کی پالی
ہولی ہے دن کو شب کو دیوالی
اب بھی مزارع لاتا ہے ڈالی
باقی وہی ہے چہرے کی لالی
جاری ہے لنگر پہلے سے بڑھ کر رہنا منسٹر قندِ مکرر
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

(۵)

کیا تھا منسٹر اک شے نرالی؟
پبلک کی جوتی مٹی کی پیالی
اس نے پہن لی اس نے اٹھا لی
یا پھر قبا تھی اک ڈھیلی ڈھالی
تھی جس کے اندر کانٹوں کی جالی
اتری بدن سے گو وہ دوشالی
اب بھی خراشیں ہیں کالی کالی
اب یہ بتائیں سرکارِ عالی

(۶)

کچھ بھی بڑوں کچھ بھی نہ کھاؤں؟
بیکر نہ پہنوں ننگا نہاؤں؟
مطلب تمہارا کیا ہے؟ بتاؤں
بن جاؤں شاعر اور گنگناؤں
مانگوں جو مے چلّے نہ پاؤں
پیسے کی سوچوں اور سر کھجاؤں
دل کو کھرچ کر دقی کو بلاؤں
اچھی نہیں ہے تمیاؤں میاؤں
پھر ہیں الیکشن کرتب دکھاؤں

کس کو اٹھاؤں کس کو بٹھاؤں؟
بھائی کو چھوڑوں سالے کو لاؤں؟
مجبوریاں ہیں خود کیوں نہ آؤں؟
جانِ برادر، پیارے سخنور، دکھلائے تیور؟ سابق منسٹر
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

فکر تونسوی

مولوی افکار و حوادث

راوی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں اخبار "زمیندار" لاہور کے دفتر کے قریب سے گذر رہا تھا۔ وہاں عوام کا ایک بے پناہ
ہجوم دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اور ایک بوڑھے سے "عوام" سے پوچھا۔ یہ کیا بات ہے، کیا بات ہوئی؟"
بوڑھے عوام نے جواب دیا "انگریز نے مولوی افکار و حوادث کو گرفتار کر لیا ہے" ان دنوں خلافت تحریک اپنے عروج پر تھی۔
حضرت مولانا سالک مرحوم اخبار زمیندار میں "افکار و حوادث" کے نام سے مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ اور انگریز سامراج کی مضحکہ خیز پالیسیوں کا
مذاق اڑایا کرتے تھے۔ سامراج چونکہ طبعاً ہنسوڑ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ سالک سے چڑ گیا اور سامراج کی چڑ کا مطلب ہوتا ہے
سلاسل ——— چنانچہ اس نے ہیومر (HUMOUR) کو زنجیر پہنا دی ——— خلافت تحریک میں لفظ "مولوی" دراصل ایک باغیانہ
علامت سمجھا جاتا تھا چاہے وہ فقہ حدیث پر عبور کامل رکھتا ہو۔ چاہے مزاحیہ کالم لکھ کر سامراج پر چھینٹے اڑاتا ہو۔ عوام کی نگاہ میں
"مولوی" ہے۔ یہی سبب تھا کہ عوام عبدالمجید سالک کو نہیں جانتے تھے بلکہ "افکار و حوادث" کو جانتے تھے۔ کیونکہ "افکار و حوادث"
سالک صاحب کی شخصیت کا مکمل پرتو تھا۔ فنی معراج کا یہ وہ مقام ہے جہاں نام کوئی مرتبہ نہیں رکھتا۔ کام ہی نام کا مفہوم بن جاتا ہے
——— اور سالک صاحب کو یہ مقام حاصل تھا کہ انگریز نے عبدالمجید سالک کو گرفتار نہیں کیا بلکہ "مولوی افکار و حوادث" کو گرفتار
کیا کیونکہ انگریز کا خیال تھا کہ دراصل "مولوی افکار و حوادث" ہی ایسا خوفناک آدمی ہے جو ہنسی کے پردے میں ہماری گُلّی اڑاتا
ہے۔ اور یہ کالا ہندوستانی لوگ ہر روز ہماری "گُلّی" کر انگلیاں چاٹ چاٹ کر پڑھتا ہے۔ اور "مولوی افکار و حوادث" کو اپنی
روح کی آواز سمجھ کر پسند کرتا ہے۔ اس لئے "مولوی افکار و حوادث" کو گرفتار کر لو۔ عبدالمجید سالک کو گرفتار نہ کرو کیونکہ
وہ تو بے چارا بے ضرر سیدھا سادہ مرنجان مرنج انسان ہے۔
اس واقعہ سے ہی سالک صاحب کی بے پناہ عوامی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سالک صاحب کا
نہیں بلکہ ان کے مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" کی مقبولیت کا ——— سالک شاید پہلا سنجیدہ انشاپرداز تھا۔ جس نے غالباً ہندوستان کے
اردو جرنلزم میں روزنامہ "مزاحیہ کالم" کی سیاسی اور سماجی اہمیت کو محسوس کیا، لہذا وہ اس کالم کا خالق بنا، موجد بنا، بنیاد بنا۔ اس کی
ٹیکنک اور فن کے تمام اہم پہلوؤں کی طرح ڈالی۔ اور مستقبل کے کالم نگاروں کے لئے ایک ایسی گراؤنڈ ورک روڈ تیار کی۔ جس پہ

اب وہ آنکھیں بند کر کے چلے جا رہے ہیں ——— اور اردو جرنلزم کو یہ ایک ایسی دین تھی جس نے اُردو جرنلزم کا سر اتنا بلند کر دیا کہ لندن کا اخبار "پنچ" بھی ہمیں حیرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ "مولوی افکار و حوادث" کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھا۔ (اور شکر ہے رب کریم کا کہ نہیں تھا) لیکن عوام میں اُس کی مقبولیت لیڈروں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ہر روز صبح لوگ اس مولوی کے دو شعروں کے لئے اتنے مضطرب رہتے جیسے کئی عقیدت مند سورج کا درشن کئے بغیر پانی تک نہیں پیتے۔ یہ مقبولیت لیڈروں کے نصیب میں کہاں؟ لیکن ہر روز سورج کی طرح طلوع ہونا کوئی مذاق نہیں ہے۔ سالک تھا جو بہا گیا۔ نہ جانے اس کے اندر کونسا تخلیقی سرچشمہ تھا کہ "افکار و حوادث" میں ہر روز وہی شگفتگی تازگی اور رسیلا پن ہوتا تھا۔ میں خود گذشتہ چھ برس سے اخبار میں مزاحیہ کالم لکھ رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ کس طرح ہر روز لکھنے وقت ہڈیاں چٹختی ہیں۔ اخباروں کی پالیسی، حکومت کی زنجیریں، آدابِ مجلس کا ڈنڈا، کوڈ کی سرزنش اور سب سے زیادہ یہ کہ معیار پر بھی آنچ نہ آنے پائے۔ اس ستم گرانیِ پیچ و خم میں بھی ہنسنا ہنسانا واقعی کسی پیغمبر کا کام ہے اور اس معاملہ میں سالک صاحب کا "افکار و حوادث" پیغمبری سے کم نہیں تھا۔ اگرچہ قبولِ عوام نے سالک صاحب کو "مولوی افکار و حوادث" بنا دیا۔ اور مکر کونسوی "جناب پیاز کے چھلکے" کہلانے لگا۔ لیکن اعتراف کرتا ہوں کہ بقولِ ذوقؔ ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

فیض احمد فیض، ساقی فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور افتخار عارف
لندن کی ایک تقریب میں

غلام جیلانی اصغر

تحقیق

نوکری سے ریٹائرمنٹ کے بعد فوری مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اب ریٹائرڈ آدمی کا کیا کیا جائے۔ بدقسمتی سے چوبِ مسجد کی طرح نہ یہ سوختنی ہوتا ہے اور نہ ہی فروختنی۔ گھر والے اسے بیکار شے سمجھ کر پچھلے کمرے میں ڈال دیتے ہیں، اور اگر شکل و صورت میں زندگی کے کچھ آثار موجود ہوں تو اُسے برآمدے میں سجا دیتے ہیں یا سودا سلف لانے کے کام پر مامور کر دیتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بددیانت ملازم کی طرح سودے سے پیسے نہیں بچاتا، اور نہ ہی کوئی ایسی کھٹی میٹھی چیز کھاتا جس سے اُس کے بڑھاپے پر حرف آئے۔ یوں بھی ریٹائرڈ آدمی عمر بھر کی دیانتداری یا وضع داری کے بعد چھوٹی موٹی رقوم دبانا جائز نہیں سمجھتا۔ یار دوستوں کو یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ اگر یہ آدمی بیکار رہا تو کوئی ایسا ناشدنی کام کر بیٹھے گا جس سے اُن کی عزتِ نفس مجروح ہوگی۔ چنانچہ وہ معروفیت کے لیے ایسے ایسے غیر معقول کام تجویز کرتے ہیں جن سے ہر معقول اور باحیا آدمی پرہیز کرتا ہے۔ مثلاً مجھے ہی لیجئے میں جب ملازمت سے فارغ ہوا تو میرے ایک جاننے والے نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں چھوٹی موٹی دلالی کا کوئی کام شروع کر دوں۔ پہلے تو مجھے جب بات غصہ آیا۔ لیکن میں غصہ ضبط کر گیا کیونکہ اللہ تعالےٰ غصہ ضبط کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہے۔

عام طور پر دوست احباب تنگدستی اور بیماری میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اُن کا تعلق براہِ راست ان عوارض سے ہے وہ تو صرف گیر دستِ دوست کی ذمہ داری پوری کرتے ہیں اور نتائج خود فرد پر چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے بھی ایک دوست ہیں جو ادب سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ جب کسی رسالہ یا کسی اخبار کے ادبی ایڈیشن میں میری غزل، نظم چھپتی ہے تو وہ نہال ہو جاتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے مجھے مبارکباد دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ تاکید بھی کرتے جاتے ہیں کہ میں ایہامِ صنعتی اور مجاز مرسل وغیرہ سے پرہیز کیا کروں، کیونکہ ماڈرن غزل اور نثری نظم میں پہلے ہی ایہامِ صنعتی وغیرہ کی فراوانی ہے۔ اُن کی یہ بھی خوبی ہے کہ وہ مرے ذاتی معاملات میں خود مجھ سے

یادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن جبکہ میں برآمدہ میں بیٹھا شخصی اور قومی آزادی کی برکات پر غور کر رہا تھا، تو صاحب بموصوف تشریف لائے۔ چہرے کی شگفتگی اندر کی سرخوشی کی غمازی کر رہی تھی۔ بچے کو آواز دی اور چائے وغیرہ کا آرڈر ے دیا۔ جب وہ چائے سے فارغ ہو گئے تو ایک کرسی پر نیم دراز ہو کر کہنے لگے "جیلانی صاحب! میں نے گہری وچ بچار کے بعد آپ کے مذاق کے مطابق کام تلاش کر لیا ہے۔ انشاءاللہ العزیز آپ دیکھیں گے کہ اس کام میں آپ کی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ہو گا۔ اور سرمایہ کی بھی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ مغز پچی بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ چھوٹی موٹی ذہانت سے ہی کام چل جائے گا۔ انشاءاللہ العزیز آپ اس فیلڈ میں خاصے کامیاب رہیں گے۔ آپ کی کامیابی ادیب برادری کے لیے مشعل راہ کا کام دیگی۔ اور عمدگی کی بات یہ ہے کہ انشاءاللہ العزیز آپ کے خاندان کی عزت پر بھی کوئی حرف نہیں آئیگا۔ میں نے جب اپنے خاندان کا ذکر سنا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید وہ مجھے سمگلنگ یا بنک فراڈ کا کوئی مشورہ دینے والے ہوں، میں فوراً محتاط ہو کر بیٹھ گیا اور دانستہ طور پر چہرے پر ایسی سنجیدگی پیدا کر لی جس سے انہیں احساس ہو کہ میں صرف نوکری سے ریٹائر ہوا ہوں نہ کہ خاندانی شرافت سے۔ میں نے ذرا خشمگیں لہجہ میں کہا "آپ کا کیا مطلب ہے؟" "مطلب وطلب کچھ نہیں۔ بھائی جان! میں جو کچھ سوچتا ہوں۔ آپ کے بھلے کے لیے سوچتا ہوں۔ مختصر بات یہ ہے کہ آپ تحقیق شروع کر دیں۔ انشاءاللہ العزیز چند ہی برسوں میں آپ کا نام ادبی حلقوں سے نکل کر کاروباری حلقوں میں داخل ہو جائے گا۔" "لیکن تحقیق کے لیے کوئی موضوع بھی تو ہونا چاہیئے۔ اور پھر تحقیق تو دیدہ ریزی کے علاوہ گرمیوں میں عرق ریزی کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ تحقیق کے لیے یہ بھی تو ضروری ہے کہ آدمی اگر لکھنا نہ جانتا ہو تو کم از کم پڑھنا تو جانتا ہو۔" میرا دوست رازدارانہ انداز میں مسکرایا۔ اور ایسے لیے گراں قدر تاریخ ساز مقالوں کا ذکر کیا کہ مجھے تحقیق سے خوف آنے لگا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر ایک حد تک میری تشویش کو کم کر دیا کہ مقالے باہر سے جتنے ثقیل نظر آتے ہیں اندر سے اتنے ہی زود ہضم اور آسان ہوتے ہیں۔ مشکل کام تو صرف عنوان یا موضوع کا تلاش کرنا ہے۔ اس کے بعد بس اتنا کریں گے کہ ہر فقرے کے اوپر یا نیچے نمبر لگا دیں۔ اور حاشیے میں کسی غیر معروف کتاب یا محقق کا نام لکھ دیں۔ جہاں اور کوئی مستند حوالہ دستیاب نہ ہو۔ وہاں الخ اور ایضاً یا دیکھیں صفحہ نمبر اتنا لکھ دیں۔ حوالہ جات جتنے پرانے ہوں گے مقالہ اتنا ہی دلپذیر ہو گا۔ حوالوں کی صحت اتنی ضروری نہیں جتنی کہ محقق کی۔

میرے دوست کا خیال ہے کہ ادبی تحقیق میں تاریخ پیدائش یا ڈیٹ آف برتھ کا دریافت کرنا ذرا وقت طلب کام ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی معقول ادیب آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کب پیدا ہوا تھا۔ دراصل جب وہ پیدا ہوا تھا تو اتنا کم عمر تھا کہ اپنی تاریخ پیدائش نہ تو یاد رکھ سکتا تھا، اور نہ ہی لکھ سکتا تھا۔ والدین عام طور پر تاریخ پیدائش میں دانستہ طور پر گڑ بڑ کر دیتے ہیں۔ تاکہ مستقبل کا ذہین نقاد اس موضوع پر کام کر سکے۔ اس لیے تذکروں اور ادبی تاریخوں میں جو تاریخ ولادت درج ہوتی ہے اس میں ادیب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ یہ تاریخ ایسی ہی مفروضہ ہوتی ہے

جیسے خطِ سرطان اور خطِ جدی۔ اور آپ یہ تو جانتے ہیں کہ آج تک ان دونوں نے اپنے وجود سے انکار نہیں کیا۔ تاریخِ ولادت کی تلاش کے بعد دوسرا مرحلہ شاسب شجرہ نسب کا کھوج لگانا ہوتا ہے۔ شجرہ نسب اس لیے بے ضرر ہوتا ہے کہ پانچ پشتوں کے بعد تمام شجرے تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بس احتیاط اتنی کرنی چاہیئے کہ شجرہ نسب کی کوئی شاخ حضرت آدم سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

میرے دوست کی دلیل بہت وزنی تھی۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ کسی ایسے ادیب یا شاعر پر کام کرنا چاہیئے۔ جو اس حد تک مر چکا ہو کہ وہ اپنی تاریخِ پیدائش اور شجرہ نسب کی تردید نہ کر سکے۔ ادیب اور شعرا عام طور پر انتہائی زود رنج اور حساس ہوتے ہیں اور اپنی طبعی موت کے باوجود یہ گوارا نہیں کرتے کہ ان کی تخلیق یا تاریخِ پیدائش میں کمی بیشی کی جائے اس احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اپنے ایک دوست کے غیر مطبوعہ دیوان پر کام شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ میں نے اس ضمن میں نکات الشعرا سے مراۃ النظیر تک سب تذکرے حاصل کر لیے ہیں۔ خرابی صرف اتنی ہے کہ میرا مرحوم دوست بالکل زمانہ حال کی پیداوار ہے۔ لیکن اس کی غزل میں کلاسیکی رنگ اتنا نمایاں ہے کہ آپ اُسے کسی دور میں بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کی تاریخِ پیدائش جو سکول رجسٹر میں درج ہے اس لیے مصدقہ ہے کیونکہ اس کے چھوٹے بھائی کی تاریخِ پیدائش سے صرف چند دن کم ہے۔ اب یہ تو قدرت کے کھیل ہیں۔ تذکرہ نگار یا محقق کیا کر سکتا ہے۔ بہر صورت میں نے بقول شخصے تحقیق و تفتیش کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ دیکھیں کیا قطرے پہ گذرے ہے گہر ہونے تک۔
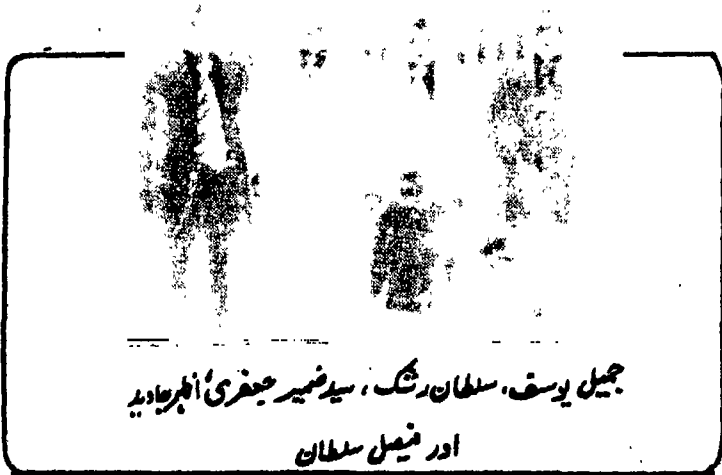
جمیل یوسف، سلطان رشک، سید ضمیر جعفری، اظہر جاوید
اور فیصل سلطان

منصور قیصر

”ناجائز“

سفر ہے شرط

سفر کو وسیلۂ ظفر سمجھ کر میں نے زندگی میں بہت سے سفر کیے ہیں اور اب بھی مسلسل کر رہا ہوں
کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میں زندگی کو ہی ایک ایسا سفر سمجھتا ہوں جہاں کوئی سٹاپ نہیں، کوئی جنکشن نہیں کہ
انتظار نہیں اور کوئی قیام نہیں۔ زندگی کے سفر کو جاری رکھنے کے لیے جو ذرائع رسل و رسائل آج کل دستیاب ہیں وُہ میں
سب کے سب استعمال کیے ہیں لیکن ان سفروں کے دوران میں مجھے اب تک صرف ایک ایسا مسافر ملا ہے جسے
اصولِ مسافرت کی رُو سے صحیح اور معقول مسافر کہہ سکتا ہوں۔ وُہ کون تھا؟ اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔

اس وقت تو میں ایسے مسافروں کا ذکر کرنے لگا ہوں جو خواہ کسی ذریعے سے سفر کریں۔ دوران سفر یوں ہو
ہیں جیسے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوں اور اپنے گھر والوں کو احکام پر احکام جاری کر رہے ہوں یا
باورچی خانہ میں بیٹھے ہوں اور یوں سانس کھینچ کھینچ کر ناک سے دھواں اور آنکھوں سے پانی نکال نکال کر کھا رہے
جیسے جنم جنم سے کچھ کھایا نہ ہو۔ یا پھر یہ لوگ یوں نظر آتے ہیں جیسے ان کی زبانوں کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر فٹ ہو
اور کسی نے بٹن دبا دیا ہو۔ وہ اگر خود بھی کوشش کریں پھر بھی ان کے ڈائیلاگ کو فل سٹاپ نہیں لگتا۔

خیر اتنا تو روایتاً اور اخلاقاً بھی جائز ہے کہ اپنے ہم سفروں کی خیریت معلوم کی جاتے اور اُن سے پوچھا جائے
آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور کہاں کے ارادے ہیں لیکن شاید اخلاق کی بلدیاتی حدود وہاں ختم ہو جاتی ہے

اپنے ہم سفروں سے ان کا پورا شجرۂ نسب اور پورا تاریخ جغرافیہ پوچھنا شروع کر دیا جائے۔ مزید برآں انہیں مجبور بھی کیا جائے کہ وہ بالکل خاموش نہ بیٹھیں بلکہ ہر ایرے غیرے سوال کا جواب بھی دیں۔ یہ تخصیص صرف مردوں کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اس "عادتِ مسافرانہ" میں خواتین بھی شامل ہیں جو ویسے بھی عادتِ زنانہ کی مالک ہوتی ہیں۔ خواتین سے یاد آیا کہ ریل کے سفر کے دوران تو خواتین اس خیال سے بھی ایک دوسرے کا تفصیلی تعارف کرواتی ہیں کہ لگے ہاتھوں کسی لڑکی یا لڑکے کا رشتہ ہی طے پا جائے۔ رشتوں کی تلاش میں آج کل ہمارے ہاں بہت سے شارٹ ٹرم اور لانگ ٹرم ریفریشر کورس ہو رہے ہیں اس ضمن میں مجھ حقیر فقیر کا ایک عاجزانہ مشورہ یہ ہے کہ ایک ایسا ہی ریفریشر کورس مسافروں کے لیے بھی شروع کیا جائے تاکہ ان کو آدابِ مسافرت سکھائے جا سکیں۔ اس کے بعد کسی ایسے مسافر کو سفر کرنے کی اجازت نہ دی جائے جس کے پاس ریفریشر کورس کا سرٹیفکیٹ نہ ہو۔ یہ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض مسافر خواہ کسی ذریعے سے ہی سفر کر رہے ہوں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کچھ دوسرے لوگ بھی ان کے ہم سفر ہیں اور وہ بھی ایک آرام دہ سفر کے متمنی ہیں۔

مثلاً میں نے دیکھا ہے کہ ہوائی سفر میں سفر کے دوران ایک صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور اُن کے چند واقف کار اُس سیٹیں چھوڑ کر آگے بیٹھے ہوئے تھے لیکن وہ صاحب وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے دوستوں سے گفتگو فرما رہے تھے۔ ان کے اور ان واقف کاروں کے درمیان پھنسے ہوئے مسافر یوں محسوس کر رہے تھے جیسے انہیں باتوں کے بلے سے ہٹیں لگائی جا رہی ہوں۔ موصوف صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کیے ہوئے تھے بلکہ ہر پانچ منٹ بعد کال بل دبا کر ایئر ہوسٹس کو طلب فرماتے اور یوں حکم جاری فرماتے جیسے وہ اُن کی ذاتی ملازمہ ہو۔ اُس ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں اس قدر بدمزگی رہی کہ یہی چاہا کہ اگر اس سے پیدل سفر کر لیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔

کچھ لوگ ریل گاڑی میں داخل ہوتے ہی اپنے بستر یوں کھول دیتے ہیں جیسے پوری گاڑی انہوں نے ریزرو کروا رکھی ہو اور ان کے سوا کسی اور کا بیٹھنا خلافِ قانون ہو۔ اسی طرح کچھ لوگ ریل کے سفر میں اپنے ساتھ اس قدر سامان لے جانے کے شوقین ہوتے ہیں کہ یوں پتہ چلتا ہے جیسے خدانخواستہ کہیں نقل مکانی کر رہے ہوں۔ ایک بار ٹرین میں ایک صاحب دن دہاڑے بستر بچھا کر آنکھیں موندے استراحت فرما رہے تھے۔ میں نے بیٹھنے کی اجازت طلب کی۔ پہلے تو انہوں نے یوں گھورا جیسے میں کوئی غیر قانونی تجاوزات کرنے لگا ہوں پھر جب میں نے تینوں ایسی شکل بنا کر کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا تو انہوں نے مجھ پر رحم کرتے ہوئے کچھ پاؤں سکیڑ لیے تاکہ میں مشکل سے بیٹھ سکوں تو انہوں نے مجھ سے وقت پوچھا میری منزلِ مقصود کے بارے میں پوچھا اور پھر اس بات پر افسوس کرنے لگے کہ دنیا سے مروت، اخلاق، ہمدردی، اور شرافت کا جنازہ اُٹھ چکا ہے۔ میں مجبوراً بلکہ طوعاً کرہاً ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ بعد میں کہنے لگے "میاں میں علیل ہوں۔ ڈاکٹر نے ہر ایک گھنٹے بعد دوائی کھانے کے لیے کہا ہے لیکن میرے پاس گھڑی نہیں ہے

بہتر ہوگا کہ تم وقت پر مجھے یاد دہانی کرواتے رہو"۔
اب کیا عرض کروں کہ وہ چھ گھنٹے میں نے کلاک ٹاور بن کر گزارے اس قدر مسلسل گھڑی تو میں نے زندگی بھر نہ دیکھی تھی جتنی ان چھ گھنٹوں میں دیکھ ڈالی ۔ سچ کہا ہے کسی شاعر نے یہ ؎

ہائے کیا وقت خدایا ہوگا

خیال تھا کہ بس سفر ریل کے سفر سے اس لحاظ سے آرام دہ ہوگا کہ مسافر جو مرغیوں کی طرح بھرے ہوتے ہیں کچھ نیا چھل پر انہیں کرتے ہوں گے ۔ لیکن تجربے نے بتایا ہے کہ بسوں کے مسافروں کی کچھ اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں ۔ کچھ اپنے تجربے ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ اپنے ہم سفروں کے ہاتھوں سے اخبار چھیننا اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔ گنڈیریاں اور مونگ پھلی کے چھلکے دوسروں کے سامنے پھینکنے کو اخلاق سمجھتے ہیں ، مسلسل باتیں کرنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں اور بس رکوا کر پیشاب وغیرہ کرنے کو ضابطہ سفر سمجھتے ہیں

اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ پیدل ہی سفر کیا جائے لیکن اس میں ڈر یہ لگتا ہے کہ کوئی تیز رفتار بس یا کار اپنے موج میں ہمیں نہ کچل دے ۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ مجھے آج تک صرف ایک ایسا مسافر ملا ہے جسے میں صحیح اور معقول مسافر کہہ سکتا ہوں ۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ کون تھا ۔ اس ضمن میں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ وہ ایک بہرہ اور گونگا شخص تھا ۔

داخلہ ہسپتال میں

میں نے لاہور میں اپنے ایک دوست کو اطلاع دی کہ میں آ رہا ہوں اور تمہارے پاس ہی قیام کروں گا"
جب میں اس کے پاس پہنچا تو اُس نے مجھے ایک ہسپتال کے آفیسرز وارڈ کے ایک کمرے کی چابی تھماتے ہوئے کہا کہ سیدھے وہاں چلے جاؤ وہاں تمہارے قیام و طعام کا بہترین انتظام ہے"
میں نے حیرت سے پوچھا ، کیا کہہ رہے ہو ؟ ہسپتال میں قیام و طعام کا بہترین انتظام ؟ تو اُس نے اپنا کدو سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا " فکر کی کوئی بات نہیں ۔ تمہیں یوں محسوس ہوگا جیسے تم کسی تھری سٹار ہوٹل میں قیام کر رہے ہو ؟"
اگرچہ میں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہسپتال اور ہوٹل کبھی بھی سگے بھائی نہیں ہو سکتے لیکن اس انکشاف نے مجھے خود ایک مریض بنا دیا کہ میرے دوست نے اپنی بیماری کے بہانے اور اپنے تعلقات کے سہارے ہسپتال کے آفیسرز وارڈ میں ایک کمرہ لے رکھا ہے اور وہاں آرام کرنے کی بجائے

مکان بنوا رہا ہے۔ میرے اُس دوست سے تو میری وُہ سالی کرماں والی ہی اچھی ہے جو کم از کم ہسپتال میں آرام تو کرتی ہے اور ہر دو ماہ بعد آرام کے لیے ہسپتال میں الگ کمرہ لے لیتی ہے میری سالی کو صرف دو ہی شوق ہیں ایک مرغن غذائیں کھانے کا دوسرا آرام و تفریح کا جسے REST AND RECREATION بھی کہتے ہیں۔ اُسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی طرح گوشت کے لوتھڑوں نے اس پر حملہ کر دیا ہو۔

ہسپتالوں کی HOSPITALITY کا ناجائز فائدہ اٹھانے والوں پر بھی کڑھتا ہے کہ یوں ضرورت مند مریض مطلوبہ سہولتیں حاصل کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ان مریضوں کی تصویریں بھی نظروں کے سامنے پھرنے لگتی ہیں جن کا کسی ہسپتال میں داخل ہونا بالکل اُسی طرح ہوتا ہے جیسے کسی کا انعامی بانڈ نکل آتا ہے۔ آپ یقین مانئے کہ ایک بار میرے ایک ہمسائے سے نیاز بانٹی میں نے سمجھا کہ اُس کی بیوی کی صحت کی خوشی میں ہو گی لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ نیاز اُس نے اپنی بیوی کے ہسپتال میں داخلے کی خوشی میں بانٹی ہے۔ اَب میں یہ کہنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہوں کہ موصوف کی خوشی کے پیچھے بیوی سے جان چھڑانے کا جذبہ کارفرما تھا یا اس کے صحت مند ہونے کا۔

تاہم ان گنہگار نظروں سے جو مشاہدے ہوئے ہیں اُن سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ محاورے بھی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ہم نے ایک محاورہ پڑھا تھا کہ ایک انار سو بیمار جو آج کل یوں ہو گیا ہے کہ ایک ہسپتال ہزار بیمار۔ اب تو ہسپتال کا رخ کرنا بالکل اُسی طرح ہے جیسے گیدڑ شہر کی طرف رخ کرتا ہے۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ علاج معالجے کے لیے سفارشیں ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ یہ بات غلط نہیں کہہ رہا بلکہ تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ اتفاق سے میرے دونوں بیٹے میڈیکل کالج میں فائنل ایر کے طالب علم ہیں۔ چونکہ آج کل اُن کا واسطہ براہ راست ہسپتالوں سے رہتا ہے لہٰذا روزانہ کوئی نہ کوئی جاننے والا اُن سے صرف اس لیے بالمشافہ رابطہ قائم کرتا ہے تاکہ ان کے کسی نہ کسی مریض کو ہسپتال میں داخلہ مل سکے۔

ہسپتال میں داخلے کے سلسلے میں خود ڈاکٹر بیچارے بڑے بے بس واقع ہوتے ہیں۔ یہ کام اُن سے بالا بالا یا زیریں زیریں ہو جاتا ہے۔ یہ کام کوئی اور ہی مخلوق کرتی ہے۔ اور صرف اُس کا کام کرتی ہے جو اُسے ڈاکٹروں سے زیادہ ہم جنس سمجھے۔ گذشتہ روز ہی اخبار میں ایک خبر پڑھی ہے کہ ہسپتال کے ایک کارکن نے ہسپتال میں داخلے کی خواہشمند ایک مائی سے پوچھا کہ "مائی! تمہارے پاس داخلے کی پرچی ہے؟" اور مائی نے ہاں کہتے ہوئے اپنی مٹھی کھول دی جس میں پچاس روپے کا نوٹ تھا۔

مذکورہ کارکنوں کی انسان دوستی سے یاد آیا کہ میرے ایک دوست منیر کو یکایک گردے کا شدید درد ہوا۔ میں نے ایک اور دوست کے ہمراہ فوراً اُسے ہسپتال لے گیا۔ وہاں اسے ایک بنچ پر لٹایا اور ایک کارکن سے ایمرجنسی ڈاکٹر

ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا تو اُس نے مریض کی طرف دیکھے بغیر کہا کہ "اس وقت ٹی ٹائم ہے۔ ڈاکٹر جی ٹی روم میں ہیں"۔ منیر شدید درد کے سبب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں بے چین ہو کر ٹی روم کی طرف لپکا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تلاش کرنے پر پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب تو اپنے کمرے میں ہی ہیں۔ بہرحال وہ فوراً اٹھ کر آ گئے اور ہدایت دی کہ مریض کو فوراً دوسری منزل پر ایکسرے کے لیے پہنچایا جاتے اسی دوران میں انہوں نے منیر کو ایک ٹیکہ بھی لگا دیا۔ مجھے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ اُس مخلص کارکن نے ڈاکٹر صاحب کو ٹی روم میں کیوں بھیجا دیا تھا۔ منیر کو دوسری منزل پر لے جانے کے لیے میں نے ہسپتال کے چند دیگر کارکنوں سے درخواست کی تو وہ بولے "مریض کو سیڑھیوں کے ذریعے لے جائیں"

میں نے کہا "مریض تو درد سے تڑپ رہا ہے۔ براہ کرم آپ لوگ اُسے لفٹ کے ذریعے لے جائیں"

اس پر ایک بولا "لفٹ تو صرف کلاس ون افسروں کے لیے ہے۔ کیا یہ مریض کلاس ون افسر ہے"

اس پر میں نے چڑ کر کہا "یہ خود بھی کلاس ون ہے اور اس کا درد بھی"

مجھے وہ فلمی گیت یاد آنے لگا جس کے بول کچھ یوں ہیں کہ "دردِ جگر ٹھہر ذرا دم تو مجھے لینے دے براہ کرم آپ بھی ذرا دم لیجئے، مجھے ذرا ایک ہسپتال میں داخلے کے لیے ایڈوانس بکنگ کروانی ہے۔

(ترتیب کتاب "ناجائزے" سے)

جمیل آذر

ہائیڈ پارک

میں نے کبھی یہ غور ہی نہیں کیا تھا کہ باہر جانے سے پہلے میں اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک بار بار آئینہ میں کیوں دیکھتا ہوں کبھی نکٹائی کی ناٹ کو درست کرتا ہوں کبھی سر پر چند منتشر بالوں کو برش کرتا ہوں اور چہرے کو رومال سے صاف کرکے آئینہ میں دیکھتا ہوں کہ مبادا کہیں کوئی داغ دھبہ لگا ہو۔ مگر آج نہ جانے کسی کوشش کے بغیر ایک خیال بجلی کی لپک کے ساتھ میرے ذہن میں اس وقت آیا جب میری "نصف بہتر" نے مسکرا کر کہا کہ جناب اپنے کوٹ کا کالر پیچھے سے درست کریں۔ خیال یہ آیا کہ میرا اپنے سراپا کو آئینے میں دیکھنا میرا ثقافتی اور تہذیبی عمل ہوتا ہے۔ جب میں آئینے میں اپنی شخصیت کا دیدار کر رہا تھا تو وہ محترمہ میرے عقب سے میری شخصیت کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی اس نے میرے کوٹ کے مڑے ہوئے کالر کی نشان دہی کرکے اسے درست کرا دیا۔ یوں اس نے ایک کھلی آنکھ کے نقاد کا اہم فریضہ ادا کرکے مجھے یہ سمجھایا کہ فن کار اپنی تخلیق کو سامنے سے دیکھتا ہے۔ جب کہ نقاد اسے عقب سے دیکھتا ہے اور ان پہلوؤں کی نشان دہی کرتا ہے جو فن کار کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔

جونہی میری نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر کوئی تحریر نمودار ہوتی ہے تو میں اسے ہر زاویہ سے تجزیہ و نظر کی گرفت میں لاتا ہوں اور کانٹ چھانٹ کرکے از سر نو لکھتا ہوں۔ اس تکرار عمل کو جب میری نصف بہتر تکتی ہے تو وہ اسے میرا غیر معقول عمل قرار دیتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ان تحریر شدہ کاغذوں کو نہایت احتیاط سے طے کرکے میں اسے کسی بڑے سے خوبصورت لفافہ میں بند کروں گا اور پھر بذریعہ ڈاک کسی رسالہ کے مدیر یا مدیرہ کو ارسال کر دوں گا۔ وہ میری تحریر کے ف عمل سے لے کر فیر کرنے کے عمل تک کو دانشمین کی نظر سے دیکھتی ہے اور مجھ سے سوال کرتی ہے کہ اس تمام دھندے کا آخر کیا فائدہ جس سے آپ کو کوئی مالی فائدہ نہ ہو۔ میں اس کے اس معقول سوال کو دلیل اور منطق کا ینے کی کوشش کرتا ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ دلیل منطق اور بحث سے ہم سچائی تک نہیں پہنچ سکتے ہم ان چالاک حربوں ے دوسروں کو نیچا تو دکھا سکتے ہیں لیکن حق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ حقیقت کے ادراک کے علاوہ حسن نظر اور ب کی ضرورت ہے علم و عقل کی عیاری کی نہیں۔ میں اس کے اہم سوال کا جواب میتھیو آرنلڈ کے الفاظ میں دیتا ہوں کہ

یہ ایک "بے لوث سعی" ہے اور بے لوث کام کا معاوضہ خود اس کا اپنا اظہار ہے۔ میں ایک سوچنے والا انسان ہوں او
کو اپنے تجربے اور وجدان میں شریک کرتا ہوں۔ اپنے اہلِ وطن سے سماجی ملاپ کرتا ہوں اپنی ذات کو بنی نوعِ انسان،
ساتھ، زندگی کے ساتھ اور کائنات کے ساتھ وابستہ کرتا ہوں۔ جو ادبی رسالہ میری تحریر شائع کرتا ہے وہ قاری کے ساتھ
ذہنی اور روحانی رابطہ استوار کرتا ہے میں اس کا شکر گزار ہوں۔ میں ان تحریروں کے ذریعے اپنے افکار کے بیج بکھیرتا ہو
اور لوگوں کے اذہان میں سوچ کے چراغ روشن کرتا ہوں۔ یہ میرا ایک بے لوث فعل ہے اس میں کوئی کاروباری قسم
نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور مفکروں نے اس بے لوث عمل کی بدولت تہذیبِ انسانی کو جلا بخشی ہے۔
تھوڑا سا توقف کرتی ہے اور اپنا سر نفی میں ہلا کر مجھ سے اختلاف کرتی ہے۔ میں اسے اختلاف کا پورا حق دیتا ہوں۔
یہ اس کا تنقیدی رویہ ہے۔ اگر مجھے اپنی "بے لوث سعی" کو جاری رکھنے کا حق ہے تو اسے مجھ سے اختلاف کرنے کا بھی حق
اسی طرح جب میں کبھی کسی ہفتے کی شام کو گھر سے باہر نکلتا ہوں تو وہ مجھ سے سوال ضرور کرتی ہے کہ آپ کہاں جا ر
ہے ہیں میں جوابًا کہتا ہوں کہ منصفینِ اقدار کے ہائیڈ پارک میں۔ جی ہاں اس مجلسِ تنقید کو جسے یار لوگ غیر سرکاری زبا
حلقہ کہتے ہیں میں اسے ناقدین کا عظیم ہائیڈ پارک کہتا ہوں۔ یہاں کہنہ مشق ناقدین سے لے کر انگوٹھا چوسنے وا
مبتدی شاعر تک جمع ہوتے ہیں اور ہر تخلیق پر اپنی اپنی سوچ کے مطابق بے لوث تنقید کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں۔ اسی ہا
کی بدولت مجھ پر فرانس کے مشہورِ زمانہ ادیب مونتین کے اس جملے کا مفہوم واضح ہوا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ "مجھے وہ دوست پسند ہیں جو مجھے رگید
نہ کہ وہ دوست جو مجھ سے سہمے سہمے رہتے ہیں" کئی برس پہلے جب میں نے مونتین کا یہ جملہ پڑھا تھا تو مجھے اس سے ہرگز اتفاق نہیں ہوا تھا۔
میں سمجھتا تھا کہ کوئی بھی آدمی یہ پسند نہیں کرتا کہ دوست اس کی کھنچائی کریں اس طرح تو ہم دوست بنانے کی بجائے دو
ہی محروم ہو جائیں گے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ کوئی نرم و لطیف اور شبنمی گلابوں کی معطر آواز میں ہم سے یہ کہے کہ آپ بہت
ہیں۔ بڑے نکتہ داں ہیں۔ جو بات آپ نے کہی وہ حرفِ آخر ہی نہیں بلکہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل۔
ہمارے دوست ہماری قابلیت سے مرعوب ہیں۔ لہٰذا ایک ہی وار سے میں نے مونتین کے دعوے کو یہ کہہ کر رد
کہ اسے انسانی نفسیات کا کوئی علم نہیں ہے۔ لیکن ہائیڈ پارک کے اس عظیم فورم نے مجھے مونتین کے جملے کی حقیقت سے
جس کا مجھے پہلے ادراک نہ ہو سکا۔ مجھے یاد ہے پہلی مرتبہ جب میں نے اس کے ایک اجلاس میں اپنی تحریر پیش کی تھ
محترم م ق بلا نے میری خاصی کھنچائی کی تھی۔ اس وقت میرے خون کا دباؤ بڑھ گیا تھا اور میں خاصا پریشان خاطر ہوا تھ
یہ الفاظ کہ "یہ تحریر ناپختہ ہے" خاصے تکلیف دہ تھے۔ بعض دوستوں نے میری اس ناپختہ تحریر کو بہت سراہا تھا اور
کر تعریف کی تھی۔ لیکن جب گھر آکر خاموش لمحات میں سکونِ قلب کے ساتھ مخالفانہ تنقید کی روشنی میں اپنی تحریر
پڑھا تو جناب م ق کی تنقید [illegible] پر ایمان لانا پڑا۔ میں آج تک ان کا احسان مند ہوں۔ مونتین نے یوں ہی آ
بات نہیں کہہ دی تھی۔ جس دن مجھے کوئی چیز تنقید کے لئے ادب کے اس بے لوث دربار میں پیش کرنی ہوتی۔

اسے بار بار پڑھتا ہوں کہ کہیں اس میں بقول جناب "م ق" کوئی ناپختگی تو نہیں ہے۔ پھر پورے اطمینان کے سا
اقدار کے منصفین کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ پھر اس پر تنقید کے رنگ پھینکے جاتے ہیں۔ کالے۔ ہرے۔ سرخ اور
سفید۔ ان تمام رنگوں سے میری خاموش تخلیق کو زبان لگ جاتی ہے وہ بولنے لگتی ہے اور وہ اپنے تمام خد و خال کے
اپنی شخصیت کا اظہار کرتی ہے۔ یہ رنگ مجھے مسرت بخشتے ہیں۔ میں مخالف اور موافق آوازوں کو صبر و سکون کے سا
سنتا ہوں۔ پسندیدہ اور غیر پسندیدہ رنگوں کے چھینٹے تمام فضا میں بکھر جاتے ہیں۔ میں ان تمام رنگوں اور آوازوں کو سمیٹ
کر اپنے آغوشِ فکر میں لے لیتا ہوں۔ تخیلات کے نئے گوشے منکشف ہونے لگتے ہیں۔ اور پھر اپنی تخلیق کے پیکر کو اور
درست کرتا ہوں۔

وہ لوگ جو تنقید کے اس بے لوث ہائیڈ پارک میں آنے سے گھبراتے ہیں۔ دراصل اپنی کمزوریوں کو آئینہ دکھانے کا حوصلہ
نہیں رکھتے۔ حالانکہ تنقید ہی وہ آئینہ ہے جو ہمیں ہماری تمام صورتیں دکھاتا ہے۔ بعض لوگ غیر ضروری طور پر حساس ہوتے
ہیں اور وہ تنقید کے نام ہی کو برداشت نہیں کر سکتے کہتے ہیں کیٹس کی ایک نظم اینڈیمین (ENDYMION) پر جب جاہلانہ
تنقید ہوئی تو وہ بے چارہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا۔ اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اور جب اس
کے دوست شیلے کو اس کا علم ہوا تو وہ اتنا غمزدہ ہوا کہ آنجہانی پر ایک عدد مرثیہ سپرد قلم کر دیا جس میں اس نے پیشہ ور
ناقدین کو خونخوار شکاری کتے کہہ کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔ یہ دونوں نوجوان تھے اور عمر کے اس حصے کو نہیں پہنچے تھے جو
طبیعت میں ٹھہراؤ، مزاج میں برداشت اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں ادب کے ہمارے جیسے کسی اکھاڑے
میں مار کھانے کا موقع ملا تھا۔ ورنہ تنقید سے نہ کیٹس مرتا اور نہ شیلے جذباتی ہوتا۔ اگر دیکھا جائے تو تنقید ہی تو ہے جس
نے کیٹس اور شیلے دونوں کو آج تک زندہ رکھا ہوا ہے اور انہی پر کیا موقوف شیکسپیر، غالب اور اقبال بھی تو تنقید کے
طفیل زندہ ہیں۔ ہمارے اپنے عہد میں یار لوگوں نے فیض پر جارحانہ تنقید کر کے اسے قتل کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن
فیض ہے کہ سگرٹ کا کش لگا لگا کر اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہتا ہے۔

> ؎ لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
> کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

یہ ناقدین کرام جتنا فیض کو قتل کرتے ہیں وہ اتنا ہی ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ اگر کیٹس کی طرح کمزور دل اور شیلے کی
طرح جذباتی ہوتا تو کبھی کا اللہ کو پیارا ہو چکا ہوتا۔ خود غالب پر ناقدین نے خاصے حملے کئے اور اس کے کلام معنی آفرینی
کو بعید از فہم قرار دے کر رد کرنے کی کوشش کی اور اپنے اقبال پر کفر کے فتوے لگائے اور ان کے کلام میں زبان کی
غلطیاں تلاش کرتے رہے لیکن یہ سب لوگ زندہ ہیں۔ کیوں کہ ان لوگوں نے تنقید کے ادبی ہائیڈ پارک کی ہوا
کھائی ہے۔ تنقید خواہ مخالفت میں ہو یا موافقت میں اس کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا صاف ہوا اور روشنی کے

لئے گھر میں روشندان کا۔ مخالفانہ تنقید کے فائدے زیادہ اور نقصانات کم ہوتے ہیں جب کہ موافقانہ تنقید کے نقصانات زیادہ اور فائدے کم ہوتے ہیں۔ حریفانہ تنقید آپ کے ذہن کو بیدار رکھتی ہے اور آپ کی شخصیت کو پَر لگا کر اڑاتی ہے جب کہ خوش کن تنقید آپ کو شوگر کوٹڈ افیون کی گولیاں کھلا کر سلا دیتی ہے۔ مخالفانہ تنقید سے آپ ہرگز نہ گھبرائیں۔ اور پھر یہ ضروری بھی تو نہیں کہ جو نقاد آج آپ کا مخالف ہے ہمیشہ مخالف ہی رہے گا۔ اکثر ناقدین نے محض اپنی دکان چمکانے کے لئے عظیم شعرا کی پگڑیاں اچھالیں اور بعد میں تائب ہو کر ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ ایلیٹ نے پہلے ملٹن کی بھی مجبرلی اور بعد میں اس کے حق میں لکھ کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ تاہم ہر دو صورتوں میں فائدہ ملٹن کو پہنچا اور گھاٹے میں ایلیٹ بھی نہیں رہا۔

دراصل تنقید کا ہائیڈ پارک ہمیں ایک ایسا فورم عطا کرتا ہے جہاں ہم کھل کر بلا روک ٹوک کسی پر تنقید کر سکتے ہیں۔ غالباً اہلِ انگلستان نے اسی چیز کے پیشِ نظر اپنے ہاں ایک ہائیڈ پارک کا دربار عام سجا رکھا ہے کہ جس کا جو جی چاہیئے یہاں آ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر بولے اس پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بنیادی طور پر ان کی فطرت میں رواداری اور تحمل نہیں ہے اسی وجہ سے انہوں نے اپنے مذہبی مخالفین کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے تھے اور انہیں ڈھیروں زندہ نذرِ آتش کر دیا تھا۔ انہوں نے غالباً تاریخ سے یہی درسِ عبرت پکڑ کر اوپن ہائیڈ پارک کا بازار لگا رکھا ہے جہاں لوگ اپنے جذبات اور احساسات کا کھل کر اظہار کرتے ہیں یہ ان کے لئے ایک سیفٹی والو کا کام دیتا ہے جو ان کے جوش کی فالتو بھاپ کو نکال کر انہیں صحت مند رکھتا ہے کیونکہ کھل کر بولنا اور تنقید کرنا قوموں کی صحت کے لئے ضروری ہے۔ زندگی تنقید کے لئے نہیں مگر تنقید زندگی کے لئے ضروری ہے۔ وہ قومیں جو اپنے لئے تنقید کے لئے دروازے کھلے رکھتی ہیں ان کے اذہان افکارِ تازہ سے مہک اٹھتے ہیں اور ترقی انکے قدم چومتی ہے۔ اسی لئے تو میں تنقید کے اس عظیم ہائیڈ پارک میں آ جاتا ہوں۔ جہاں ہر تحریر پر تنقید ہوتی ہے۔ کیونکہ تنقید تخلیق کو عقب سے دیکھتی ہے جس طرح محترمہ نے عقب سے میرے کوٹ کے مڑے ہوئے کالر کو دیکھا تھا۔

میاں غلام قادر

قصہ چوتھے درویش کا

چوتھے درویش نے آنکھوں میں کلارک گیبل کی سی شیطانی چمک پیدا کرتے ہوئے کہا: حضرات: آپ لوگ انگریزی زبان کی بات کرتے ہیں۔ مجھے تو اب تک دس برس انگلستان میں رہتے ہوئے صحیح اُردو بھی بولنی نہ آئی اور میں اکثر و بیشتر لندن کی میموں سے ٹھیٹھ پنجابی بول کر اپنا کام نکال لیتا ہوں۔ دراصل دیارِ غیر میں اگر کوئی چیز کسی کے معمولات میں مخل ہوتی ہے تو وہ ہے خوشبودار نوٹوں کی کمی اور جہاں جیب میں وافر پیسے موجود ہوں اور رگوں میں بُرانڈے کے بجائے خونِ گرم وہاں زبان یا رسے واقفیت ہرگز ضروری نہیں۔

اور اُنہوں نے اپنی یہ بات اُسی شام سچ بھی کر دکھائی۔ یعنی EMPIRE میں منعقد رقص و نغمہ کی ایک دل فریب اور دل آویز محفل میں وہ گئی رات تک ایک ویسٹ انڈین دوشیزہ سے محوِ رقص رہے اور جب بھی اُس نازنین نے اِن "باتوں" سے اُکتا کر انہیں خیرباد کہنا چاہا۔ انہوں نے پنجابی میں اس کی شان میں ایک مختصر سا قصیدہ پڑھ کر اور ایک مُستند اور موٹی سی گالی دے کر اُسے دادطلب نگاہوں سے دیکھا اور وہ دوبارہ رام ہو کر محوِ رقص ہو گئی۔

چوتھے درویش نے اپنے معمولات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

حضرات!　　کیا ہوا لوگ اگر مجھ کو بُرا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

جیسے کہ یہ حقیقت میرے تمام رفقاء پر عیاں ہے۔ میں اللہ کے فضل و کرم سے اپنے ہموطنوں کے مقابلے میں دُگنے پیسے کما لیتا ہوں اور سب تو فیق اوور ٹائم بھی لگا لیتا ہوں چنانچہ میرے پاس برطانیہ میں رہتے ہوئے پونڈوں کی کبھی کمی نہیں رہی اور جہاں تک اس فقیر پُر تقصیر کے ظاہری ٹھاٹ باٹ کا تعلق ہے تو اس کا مشاہدہ تو آپ سب نے دو ایک روز پہلے خود کر لیا۔ کہ میاں صاحب جہاندیدہ شخص نے (جس کے لئے میں نے پلنڈرہ میں کتابوں کی ایک دیوہیکل الماری بنائی تھی) مجھے دور سے فرنگی سمجھا اور میرے اچانک معانقے سے بوکھلا گئے..... بہرکیف میری تمام تر راز میرے فرنگی نظر آنے میں نہیں اس میں میرے طریقۂ واردات کو بھی بڑا دخل ہے اور وہ یوں کہ میں آج کل کے تلون مزاج اور جذباتی زن کی طرح خوب سے خوب تر کی تلاش میں کبھی پریشان نہیں ہوا اور میں رقص و سرود کی محفل میں عام طور پر بظاہر سب سے گئی گزری ملکۂ باطن ما چنگی محترمہ کو دعوتِ رقص دیتا ہوں اور فقیر کا یہ نسخہ اس قدر تیر بہدف ہے کہ میدان میں کسی کی شدید مخالفت یا کڑی مزاحمت کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس قسم کی دوشیزہ میں چاہے اُس کا تعلق کسی بھی سرزمین سے ہو، غضب کی اپنائیت اور خود سپردگی ہوتی ہے۔ وہ غیر مستقل مزاج حسیناؤں کی طرح ایک ہی رقص کے بعد آپ کو داغِ مفارقت نہیں دے دیتی اور اگر نوبت ماکولات و مشروبات اور تحفے تحائف تک بھی پہنچ جائے تو یہ نیک بخت کم قیمت تحائف اور ارزاں مشروبات اور ماکولات کا گلہ بھی نہیں کرتی! اور اسے بے جا طور پر، خواہ مخواہ احساسِ برتری نہیں ہوتا۔

چوتھے درویش نے زبانِ یار سے بے اعتنائی برتنے کی ایک اور وجہ بیان کرتے ہوئے کہا: میں اپنی درویشانہ اُفتادِ طبع کے سبب قاعدے قانون کا کبھی پابند نہیں رہا۔ اس بات کا مشاہدہ آپ سب لوگ پرسوں کر چکے ہیں کہ میں نے سینما جانے سے پہلے اپنی گاڑی ارادتاً غلط جگہ پارک کی کیونکہ مجھے پارکنگ کے لئے "صحیح جگہ" تلاش کرنے میں عمرِ عزیز کا ضائع کرنا منظور نہ تھا چنانچہ فلم کے اختتام پر میں نے سکاٹ لینڈ یارڈ والوں کے بول سہے اور ۱۶ پونڈ کا جرمانہ الگ بھرا۔

خیر پارکنگ تو پھر بھی بڑی بات ہے۔ میں تو اس بات کا بھی روادار نہیں کہ میں فلم کے انٹرول میں سخت سردی میں ٹائلٹ کی تلاش میں خواہ مخواہ سرگرداں پھروں۔ چنانچہ میں اپنی کار کا اگلا حصہ کھول کر اکثر مرمت کے بہانے کار کے پیچھے ہی آب پاشی میں مصروف ہو جاتا ہوں اور سکاٹ لینڈ والوں کی مجال نہیں کہ وہ اس فقیر کا بال بھی بیکا کر سکیں۔

ہاں تو بات زبانِ یار سے احتراز برتنے کی ہو رہی تھی۔ اس میں سب سے بڑی عافیت یہ ہے کہ کسی سے لڑائی جھگڑے کی صورت میں آپ کو مدِ مقابل کی استعمال انگریزی کا جواب نہیں دینا پڑتا اور اگر آپ مسکرا مسکرا کر اس جھگڑالو شخص کو پنجابی میں اپنی من پسند گالیاں بھی دیں تو راہ گیروں اور تماش بینوں کی تمام تر ہمدردیاں آپ ہی کے ساتھ ہوں گی اور عموماً یہ سمجھ کر آپ کی بڑی سے بڑی فروگذاشت کو بھی یہ کہہ کر یکسر نظر انداز کر دیا جائے گا کہ غالباً یہ سب غلط فہمی دو اجنبیوں کے درمیان زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر ہے!

چوتھے درویش صدیق صاحب کی معیت میں ایک روز ہم نے ان کی خوبصورت اور مہنگی کار میں۔ WILD ANIMAL KINGDOM، WOBURN کی سیر کی۔ کئی ایکڑ اراضی پر مشتمل یہ RESERVE ایک پرانے جاگیر کی ذاتی ملکیت ہے اور یہاں بقول فیض۔

ہے اہلِ دل کے لئے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

اس عظیم الشان "ریزرو" میں جو کئی حصوں پر مشتمل ہے اور دُنیا بھر سیلانیوں کے لئے سیر و تفریح کی بہترین جگہ، سگ تو نہیں البتہ ببر شیر واقعی آزاد گھومتے پھرتے ہیں۔ حضرت انسان کو صرف اسقدر آزادی حاصل ہے کہ وہ ہلکی رفتار سے گزرنے والی شیشہ بند گاڑی میں بیٹھ کر دُور سے ان کا نظارہ کرے۔

جس وقت ہم WOBURN پہنچے، سیلانیوں کا ہر طرف بے پناہ ہجوم تھا۔ ان میں ڈی لکس بسوں میں بیٹھ کر شیروں کی آماجگاہ میں جانے والے بچے، بوڑھے، جوان بھی تھے اور ذاتی شیشہ بند کاروں میں بیٹھ کر سیر کرنے والے خوش فکرے بھی۔ صدیق صاحب نے اپنی کار کے لئے ایک پونڈ کا جو ٹکٹ خریدا اس کی پشت پر مزے مزے کی ہدایات درج تھیں۔ یہ ہدایات پڑھ کر ہمیں معاً وطنِ عزیز کی رنگین بسیں یاد آ گئیں جن میں بعض اوقات سواریوں کی تفریحِ طبع کے لئے خاصا سامان موجود ہوتا ہے۔ مثلاً:

- سوار ہونے سے پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کر لیجئے۔ شاید یہ آپ کی زندگی کا آخری سفر ہو!
- بے وفا دوست سے 2-4 کا سگریٹ بدرجہا بہتر ہے۔
- کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو
- ہمیں تو آج کی شب پَو پھٹے تک جاگنا ہوگا۔
- یہی قسمت ہماری ہے "حسینو" تم تو سو جاؤ۔

(بغیر لائسنس ڈرائیور ارسلا خان)

وائلڈ لائف مل کنگ ڈم میں داخلے کے ٹکٹ پر بھی کچھ ایسی ہی باتیں درج تھیں :

- آزاد شیروں کے احاطے میں داخل ہونے والے اپنی حفاظت کے خود ذمہ دار ہونگے۔ ہم کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے۔
- بچے صرف اس صورت میں شیشہ بند کاروں میں اندر جا سکتے ہیں۔ جبکہ کار میں ڈرائیور کے علاوہ اور کوئی متنفس ان شرارت کے پتلوں کو قابو میں رکھنے کے لئے موجود ہو۔ بچوں کو کسی حالت میں بھی گاڑی کی پچھلی سیٹوں پر تنہا نہیں چھوڑا جائے گا۔

"ریزرو" کے اندر کتے یا دیگر جانوروں کے لے جانے پر سخت پابندی ہے۔

- شیروں کے احاطے میں تمام مندرجہ ہدایات کی سختی سے پابندی لازمی ہے۔ گاڑیوں کے شیشے یا دروازے وا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ بندروں کے جنگل میں بھی یہی قانون نافذ العمل ہے۔
- شیروں کے احاطے یا بندروں کے جنگل میں کار چھوڑ کر جانا یا کار سے باہر نکلنا خطرے کو دعوت دینا ہے۔ اگر شومیٔ قسمت سے آپ کی گاڑی خراب ہو جائے تو باہر نہ نکلیے۔ بلکہ ہارن بجا کر محافظوں کو متوجہ کیجئے۔ وہ گشتی گاڑی میں آ کر آپ کی مشکل حل کر دیں گے۔
- "ریزرو" کے اندر کسی شیر یا بندر یا کسی اور جانور یا پرندے کے ہاتھوں آپ کی گاڑی یا اس کے ٹائروں یا دیگر لوازمات کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر صبر کیجئے۔
- "ریزرو" کے جانوروں کو کچھ کھلانا پلانا سخت منع ہے اس فعل قبیح سے اُن کی عادت خراب ہو جائے گی اور بعد میں آپ اور آپ کے بھائی بندوں کو سخت پچھتانا پڑے گا۔
- شیروں، بندروں، زیبروں، زرافوں اور دیگر جانوروں کی تصویریں بیشک اُتاریئے مگر ان تصاویر کو کسی نفع بخش تجارت میں ہرگز استعمال نہ کیجئے۔ ان تصاویر کے جملہ حقوق بحق دو برن وائلڈ لائف مل کنگ ڈم محفوظ ہیں۔ ؟

ہم ایک پونڈ کا ٹکٹ ونڈ سکرین پر چسپاں کر کے جونہی آزاد شیروں کے احاطے میں داخل ہوتے ہمیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر محافظوں کی گاڑیاں نظر آئیں۔ جن کے پاس ہی بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں اور چاق و چوبند مسلح محافظ وائرلیس اور دیگر آلات سے لیس تھے۔ ہم تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ چند بندروں نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا اور کار کے اگلے حصے پر چڑھ آئے۔ چوہدری دلیش نے حسب عادت بندروں کی زبان میں علیک سلیک کی اور تمام ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے کار کا ایک شیشہ محافظوں کی نظر بچا کر کھول دیا اور بندروں کا شیشے

خوردنی پیش کیں۔ حسبِ توقع بندر کھا پی کر سیر ہو گئے۔ اور سرِ عام بدتمیزی پر اُتر آئے تھے اور صدیق صاحب نے کھٹا کھٹ ان کی چند تصویریں کھینچ لیں مگر بعد میں غالباً خوفِ فسادِ خلق کے باعث یہ کہہ کر ہمیں ان تصویروں کی کاپیاں دینے سے معذوری ظاہر کی کہ بندروں کی عام تصویریں کسی نامعلوم وجہ سے خراب ہو گئیں۔ چنانچہ ہم نے بھی پوچھ گچھ سے اجتناب برتتے ہوئے صرف اُن تصاویر پر اکتفا کیا جن میں پس منظر میں یا تو چند زرانے کھڑے ہیں یا پیش منظر میں چند حسینانِ فرنگ!)

WOBURN میں محلات، باغات، خوبصورت جنگلات اور جھیلوں کے علاوہ کئی جدید ریستوراں، سیلانیوں کی سہولت اور تفریح کے لئے موجود ہیں۔ ہم ایک عظیم الشان جھیل کے کنارے بیٹھ کر اردگرد کے نظاروں سے لُطف اندوز ہوتے رہے اور چہیتے درویش نے بچوں کو موٹر بوٹ کرا کے یہ لے کر ایک ہم ذوق خاتون کو ہم سفر بنایا اور اس طویل و عریض جھیل میں،

ہرچہ باد اباد ما کشتی درآب انداختیم

کا نعرہ لگا کر داخل ہوئے اور نتیجہ وہی نکلا جس کی ہم سب کو توقع تھی یعنی کشتی بیچ منجدھار میں، ہماری نظروں سے دُور جا کر خراب ہو گئی۔ اور یہ دونوں بادِ موافق کے انتظار میں دیر تک حالات کے بیرحم تھپیڑوں سے نبرد آزما رہے۔ اور یہاں غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس دوران بقیہ تین درویش خیالی گھوڑے دوڑا دوڑا کر ہلکان ہو گئے۔ اور جب انتظارِ شدید کے بعد چہیتے درویش اور اُن کی ہم ذوق ہم سفر ساحل کی طرف آتے دیکھا تو سب کی جان میں جان آئی؛

مجیب الرحمٰن

چائے

چاء یا چائے کی دریافت کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں کسی چینی درویش کو عبادت کی غرض سے بیدار رہنے میں دقت
یش آتی تھی۔ ایک رات اُس نے پورے عزم کے ساتھ مسلسل رات بھر جاگنے کا ارادہ کیا۔ لیکن کوشش کے باوجود جب وہ چونکا تو پتہ
ا کہ صبح ہو رہی تھی اور وہ رات بھر سویا ہوا تھا۔ اگرچہ اُسے اِس محاورہ کی خبر نہ تھی کہ ؎

"جو سوتا ہے سو کھوتا ہے"

نہ ہی یہ پتہ تھا کہ "کھوتا" اس میں پنجابی زبان کا ہے۔ تاہم اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں سے نابلد ہونے کے باوجود اُس نے محسوس
کہ وہ واقعی "کھوتا" بن چکا تھا۔ ایسے میں اُس نے انتہائی غصّہ کے عالم میں اپنی پلکوں کو نوچ کر زمین پر پھینک دیا۔ کیونکہ اگر وہ کھلی رہتیں
سے نیند نہ آتی اور وہ ۔۔۔۔۔ خیر بار بار تفصیل میں جانے سے فائدہ ؟ مطلب کی بات صرف یہ ہے کہ جس جگہ زمین پر اُس نے اپنی پلکیں اکھڑ
ھینکی تھیں وہاں ایک پودہ اُگ آیا جس کے پتوں میں یہ تاثیر تھی کہ اگر انہیں پانی میں جوش دے کر پیا جائے تو نیند نہیں آتی تھی۔ یہ چائے
بتدا تھی اور پھر صدیوں تک لوگ اِسے اسی مقصد کے لئے استعمال کرتے رہے۔ لیکن صرف چین میں۔ چین سے باہر یہ یورپین تاجروں کے
ل لوٹ اور چوری کے مال کے طور پر پہنچی اور جس طرح بے ضابطہ چور جلدی میں سامنے آنے والی ہر چیز کو بے سوچے سمیٹ کر چلتا بنتا
ی انداز میں یورپین تاجر بھی لوٹ کے اس مال کو ترکیب استعمال کے پرچہ کے بغیر ہی لے کر چلتے بنے۔ سینکڑوں میں چائے کی پتی کا استعمال
کہ گوری قوموں کے عقلمند افراد اِسے اُبال کر پانی تو پھینک دیتے اور پتی کو روٹی کے ہمراہ نوش فرماتے۔ معلوم نہیں آج کے چکن، مٹن اور ٹومیٹو
چ کے مقابلہ میں چائے کی خشک بدمزہ پتی کا سینڈوچ کیسی بہار دیتا ہوگا۔ ہو سکتا ہے صرف فیشن کے تقاضے سے مجبور ہو کر کھایا جاتا ہو کہ یہ
ہر زمانہ میں بنی نوع انسان کے ساتھ رہی ہے۔ یا پھر فقط

"زر می خورم"

ل کے تابع زہر مار کیا جاتا ہو۔

قت گزرنے کے ساتھ نہ صرف صحیح ترکیب استعمال کا پتہ چل گیا۔ بلکہ سرد آب و ہوا میں گرم مشروب کی ضرورت کے باعث اسے خوب
 حاصل ہوئی اور اس خاصیت کی اس قدر شدت اور سرگرمی سے اشتہار بازی ہوئی کہ ایک عام اور سہل مشروب کے طور پر جہاں کہیں دو
 چائے کا دور لازمی ہو جاتا۔ بلکہ اگر ملاقات کا موقع نہ بھی آتا تو فرد واحد بھی اپنی تنہائی کے احساس کو دور کرنے کے لئے صرف اور لازمی
ئے ہی کا سہارا لیتا۔ اور آہستہ آہستہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ خوشی ہو۔ اُداسی ہو۔ سستی کا احساس ہو یا کسی نوعیت کی بھی غیر معمولی

پورے طور پر نظر انداز ہو گئی
ایسی کیفیت ہو اُس میں چائے کا استعمال لازمی ہونا چاہیئے۔ اس سالے ہنگامہ اور ہاؤ ہو میں نیند بھگانے والی خصوصیت
یسے بھی یورپی اور مغربی ممالک میں شب بیداری کے لئے مے خواری، ناچ۔ راگ رنگ اور اسی نوع کی دیگر گفتنی و ناگفتنی مصروفیات کے ہوتے
ہوتے نہ تو عبادت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی صرف اس غرض سے نیند کو دُور رکھنے کی حاجت۔
اپنے ہاں چائے چونکہ چین کی بجائے براستہ انگلستان آئی۔ اس لئے کسی حد تک جذبہ حُب الوطنی کے تحت فرنگی تہذیب اور اس کے لوازمات
سے نفرت کے باعث چائے کی مخالفت ہوئی۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہاتھ ہاتھ بھر لمبے گلاسوں میں لسی۔ دودھ اور شربت پینے اور ایک ہی
سانس میں اُنہیں خالی کر دینے والوں کو چار اونس کی پیالی میں گھونٹ گھونٹ چائے سڑکتے رہنا راس نہ آیا۔ نتیجہ یہ کہ بھرپور مخالفت ہوئی یہاں تک کہ

شاعری میں بھی ؎

اِس چاء کی ہم کو چاہ نہیں
اِس چاء کو چاہ میں ڈال دو

قسم کے خیالات در آئے۔
سُنا ہے کہ بعض حریت پسند نوجوانوں نے فی الواقع چاء کو چاہ میں ڈال دینے کی سرگرم تحریک چلائی اور اس عزم کے ساتھ کہ واقعی چائے سے کنوئیں
بھر دیں گے۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف بدیشی ذرائع سے چائے کی درآمد بڑھ گئی بلکہ چکھتے چکھتے وہ خود بھی اس موذی شے کے عادی ہو گئے۔ ان کی عادت اَ
چائے کی کمپنیوں کی کوشش سے اب نئے نئے محاورے میں وجود میں آنے لگے اور چاء کو چاہ میں ڈالنے کی بجائے

(۱) گرمی کا توڑ گرم چائے
(۲) گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔

جیسے نعرے سُننے میں آنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ آم جیسے بہشتی پھل کے لئے۔

"میٹھے ہوں اور بہت ہوں"

کا معیار رکھنے والی تہذیب کے تدریجی ارتقاء کے تحت اب چائے جیسی علت کے لئے اُصول وضع ہونے لگے جن میں سے زیادہ مشہور یہ ہوا کہ ــــ

لب سوز ہو (گرم اسقدر)
لب دوز ہو (میٹھی اتنی ہو)
لب ریز ہو (یا لب پیالی بھری ہو)

اور قارئین کرام ایک دفعہ جو چائے اس ملک میں آ گئی تو پھر یاد محبوب کی طرح نہ صرف "آتی چلی گئی" بلکہ "ہر نقش ماسوا کو مٹاتی بھی چلی"
چنانچہ ہم نے شربت۔ لسی۔ دودھ ہر چیز کو بھلانے کے علاوہ چائے کی محبت میں تن من۔ دھن سب کچھ لٹا دیا۔ چائے کی کمپنیاں جو شروع میں صبح
صبح اور شام چائے بطور ناشتہ کے پینے پر زور دیتی تھیں بتدریج "ہر وقت چائے کا وقت ہے" کے نعرہ پر آ گئیں۔ ہر نیک مشورہ قبول
صالح لوگوں کی طرح ہم نے اس پر بھی آمنا و صدقنا کہا اور شہر۔ دیہات۔ گھر یا دفتر۔ پارٹی یا پکنک ہر جگہ اور ہر وقت چائے کا دور
ہو گیا۔ یعنی مسئلہ یہ نہیں رہا کہ چائے ہو گی یا نہیں بلکہ صرف یہ کہ

"کون سی جناب ؟"

غرضیکہ ہر قسم کی چائے ہوتی رہی اور اس قدر فراوانی کے ساتھ کہ ہم نے طلب اور رسد کے اصول اُلٹ پلٹ کر دیئے اور اربوں روپیہ
سالانہ کی چائے خریدنے کے باوجود ہماری طلب میں کمی نہ آئی اگرچہ چائے کی کمپنیاں رسد کے معاملے میں عاجز آگئیں۔ ان بیچاروں نے بالخواستہ
ادی خدمت کے جذبہ سے مجبور ہو کر چائے کا مصنوعی رنگ سفوف کی شکل میں بھیجنا شروع کر دیا۔ کروڑوں روپے سالانہ کا یہ رنگ بھی چاہ
یے ہماری چاہ کو پورا نہ کر سکا تو ہم نے خود ہی چائے کی متبادل اشیاء دریافت کر کے استعمال کرنا شروع کر دیں۔ چنے کے چھلکے اور لکڑی کا رنگا
ا برادہ اس سلسلہ میں خاصے مددگار ثابت ہوئے اور ہم لوگ اپنے جذبہ اور شوق میں ہر چیز کو چائے سمجھ کر پیتے چلے گئے۔
اگرچہ شروع میں ہمارے بزرگوں کے دلوں میں چائے کی چاہ نہ تھی۔ لیکن بعد ازاں اس نظریہ میں مناسب تبدیلی آگئی چنانچہ ایک موقع پر جب
تے اُردو سے سوال کیا گیا۔

"مولانا چاہ اچھی چیز ہے یا بُری۔"

ولانا نے فی البدیہہ جواب دیا ——

"اچھی ہے بشرطیکہ لپٹن کی ہو۔"

ا نچہ اب مردوں نے چائے اور چاہ دونوں سے نباہ کرنا سیکھ لیا ہے اور وہ اس طرح کہ چائے مرد حضرات زیادہ پیتے ہیں لیکن چائے بیالی میں
نے اور پیش کرنے کی ذمہ داری عورت پر ڈال دی ہے۔ اسی ضمن میں کہا جاتا ہے کہ چائے تیار کرنا ایک فن ہے جس میں مرد حضرات خواتین کی نسبت
ادہ ماہر بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مردوں میں طلباً خاص کر یونیورسٹی کے طلباً چائے بنانے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں شاید
س لئے کہ طلباً عملی زندگی میں قدم رکھنے سے قبل ہی اس فن مبارک میں عورتوں پر اپنی برتری قائم رکھنے کی تیاری کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ چائے
نے اور پینے پر توجہ زیادہ رہتی ہے اور حصولِ تعلیم پر کم۔ اس کا ثبوت امتحانات کے نتائج ہیں جن میں بتدریج لڑکیاں زیادہ درخشاں کامیابیاں حاصل
ر رہی ہیں۔

ہمارے یہاں ابھی تک چائے کو دفیعہ نیند کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ طلباً۔ اساتذہ۔ اخبار نویس۔ رات کو ڈیوٹی دینے والے
زمین اور ان کے علاوہ رات کو چلنے والے بس اور ٹرک ڈرائیور بیدار رہنے کے لئے تیز قسم کی چائے کا استعمال لازمی قرار دیتے ہیں بلکہ ان میں
اکثر تو اس کے تاثر کو دو آتشہ کرنے کے لئے اس کے ساتھ سگریٹ (ہو سکے تو چرس والا) کا اضافہ ضروری گردانتے ہیں۔ چنانچہ ادھر
ئے کی پیالی سامنے اِدھر انہوں نے سگریٹ سُلگائی اور یوں "غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لیا"۔ اُن کا بیان ہے کہ چائے اور سگریٹ
متوازی استعمال سے ہر دو کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ؎

کھڑک سنگھ کے کھڑکنے سے کھڑکتی ہیں کھڑکیاں ؎ اور کھڑکیوں کے کھڑکنے سے کھڑکتا ہے کھڑک سنگھ

بحمہم تابہ ابد سعی و تغیر کے امیں ہیں" اس لئے ہم نے چائے کی تیاری میں مروجہ انداز سے ہٹ کر مختلف نوع کے مشروبات تیا
ئے ہیں۔ نمونہ کے لئے چند خصوصی اقسام درج ذیل ہیں:-

(۱) سلیمانی چائے بلوچستان اور سندھ میں کچے راستوں پر استعمال ہونے والی کافی چائے کا قہوہ بغیر دودھ اور چینی کے مبادا اوقات
رف نمک کی چٹکی کے ہمراہ۔ بہت ہوا تو گڑ کے شیرہ کا ہلکا سا تڑکا لگا ہوا۔ وجہ تسمیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جب تک آپ پہلا گھونٹ نہیں

کیونکہ اس کے ساتھ آنکھوں کے آگے جنات رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔
یہ دراصل اونٹوں کے قافلوں کے ساربانوں یا شکستہ حال نیم مردہ خالی ہاتھ واپس آنے والے فنکاریوں کا مشروب ہے جو سرِراہ واقع
ہو سپونس ہوٹل، انٹرکانٹی نینٹل کے دام پر پیش کرتے ہیں۔ اُس حال تو وہ غریب ایسی چائے تو کیا زہر پینے پر بھی آمادہ ملیں گے۔ یہ چائے ہم نے
بھی پی ہے اور ہمیشہ ہم پر احسان کرکے پلائی گئی۔ چائے سے زیادہ یاد رکھنے کے قابل چائے پلانے والے کا نخرہ ہوتا ہے۔
کڑک چائے ہلکی چینی۔ کم دودھ اور بہت تیز پتی کی بدذائقہ چائے جو سیٹھ لوگ امارت کے باعث اور غریب دانشور ذہن کو
تیز اور جسم کو چست رکھنے کے لئے پیتے ہیں۔ ہوٹلوں کی اصطلاح میں اسے "طاقتور" یا سٹرانگ strong چائے بھی کہتے ہیں۔ مگر اس
نام سے ہم کو اصولی اختلاف ہے کیونکہ طاقت یا strength تو دودھ میں ہوتی ہے۔ اس لئے کم دودھ والی چائے سٹرانگ کیسے ہو سکتی ہے لیکن۔
"برعکس نہند نام زنگی کافور"
والی بات ہے۔ ہم لاکھ بحث کریں ہوٹل والے یہی جواب دیتے ہیں کہ "صاحب سٹرانگ چائے تو کم دودھ والی ہی ہوتی ہے۔
(۳) لاٹ صاحب والی چائے بڑے بلکہ بہت بڑے لوگوں کی پسندیدہ اعلیٰ برتنوں میں کم پتی بے حد ہلکی چائے۔ دودھ بقدرِ اشک
بلبل اور چینی برائے نام۔ ذائقہ فی الواقع اُبلے ہوئے بدمزہ پانی کا سا۔ لاٹ صاحب کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی بدرجہ مجبوری پیتے ہیں۔ دل ہی
خود کو صلواتیں سناتے ہوئے لیکن پیتے وقت مسکراتے رہتے ہیں۔
ہم نے ایک محفل میں ایک صاحب کو اس بات پر واویلا کرتے دیکھا کہ اُن کے سامنے لاٹ صاحب والی چائے کی پیالی آگئی تھی لیکن اعتراض
اُن کو صرف یہ تھا کہ وہ "غریب آدمی" تھے اور لاٹ صاحب والی چائے پینے کے اہل نہ تھے۔ چنانچہ وہ بتکرار پٹواریوں والی چائے طلب کرتے
جو اُن کے status کے مطابق تھی۔
پٹواریوں والی چائے الائچی کی خوشبو والی۔ مروجہ کنڈے والی چار اونس کی پیالی کی بجائے گول بڑے پیالہ میں پی جاتی ہے۔
کم از کم نصف حصہ بے حد خالص گاڑھا دودھ۔ بہت بلکہ بے اندازہ تیز چینی اور اوپر برسات کے گھنے بادلوں کی طرح تہہ در تہہ بالائی۔ کم
دو پیالہ فی کس پی جاتی ہے۔ بغرض منصد لوگ پٹواریوں کے علاوہ سرکاری اہلکاروں کے لئے بھی بنواتے ہیں اور بعد میں خود بغیر دودھ اور چینی کی چائے
پینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
ڈرائیوروں والی چائے پورے ملک میں عام فہم نام تو یہی ہے۔ لیکن پنجاب کے بالائی علاقوں (یہ وہ بالائی نہیں جو پٹواریوں والی
کا جزو لازم ہے) اور صوبہ سرحد کے اکثر علاقوں میں اسے دودھ پتی بھی کہتے ہیں۔ صرف دودھ۔ چینی اور چائے کی پتی سے تیار ہوتی ہے
تیاری کے لئے کھلے منہ کا برتن ضروری ہے پہلے صرف دودھ چولہے پر رکھا جاتا ہے۔ جوش آنے پر (دودھ کو۔ چائے بنانے والے یا آرڈر
دینے والے کو نہیں) اس میں دو دو منٹ کے وقفے سے باری باری چینی کا ایک چمچہ اور چائے کی پتی کا چھینٹا مارا جاتا ہے۔ دن میں پینے والے
چائے میں یہ عمل تین مرتبہ اور رات میں پینے والی چائے میں پانچ مرتبہ دوہرایا جاتا ہے۔ اور بس چائے تیار۔ لمبے راستوں پر چلنے والے
ڈرائیوروں کا مرغوب نسخہ ہے لیکن اب شہری علاقوں میں سرگرم عمل سمگلروں کو رات کی مہمات کا سہارا بھی یہی چائے ہے کیونکہ یہ انہیں
غفلت کی نیند سے بچاتی ہے۔ دوسری جانب اس کے استعمال میں خطرہ بھی ہے۔ محکمہ کسٹم کے ایک دوست نے بتایا ہے کہ مشکوک لوگوں

شان دہی اکثر اوقات رات کے وقت دودھ پتی یا ڈرائیوروں والی چائے کا آرڈر دینے سے ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لگے ہاتھوں چائے کی اُن اقسام کا ذکر ہو جائے جن میں چائے کے مروجہ لوازمات یعنی دودھ اور چینی حتیٰ کہ چائے کی پتی تک استعمال ہیں ہوتی پھر بھی وہ چائے ہی کہلاتی ہے اُن کے ذکر کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہے گا۔

پہلی مشہور قسم کراچی کی مخصوص کڑک چائے ہے جس میں دودھ، چینی، پتی ہر سہ لوازمات نہیں ہوتے۔ اس کی تیاری کے لئے صرف سیر یا دو سیر کھجور کاٹ کر پانی سمیت سماوار میں ڈال دیتے ہیں اور کھولاتے رہتے ہیں۔ پانی کم ہوا تو اور ڈال دیا۔ صبح کی ڈالی ہوئی کھجور شام تک بلکہ بسا اوقات کئی دن چلتی ہے۔ ہلکی مٹھاس اور قدرے سفیدی مائل گدلا پن پانی میں آجاتا ہے جسے چائے کے نام پر شیشے کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں بیچا جاتا ہے۔ گلاس میں تین چوتھائی مقدار کی مناسبت سے اسے کراچی کی زبان میں "پونیا"، چائے بھی کہا جاتا ہے کروڑ پتی تاجروں کا مرغوب مشروب ہے کیونکہ مقدار اور قیمت دونوں ان کی استطاعت میں ہوتی ہیں۔ دن بھر یہاں وہاں کاروباری ملاقاتوں اور تجارتی بات چیت میں درجنوں کے حساب سے اسی چائے کے گلاس ایک ایک سیٹھ لوگ خود پی جاتا ہے۔ دوسروں کو صرف شدِ ضرورت (اپنی) کے وقت پلاتا ہے۔

دوسری قسم "مالاباری"، یا "ایرانی"، ہوٹلوں کی "مکس چائے" (Mixed tea) کی ہے۔ اس میں بھی دودھ، چینی یا پتی نہیں ہوتی پتی ہ چائے کا رنگ ہوتا ہے اور اصلی دودھ کی بجائے وہ دودھ ہوتا ہے جو خشخاش کو پیس کر پانی ملانے سے بنایا جاتا ہے۔ دودھ چولہے پر مسلسل گرم ہوتا رہتا ہے۔ جب گاڑھا ہوا ایک مگ پانی ملا کر پھر سے کثافت بحال کر لی جاتی ہے۔ زیادہ کامیاب دوکاندار اس دودھ کی تیاری ہ سادہ پانی کی بجائے پوست میں جوش دیا پانی ملاتے ہیں۔ چینی کی بجائے اس چائے میں "سکرین" ملائی جاتی ہے۔ پوست اور خشخاش کی وجہ سے دودھ، پتی اور چینی سے بے نیاز اس "چائے" کی عادت ایک دفعہ ہو جائے تو پھر ؎

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

کراچی ہی کی تیسری قسم کی چائے جو متوسط درجہ کے نسبتاً زیادہ صاف ستھرے اور قدرے فیشن زدہ ہوٹلوں میں سیپریٹ Separate ائے کے نام سے مہیا کی جاتی ہے۔ اس میں چینی تو اصلی ہوتی ہے اور چھوٹے چھوٹے چمچ سے چینی دانوں میں اس انداز سے پیش کی جاتی ہے کہ پر کی تہہ نمدار اور نیچے کی شیرہ نما ہوتی ہے۔ دودھ اگرچہ علیحدہ دودھ دان میں ہوتا لیکن ہوتا وہی خشخاش والا ہے۔ چائے الگ چائے دانی میں تی ہے۔ لیکن اس میں تازہ پتی نہیں ہوتی۔ ایک چمچ بچا جو صبح چائے دانی میں ڈالی جاتی ہے شام تک چلتی ہے۔ ہر دفعہ گاہک کو چائے دیتے وقت ت چمچ چائے کا ولائتی درآمد شدہ رنگ شامل کر دیا جاتا ہے۔ چائے کی پتی کو مسلسل استعمال کے قابل رکھنے کے لئے ایک دن استعمال کے بعد ے دن آرام دیا جاتا ہے۔ جس میں اسے دھوپ سے خشک کیا جاتا ہے اگلے دن پھر استعمال اور پھر ایک دن کی دھوپ۔ اس طریقہ سے ، کو لازوال کر لیا جاتا ہے۔

چائے کی عادت اور چائے سے لطف حاصل کرنے کی کیفیت پوری قوم میں سرایت کر چکی ہے لیکن پڑھے لکھے اور خصوصاً دانشور طبقہ اس کا استعمال سب حدیں عبور کر گیا ہے۔ شعراء، ادیب، صحافی اور ذرائع ابلاغ سے تعلق رکھنے والے فرد اس ضمن میں خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ کسی

باطانی جیکموں کے لئے ایک پھبتی کہی جاتی تھی کہ

گولی اندر دم باہر

یہی کیفیت کچھ مندرجہ بالا شعرا کی ہے کہ چائے اندر جائے تو ہی شعر یا خیال موزوں باہر آسکتا ہے۔ اس لئے بے تکان بے تحاشا ساب چائے پیتے ہیں۔ اور نہ ہو تو آمد کے انتظار میں۔ یہاں تک کہ اب بیماری کی صورت میں خون دینے سے پہلے ڈاکٹر لوگوں کو دریافت تا ہے کہ مریض کہیں دانشور تو نہیں۔ کیونکہ ایسے مریضوں کی رگوں میں خون کی بجائے بھی چائے ہی رواں رہتی ہے اور انہیں اصلی خون دینے ت میں جان جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو سنگین بیماری کی صورت میں بھی چائے ہی کا Transfusion دیا جاتا ہے۔ دفتروں کے پڑھے لکھے لوگ بھی چائے پینے میں کچھ پیچھے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دفتر چھوٹا ہو یا بڑا اس سے ملحق ایک چائے خانہ یا ضروری ہے۔ جس تندہی سے کنٹین میں ملازم چھوکرے چائے لے جانے اور خالی برتن واپس لانے میں دن بھر مصروف رہتے ہیں۔ اس مدازہ ہو سکتا ہے کہ دفتروں میں کام کرنے والے جنتی لوگ فی الحقیقت چائے کی رواں نہروں کے کنارے ہی بیٹھ کر کام کرسکتے ہیں۔ دوسری بھی وجوہات ہوں لیکن اپنے ہاں تو بیویوں سے اصل آمدنی چھپانا اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ پوری تنخواہ کا معتدبہ حصہ تو چائے نوشی کی ہو جاتا ہے۔

دفتروں میں چائے اور اس کے لوازمات مہمان نوازی کا لازمہ ہیں۔ لیکن اس میں ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ ہے۔ چنانچہ کسی بھی کمرے اندر جانے والی چائے کی ٹرے سے آپ اس کمرہ میں بیٹھنے والے کی حیثیت یا سرکاری گریڈ کا بہت حد تک حتمی اندازہ لگا سکتے ہیں چنانچہ ست رشتہ کے سلسلہ میں تحقیق کرنے والے حضرات کسی شدید غلطی کے خطرہ سے بے نیاز ہو کر بآسانی مندرجہ ذیل گوشوارہ کو اپنی جستجو کی اس بنا سکتے ہیں۔

		کلرک اور گریڈ ۱۴ تک دیگر ملازمین
(۱)	دیسی پیالوں میں مکس چائے	
(۲)	دیسی برتنوں میں الگ الگ دودھ اور چینی والی چائے بمعہ کباب اور سلائیس	گریڈ ۱۶
(۳)	نمبر ۲ والی چائے بمع سموسے	گریڈ ۱۷ اور ۱۸
(۴)	نمبر ۲ والی چائے بمع بسکٹ	گریڈ ۱۹
(۵)	عمدہ برتنوں میں صرف خالی چائے دودھ۔ چینی الگ الگ	گریڈ ۲۰
(۶)	عمدہ برتنوں میں صرف قہوہ چینی والا	گریڈ ۲۱
(۷)	بہت عمدہ برتنوں میں بغیر چینی والا	گریڈ ۲۲

ملک میں فزوں تر چائے نوشی کی عادت سے پیدا شدہ چائے کی کمی کو دور کرنے کی کوشش میں پاکستان میں بھی چائے کی کاشت تجربہ کیا گیا ہے۔ اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی ہے۔ لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ ہمارے کاشت کردہ پودوں کی پتیاں بہت سخت اور رنگ و بو سے خالی نکلی ہیں تحقیق سے اس سخت اور بے رنگ و بو چائے کی وجہ یہ نکلی کہ جہاں چین میں چائے کا پودا نرم و نازک ھیں سے پروان چڑھا وہاں رستم نے غلطی سے اپنی مونچھیں اکھیڑ کر زمین میں گاڑ دی تھیں۔

سلمیٰ یاسمین نجمی

قریہ بہ قریہ کو بہ کو

نیویارک

فریب اُجالے کے دینے والے کچھ اور اندھیرا بڑھا رہے ہیں
دیے جلانا تو دور ٹھہرا، دیے سلگتے بجھا رہے ہیں (علی احمد جلیلی)

کنیڈی ائر پورٹ یقیناً ہیتھرو سے بڑا ہے۔ مگر یہاں وہ ہنگامہ اور شور شرابا نظر نہ آیا۔ ہر چیز بڑی منظم اور سنبھلی سنبھلی تھی۔ ہر ایئر لائن کا حصہ الگ تھا۔ اس لیے انسانوں کا اتنا جم غفیر اور بے تحاشا بھاگ دوڑ نہیں تھی۔ بچوں نے منی یا ٹی ماوزی پھل کے پیکٹ اپنے بیگ میں رکھ لیے تھے کہ بعد میں کھائیں گے۔ کسٹم والے نے وہ نکال لیے اور قدرے سختی سے پوچھا "کیا ہے" حالانکہ اسے بھی نظر آ رہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے تو اس نے بڑی بدتمیزی سے ڈانٹا "وہ مذاق کر رہا ہے۔" لڑکے دم بخود رہ گئے، مسکراہٹیں لبوں پر دم توڑ گئیں۔ اس نے پیکٹ اٹھا کر کوڑے کے ٹین میں پھینک دیے۔ لندن والوں کی نرمی اور شائستہ لب و لہجے کے بعد یہ سختی اور بدتمیزی بڑی عجیب اور ناخوشگوار تھی۔ امریکہ نے ہمارا استقبال "اہلاً و سہلاً" سے نہیں کیا۔ بلکہ ایک سپر پاور کے طنطنے سے کیا۔ ہم بے چارے تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملک، وہ دنیا کی طاقت، وہ سخی داتا، ہم کشکول بدست، وہ بادلوں کی طرح سفید ہم مٹی کی طرح بھورے وہ بھڑکتی آگ ہم موم کے مجسمے۔ اگر ان کے لہجوں میں ہمارے واسطے سنگ و آہن کی سختی ہے تو حق بجانب ہیں۔ ہم تو مصطفیٰؔ کا شعر پڑھ کر چپ ہو گئے ؎

دل سے گزر خدا کے لیے اور ہوشیار
اس سرزمیں کے لوگ بہت بدکلام ہیں

اس بدکلامی کا تجربہ آگے چل کر بھی ہوا۔ انگریز بہت لیے دیے رہتا ہے۔ بے تکلف نہیں ہوتا۔ کھلتا نہیں اپنے گرد و بیگانہ خود اپنے اندر مست نظر آتا ہے مگر پھر بھی بدتمیزی نہیں کرتا۔ خشک جملے بھی تہذیب اور اخلاق کے ریشم میں لپیٹ کر وہ کونین پر چینی چڑھانا نہیں بھولتا۔

محمود بھائی عابدہ اور چھوٹی مریم لینے آئے ہوئے تھے۔ ان کا گھر قریب ہی بادر فرنیچ پر ہے۔ ہم لوگ باتوں

ہوتے کہ پتہ ہی نہ چلا کب گھر آگیا۔ تین بیڈ رومز کا چھوٹا سا کمپیکٹ گھر ہے۔ امریکہ میں عموماً ایسے ہی گھر ہوتے ہیں۔ بڑے
گھر سنبھالنا آسان نہیں۔ ان کے دوسرے بھائی کا فون آگیا کہ جلدی پہنچو کہ ہم بے چینی سے منتظر ہیں۔ وہ نیویارک
سینتیس میل دور وائٹ پلینز میں رہتا تھا۔ فوراً تیار ہوئے اور چل پڑے۔

سڑکوں کے یہاں مختلف نام ہیں۔ اپنی رفتار کے حساب سے تیز رفتار ایکسپریس وے کہلاتی ہیں۔ کسی پارک کے
سے گزریں تو پارک وے ہوگئیں۔ اسی طرح کچھ سڑکیں شہروں کے اندر ہوتی ہیں کچھ شہروں کو ملاتی ہیں اور کچھ دریا سے اوپر
ٹریفک کی رفتار پہ سخت پابندی ہے۔ پچپن میل فی گھنٹہ سے نہ زیادہ چل سکتے ہیں نہ کم۔ زیادہ چلیں تو چالان کم چلیں تو
گاڑیوں سے ٹکرانے کا خدشہ یا پھر پچھلوں کی گالیاں سنو۔ چوڑی چوڑی صاف ستھری سڑکوں پہ بیک وقت چھ آٹھ
آتی جاتی ہیں۔ سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بلکہ کئی منزلہ سڑکیں تھیں جن پر گاڑیوں کا سیلاب رواں دواں تھا۔ دور دور
شہر پھیلا ہوا تھا۔ سمندر بھی اپنی جھلک دکھلا رہا تھا۔ دریا بھی موجود تھا۔ باتوں کا ایک چکر چل رہا تھا کہ باہر ڈھنگ
دیکھنے کا موقع نہ ملتا تھا۔

سعید دروازے پر منتظر تھا۔ ہم اس کے دونوں بیٹوں اور بیٹی کو پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے یہ ہوتا ہے فاصلوں
خون کے اٹوٹ رشتوں میں منسلک ہو کر بھی انسان ایک دوسرے سے کتنا دور ہو جاتا ہے۔ بچوں کے لیے تو ہم اجنبی
وہ کیا جانیں چچا چچی یا چچا زاد کیا ہوتے ہیں۔ اجنبیت کی یہ دیوار آخر تک قائم رہی۔ اور ہم نے بھی اُن کو بتدریج پ
پروان چڑھتے کب دیکھا۔ ہم فیملی روم میں بیٹھے تھے۔ اُسی کمرے کے ایک کونے میں کچن تھا۔ باتیں ہنسی مذاق چٹکلے دور
ماضی حال اور مستقبل کی باتیں اور پروگرام ہمارے ہاتھوں میں گاڑھی گاڑھی لسّی کے گلاس تھے۔ باتوں اور لسّی کی مٹھاس
گئی تھی۔ ریحانہ کھانے کا اہتمام بھی کر رہی تھی اور گفتگو میں حصہ بھی لے رہی تھی۔ ریحانہ کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے۔ ا
والد نواکھالی کے رہنے والے ہیں۔ کمرے میں جگہ جگہ پٹ سن اور بانس کی مصنوعات سجی ہوئی تھیں اور بہت کچھ
رہی تھیں۔ پنجاب اور بنگال کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ دونوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خط کھینچ گیا ہے۔ گرد آلود
اس توڑ پھوڑ اور سرحدی لکیروں کو کب مانتے ہیں۔ اُن کے عہد و پیمان اور رفاقتوں پر نہ سیاستدانوں کی جوڑ توڑ کا
ہے نہ تعصب اور نفرت کا۔ ویسے بھی اہلِ پنجاب کا دل اور ظرف بڑا ہوتا ہے۔ ریحانہ کی گلابی اُردو میں رس
کی مٹھاس تھی۔ اس نے ہمارے لیے دنیا بھر کی چیزیں پکائی ہوئی تھیں۔ تربوز بے حد میٹھا اور لذیذ تھا۔ بس یہی ایک
پسند آیا۔ باقی تو ہر پھل کا ذائقہ یکساں تھا۔ رس اور شیرینی سے خالی، مصنوعی طریقے سے موٹے اور صحت مند کیے
اوپر سے خوشنما مگر اندر سے پھوکے۔ ہاتھی کے دانتوں کی طرح محض دکھانے کے لیے، کھانے کے لیے نہیں۔

نو بجے شب واپسی ہوئی۔ جاگتے جاگتے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ نیند کے جھونکے آ رہے تھے۔ نیویارک
دمکتی روشنیاں بھی آنکھیں کھولنے میں ناکام رہیں۔

اگلے روز دوپہر کے کھانے کے بعد مشہور چین سٹور میسیز چلے گئے۔ یہاں کے سٹور بڑے خوبصورت ہوتے ہیں
کی سجاوٹ میں بھی خاص دیدہ ریزی سے کام لیا جاتا ہے۔ لگتا ہے کسی الف لیلا کے محل میں گھوم رہے ہوں۔ او

چھتیں بڑے بڑے فانوس ایئر فریشنر کی خوشبو سے مہکتے ٹھنڈے ٹھار مصنوعی درختوں اور پودوں کی چھاؤں میں حسین و جمیل مجسمے دلکش لباسوں میں دل آویز اداؤں کے ساتھ خریداروں کو تکتے۔ نقل کو دیکھ کر انسان اصل کو بھول جائے۔ ہر طرف سامان ہی سامان نہ حد نہ حساب۔ مگر ہجوم ندارد۔ لندن والی کھچ کھچ اور بھاگم دوڑ نہیں تھی۔ ہم مزے مزے سے ٹہل رہے تھے اور چشم روشن اور دل شاد کر رہے تھے۔ سیل لگی ہوئی تھی۔ امریکہ کی ایک خصوصیت ہے سیل جو سارا سال کہیں نہ کہیں کبھی نہ کسی بہانے لگی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ پٹرول اور بال کٹائی پر بھی سیل لگ جاتی ہے۔ اور سیل بھی واقعی سیل ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ اصل قیمت سیل والی لگا دی اور اس سے زیادہ لکھ کر کاٹ دی۔ یورپ کے مقابلے میں امریکہ بہت سستا ہے۔ اکثر اشیاء تو پاکستان کے مقابلے میں بھی سستی ہیں۔ لندن میں جو چیز ایک پونڈ میں ملتی ہے وہ یہاں ایک ڈالر میں دستیاب تھی۔ ایک پونڈ تقریباً بیس اور ڈالر دس پاکستانی روپوں کے برابر ہے۔ آمدنی کے تناسب سے یہاں ڈالر کی وہی اہمیت ہے جو ہمارے ہاں ایک روپیہ کی ہے۔ اعلیٰ کوالٹی کی چیزیں بھی ہیں اور بالکل تھرڈ کلاس بھی۔ کوریا تائیوان، ہانگ کانگ مارکیٹ پر چھائے ہوئے ہیں۔ مصنوعی پھول بڑے نازک اور نفیس تھے۔ قیمت سن کر دل پر پتھر رکھا اور آگے بڑھ گئے۔ کوئی چیز خریدتے ہوئے اگر اُن سے قیمت کم لگ جائے تو وہ ہم سے زائد لینے کے سزاوار نہیں۔ اپنے قصور کو تسلیم کر کے سر خم کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر زائد لگ جائے تو ہم بل دکھا کر زائد رقم واپس لے سکتے ہیں۔ اسے یہاں کا طریقہ یا قانون سمجھ لیں۔

گوشت پوست کی پہاڑیاں جانگیے اور بنیان نما ٹی شرٹس پہنے گھوم رہی تھیں۔ یہاں سے زیادہ موٹے مرد عورتیں اور بچے اور کہیں نظر نہیں آتے۔ خوب کھاتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے نہیں کھاتے بلکہ زندہ ہی کھانے کے لیے ہیں۔ خوش ہوں تب بھی کھاتے ہیں افسردہ ہوں تو بھی کھاتے ہیں۔ سبحان اللہ! زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی قسم کی بھوک باقی نہ رہے۔ روز و شب تن من دھن کی بھوک مٹانے میں مصروف رہتے ہیں۔ البتہ من کی بھوک کا مفہوم ان کا ہم سے مختلف ہے۔ ان کا من پینے کی بجائے کہیں اور واقع ہے۔ انسان اگر موٹے تازے لمبے چوڑے ہیں تو اشیاء بھی اسی طرح کنگ سائز بلکہ جن سائز ہیں۔ پھلوں کے عرق، دودھ اور مشروبات کی جناتی بوتلیں، بڑے بڑے ڈبے، فلک بوس عمارتیں طویل اور اونچے پل بے تحاشا چوڑی سڑکیں۔ بڑے بڑے باغات کہ شروع ہوں تو ختم ہونے کا نام نہ لیں غرضیکہ دیوزادوں کے اس ملک میں ہر چیز دیوزاد ہے۔

مین ہٹن کا نام نامی خوب سنا تھا۔ ٹی وی کے پروگراموں میں بھی اکثر دیکھا تھا۔ مگر سنی سنائی اور تصویروں میں دیکھی چیز سے اصل چیز کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ بسوں اور سب وے کا چکر سمجھانے کے لیے خاصا مغز کھپاتے رہے۔ وہ یہاں تنہا ڈرائیونگ کرنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ سڑکوں کی اس بھول بھلیاں میں اگر انسان ایک بار غلطی کر بیٹھے تو پھر تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہمارے طعنے اور پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سب وے اور بسوں کا ایک ہی کرایہ تھا یعنی پچاس سینٹ خواہ کہیں جانا ہو۔ بس سٹاپ تک تو پہنچ گئے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بس کس طرف سے ہیں۔ الٹے ہی نہ چلے جائیں۔ کیونکہ اسٹاپ پر کوئی ہدایت کوئی نام یا اتہ پتہ درج نہ تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بار بار واک اور ڈونٹ واک کا سائن جل بجھ رہا تھا۔ ہم مارے ڈر کے ڈونٹ واک ہی پر تکیہ کیے کھڑے رہے۔ سامنے اسکول کی پلے گراؤنڈ میں ایک بے حد موٹی لڑکی (لڑکی

ہی ہوگی) اچھل کود رہی تھی۔

بسوں کا نظام بے حد واہیات ہے ہر شخص کے پاس موٹر ہے۔ اس لیے انہوں نے بسوں وغیرہ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بس آئی تو اس کی صورت دیکھ کر ہی دل بجھ گیا۔ کھڑکھڑ کرتی گندی سی بس تھی، موٹے پلاسٹک کی میلی میلی سی سخت سیٹیں۔ روٹ کا بھی کوئی نقشہ نہ تھا۔ لندن کی بسیں بہت یاد آئیں۔ اللہ پر توکل کرکے بیٹھ گئے۔ شکر ہے بس صحیح طرف ہی جا رہی تھی۔ لبرٹی ایونیو کا سائن نظر آیا اور ساتھ ہی اوپر سر پہ دھڑ دھڑاتی گاڑیوں کا شور گونجا، ہم وہیں اتر گئے اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ نہ آدم تھا نہ آدم زاد۔ ایک دروازہ تھا سو بند تھا۔ لڑکوں نے پچاس سینٹ کا سکہ ہر سوراخ میں گھسانے کی کوشش ناتمام کی۔ نہ کھلے صاحب اندر گئے نہ سم سم کھلا۔ پہلی بار اس شہرِ عظیم سے واسطہ پڑا تھا۔ یہاں کے طور طریقوں سے قطعی انجان۔ غلیش کے بندروں کی طرح بے سود اچھل کود کے بعد اچانک یہ نکتہ ان کو یاد آیا کہ یہاں کچھ از قسمِ ٹوکن چیز استعمال ہوتی ہے جو جا کر ڈھونڈا۔ وہ پتیل کے ٹوکن لے کر آیا اور داخلے کی جگہ بھی معلوم کر آیا۔ ٹوکن ڈالا لوہے کی چرخی ہلی اور ہم باری باری اسٹیشن کے اندر داخل ہوتے۔ ہر طرف پیشاب اور امونیا کی تیز جھل تھی۔ گندے فرش اور سیڑھیاں ان پر اڑتے کاغذ کے پرزے، کہیں کاغذی گلاس خالی بوتلیں اور لڑھکتے کوک اور پیپسی کے ٹن۔ یہاں اپ ٹاؤن اور ڈاؤن ٹاؤن کا بھی ٹرا چکر تھا ہم جا اپ ٹاؤن والی ٹرین پر سوار ہوتے۔ ٹرین بھی نور اعلیٰ نور تھی۔ پوری ٹرین پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے غالباً کچھ لوگوں کو یہ مرض ہے کہ وہ اپنے خالی وقت میں ٹرین کے باہر والے حصے پر مصوری اور تجریدی آرٹ کے گل کھلاتے رہتے ہیں، گمنام مصوروں کی چلتی پھرتی آرٹ گیلریاں تھیں۔ اندر کا حال بھی خستہ تھا۔ حسبِ معمول سخت پلاسٹک کی نیلی نیلی سیٹیں اور میلے فرش، عجیب متلا دینے والی بو تھی۔ البتہ پوری گاڑی ائرکنڈیشنڈ تھی۔ کالے مسافروں کی تعداد کم سے خال خال۔ ہر اسٹیشن پر اس کے نام کا اعلان ہوتا تھا۔ دو ایک سٹیشن گزرے تو یہ گھبرا گئے کہ ہم تو شاید پھر واپس لبرٹی ایونیو جا رہے ہیں۔ کیونکہ دو چار سٹیشنوں کے بعد نقشے پر پھر لبرٹی ایونیو لکھا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ گاڑی آتے ہی اتر کر گارڈ سے پوچھا۔ اس نے تسلی دلائی کہ ہم ٹھیک جا رہے تھے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہاں پر ایک نام کے کئی کئی علاقے ہوتے ہیں۔ یہ بھی خوب رہی۔ بھئی تم ذرا دماغ پہ زور ڈال لو اور وہی نام دوبارہ رکھنے کی بجائے کوئی دوسرا رکھ لو۔ لوگوں کو الجھانے سے کیا فائدہ۔ ناموں کی کمی تو نہیں۔ مگر ان چاند ستاروں پہ کمند ڈالنے والوں کو کون سمجھاتا۔ یہ تو بیٹے کا بھی وہی رکھ لیتے ہیں جو باپ کا ہوتا ہے بس ساتھ جونیئر سینیئر کی پخ لگا دیتے ہیں۔

جمال کے پاس ایک عورت بیٹھی تھی، زردہ چہرہ، روکھے بال، لٹکتی کھال پیلی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ کپڑے میلے بار بار وہ گردن کو جھٹکے دیتی اور آنکھیں جھپکاتی تھی، وہ جمال سے بار بار کچھ کہتی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ایک ڈالر پچاس سینٹ کی بھیک مانگ رہی تھی۔

کئی بار گاڑیاں بدلیں تب خیر سے مڈ ٹاؤن مین ہٹن پہنچے۔ گرینڈ اسٹیشن دنیا کا سب سے بڑا اسٹیشن ہے۔ طرزِ تعمیر تھا۔ اونچی اونچی چھتوں کے ساتھ لٹکتے ہوئے بڑے بڑے فانوس۔ موٹے موٹے ستون، ایک پوری دنیا اندر آباد تھی سینے دروازے باہر نکلنے کے تھے جو مختلف سڑکوں پر کھلتے تھے، ہم جس دروازے سے باہر آئے وہ سٹریٹ بیالیس میں تھا، دن کے دو بج رہے تھے۔ بھوک سے برا حال تھا۔ ایک اطالوی سینک بار سے پیزا (PIZZA) خریدا۔ مز

ا تھا۔ ہمارے جیسے نان پر پنیر ٹماٹر کی چٹنی اور لال کٹی ہوئی مرچیں ڈال کر گرل کیا ہوا۔ مین ہٹن سر بفلک عمارتوں کا جزیرہ ہے۔ سر اٹھا کر دیکھیں تو چکر آ جائے۔ آخری منزل نظر نہ آئے مگر سر سے ٹوپی اور دوپٹہ ڈھلک جائے۔ دنیا کی بلند ترین عمارتیں ایمپائر اسٹیٹ اور ٹوِن ٹاورز یہیں واقع ہیں۔ یہاں آدمی سامنے یا نیچے دیکھ کر نہیں چل سکتا۔ اوپر دیکھ کر ہی چلتا ہے۔

فورڈ فاؤنڈیشن کی عمارت کے اندر شیشے میں سے استوائی جنگل کی جھلک نظر آئی ہم اندر چلے گئے۔ اندر کی آب و ہوا گرم مرطوب تھی، فضا بھیگی بھیگی اور بھاری بھاری تھی۔ حبس دم گھونٹ رہا تھا۔ ہم پسینے سے بھیگ گئے، عمارت کی جتنی بھی منزلیں تھیں باغ کی چھت بھی اتنی ہی بلند تھی، لگتا تھا کسی نے سندر بن کا ایک ٹکڑا لا کر یہاں لگا دیا ہو۔ پانی کے کنارے لمبی لمبی گھاس، سبز کائی، بلند قامت پتلے چکنے تنوں والے درخت، گڑہل کے سرخ سرخ پھول، گندھ راج کے سفید پھولوں کی خمار آلود مہک، کامنی کے نازک شرمیلے پھول، بانس کا گھنا جھنڈ، اور بھی نہ جانے کیا کیا۔ سفیدے کے درخت بالکل سیدھے تنے کھڑے تھے اُن کی پتیوں کی تیز خوشبو بھی باقی خوشبوؤں میں گھل مل گئی تھی۔ ہم اس استوائی جنگل سے باہر نکل آئے۔ عرق آلود چہرے پر ٹھنڈک کا احساس بڑا خوشگوار تھا۔ ایک گہرا سانس لیا اور آگے چل دیے۔

بیالیس اور اڑتالیس سٹریٹ کے درمیان یونائیٹڈ نیشنز کی شاندار اور باوقار عمارت تھی۔ مشرقی دریا کے کنارے سولہ ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی یہ عمارت دو حصوں پر مشتمل تھی۔ سیکرٹریٹ کی انتالیس منزلیں جو شیشے اور سنگ مرمر سے بنی ہیں اور ساتھ ہی جنرل اسمبلی کی عمارت۔ میں بہت تھک گئی تھی اس لیے باہر بنچ پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ مختلف اقوام کے جھنڈوں کے درمیان ہمارا سبز چاند ستارے والا جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ اس دیارِ غیر میں اپنا جھنڈا کچھ یوں لگا جیسے کوئی بہت ہی پیاری اپنی چیز ہو ایک عزیز دوست سچا غمگسار۔ ایک حبشی عورت شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس تصویریں لے رہی تھی۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ یقیناً مسلمان ہوگی ہم اجنبی تھے مگر ہم مذہب اور ہم لباس ہونے کی وجہ سے وہ اس کی طرف کھچ رہا تھا۔ ایک یہودی سیاہ گول ٹوپی سر پر چپکائے اپنے خاندان سمیت اندر جا رہا تھا۔ عورت نے ٹخنوں تک لمبا سکرٹ پہنا ہوا تھا اور سر رومال سے ڈھانپا ہوا تھا۔ ہندو عورتیں پیشانی پہ سرخ لہو رنگ بندیا لگائے ہوئی تھیں۔ بہت ممکن ہے مسلمان ہی ہوں۔ کیوں کہ ہماری عورتوں نے بھی ہندو مذہب کی اس خاص روایت اور نشان کا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ جو کسی صورت بھی جائز نہیں۔ ہر شخص کو اپنا تشخص قائم رکھنا چاہیے اور ہرگز وہ چیزیں نہیں اپنانی چاہییں جس سے لوگ ہمیں وہ سمجھ بیٹھیں جو ہم نہیں ہیں۔

ہماری گائیڈ لڑکی کا تعلق گھانا سے تھا۔ خاصی خوش مزاج تھی۔ ہم جنرل اسمبلی کی بلڈنگ میں تھے۔ وہ مسکرا کر بولی کہ آپ اس وقت یونائیٹڈ سٹیٹس کی سرزمین پر نہیں ہیں بلکہ انٹرنیشنل علاقے میں ہیں۔ یہ علاقہ ہر اس شخص کا ہے جس کا ملک یو این کا ممبر ہے، وہ ہمیں اس کی پوری تاریخ سناتی رہی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ۲۴ راکتوبر ۱۹۴۵ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی تاکہ اقوام عالم کے مسائل حل کیے جا سکیں، دنیا میں امن قائم کیا جائے اور جنگوں سے بچا جا سکے۔ یہ تو درست ہے کہ ابھی تک تیسری جنگ عظیم نہیں چھڑی مگر ایسا کون سا دن ہے جب دنیا کے کسی علاقے یا خطے پر جنگ کے بادل نہ منڈلا رہے ہوں۔ کیا سہاگ اجڑنے بند ہو گئے؟ کیا معصوم بچے اب یتیم نہیں ہوتے؟ ماؤں سے بیٹے اور بہنوں سے بھائی جدا

نہیں ہوتے؟ جنگ کی تباہ کاریوں میں کون سی کمی آئی ہے۔ نفرتیں بڑھ گئی توں ہیں۔ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلنے کے لیے چار سو منہ پھاڑے بیقرار پھرتی ہیں۔ انسان کے بنیادی حقوق کبھی افغانستان کبھی اری ٹیریا اور کبھی فلپائن میں پامال ہو رہے ہیں۔ امن کی فاختہ اڑانے والے سب سے زیادہ بدامنی پھیلا رہے ہیں۔

فن تعمیر کا ایک انوکھا پہلو امریکہ میں نظر آیا۔ اونچی عمارتوں کے ہال بھی بہت اونچے ہوتے ہیں۔ مثلاً یہاں پبلک لوبی (PUBLIC LOBBY) کی چھت پچھتر فٹ بلند ہے۔ اس ہال میں ایک عظمت جلال اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔ بے پناہ وسعت اور دل ہلا دینے والی بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ اس بلندی کے سامنے انسان بہت چھوٹا بڑا معمولی نظر آتا ہے۔ حالانکہ اسکا معمار بھی یہی چھوٹا اور معمولی انسان ہے۔

پوری پوری دیواروں پر مختلف ممالک کے بڑے مصوروں کے بنائے ہوئے مورل ہیں۔ عموماً جنگ سے پیدا ہونے والی بدحالی اور مصائب کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ امن کی حالت میں جو ترقی خوشحالی اور سکون میسر آسکتا ہے اس کو بھی تصاویر کے ذریعے اجاگر کیا گیا تھا۔ مختلف ممالک کے دیے گئے تحائف بھی موجود تھے سپیس پاور والوں کا دیا ہوا چاند کے پتھر کا ٹکڑا اور سپٹنک کا ماڈل، میکسیکو والوں کی دی ہوئی تصویر بعنوان "برادر" ایران کا بھجوایا ہوا بیش قیمت قالین جس کو بننے میں پورے پانچ برس لگے۔ گھانا کا دیا ہوا کھڈی پر تیار کردہ کپڑا۔ سب سے خوبصورت چین کا بنا ہوا مانومینٹ تھا ایک پل کی تعمیر اور تیاری کا منظر تھا۔ آٹھ ہاتھی دانتوں سے تراشا گیا کاریگری اور مہارت کا دلکش اور نفیس نمونہ، انسان، جانور پھل، پھول، درخت، پہاڑ، پل، بسیں غرضیکہ ہر نقش کو بے حد نزاکت سے ابھارا گیا تھا۔ ہر چیز بے حد چھوٹی تھی مگر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ مکمل تھی۔ یہ کام صرف چینی مشاق ہی کر سکتے ہیں۔ اُن کی انگلیوں سے فن کے جو سوتے پھوٹتے ہیں وہ اور کسی سے ممکن نہیں۔

جنرل اسمبلی ہال کی چھت گنبد نما ہے، اس کی بلندی بھی پچھتر فٹ ہے اوپر چھت پہ چار فٹ قطر کا گول سوراخ ہے جو شیشے سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس میں سے سورج کی روشنی نیچے فرش پر پڑ رہی تھی۔ اطالوی سنگِ مرمر کے چبوترے پر تین کرسیاں صدر، سیکرٹری اور نائب سیکرٹری کے لیے تھیں۔ کرسیوں کی پشت والی دیوار پر یو این کا ENBLEM ہے۔ دیوار میں شیشہ بند ممبروکے ہیں جن میں مترجم، پریس، ریڈیو، فلم اور ٹی وی کے نمائندے بیٹھتے ہیں۔ دیوار پہ فرانسیسی مصور کے بنائے ہوئے شاہکار ہیں۔ پیچھے سامعین کی کرسیاں ہیں جن پر وفود کے ساتھ آنے لوگ بیٹھتے ہیں۔ بالکنی میں سرکاری مشیر اور مہمان عوام اور پریس کے دوسرے لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔ یہاں کی ہر چیز دیواریں، چھتیں، قالین اور کرسیاں سبز نیلی اور سنہری تھیں۔

یہ وہ ہال ہے جہاں بھٹو نے پولینڈ کی قرارداد پھاڑ کر پاکستان کو دو لخت کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں سات دیکھ رہی تھی مگر میرا ذہن پیچھے کا سفر کر رہا تھا۔ کہاں گئے وہ سارے کردار جنہوں نے یہ ڈرامہ کھیلا تھا۔ سب سے بڑی اسلامی مملکت کے تار و پود بکھیرے تھے۔ دونوں بازوؤں کے درمیان نفرت کی وہ آگ بھڑکائی جو کبھی سرد نہ ہو سکی۔ انسان کے وجود کی حقیقت کیا ہے۔ دنیا میں اس کا قیام محض چند گھڑیوں، دنوں یا سالوں پر محیط ہے۔ بے بس و حقیر اتنا کہ قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے باوجود اپنی تقدیر کا فیصلہ بدلنے پر قادر نہیں۔ اپنی کل کی خبر نہیں اور قدم ایسے اٹھاتا ہے کہ اس کے اثرات صدیوں تک پھیل جائیں۔ اپنی ہاتھ کی لکیر نہ مٹا سکے اور دنیا کے نقشے کی لکیریں مٹا ڈالے۔ اگر مجیب بھٹو اور یحییٰ کو اپنا انجام معلوم ہوتا

کیا وہ پھر بھی یہ سب کرتے۔ اِدھر ہم اُدھر تم کا آوازہ بلند کرنے والا نہ اب اِدھر ہے نہ اُدھر۔ وہ جس نے عیاشیوں کا ریکارڈ توڑ ڈالا تھا اور ہم حرمین دیکھے کا نعرہ لگاتا تھا اُسے اللہ کی لاٹھی نے چلنے پھرنے اور بولنے سے معذور کر دیا اور کسمپرسی کے عالم میں اپنے نامۂ سیاہ کے ساتھ آخری عدالت میں پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے والا بنگلہ بندھو اپنے ہی دوستوں کے ہاتھوں آل اولاد سمیت خون میں نہا گیا۔ جن کے منہ کو خون لگایا تھا وہ پھر کب اپنے اور پرائے کی تمیز کرتے ہیں۔

سیکورٹی کونسل کی مشرقی دیوار پر ناروے کے مصور PEV KVOHS کا ایک شاہکار ہے جس میں مستقبل کی تصویر دکھائی گئی ہے جب ہر طرف امن و آشتی ہوگی ہر شخص کو اس کے بنیادی حقوق حاصل ہوں گے۔ کوئی کسی کا غلام نہ ہوگا۔ سنگِ مرمر کی دیواروں پر نیلی اور سنہری ٹیپسٹری تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ سرخ کرسیوں پر وفود کے ساتھ آئے لوگ بیٹھتے ہیں۔ درمیان میں نعل کی شکل میں کرسیوں پر ممبر اور پیچھے والی کرسیوں پر سامعین بیٹھتے ہیں۔ سیکورٹی کونسل کے پندرہ ممبر ہوتے ہیں پانچ مستقل یعنی چین، فرانس، سوویٹ یونین، برطانیہ اور امریکہ کے بقیہ کا چناؤ جنرل اسمبلی کرتی ہے۔ ہمیں تو بس اتنا پتہ ہے کہ یہ وہ کونسل ہے جو آج تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں کر سکی۔

اکنامک اینڈ سوشل کونسل چیمبر میں کوئی میٹنگ ہو رہی تھی۔ سامنے کی دیوار چھت سے فرش تک بھاری پردوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہاں انگریزی حرف یو لا کی شکل میں کرسیاں سجائی گئی تھیں۔ اس کی ڈیزائننگ اور سجاوٹ سویڈش آرٹسٹوں اور آرکیٹکٹوں کی مرہونِ منت ہے۔ کچھ دیر بیٹھ کر کارروائی سنی، خاک پلے نہ پڑا چنانچہ ہم باہر چل دیے۔ ڈوبتا سورج شام کے سانولے چہرے کو شفق رنگ کر رہا تھا اور وہ اپنا بجلی کے قمقموں سے سجا ہلکا سیاہ کوٹ پہن رہی تھی۔ ہم اپنے تھکے تھکے قدموں کو گھسیٹتے سب وے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے

کلیم اللہ

جو آکے نہ جائے

وہ مُکا جو کسی سے لڑائی کے بعد یاد آئے خود اپنے کلّے پر رسید کر لینا چاہیئے۔ یہ میرا مشورہ نہیں گلستاں، بوستان والے شیخ سعدیؒ کہہ گئے ہیں۔ اور ــــ

مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا۔

قصہ یہ ہے کہ بات، ہمیں وقت پر نہیں سوجھتی۔ جوانی میں بڑھاپے کا کھٹکا لگا رہتا ہے ۔اور بڑھاپے

کا یاد تڑپاتی ہے۔ اسے حافظے کی کوتاہ بینی کہہ لیجیئے یا ذہن کی مصلحت، ہوتا یہی کچھ ہے۔

ہم جیسے باطل سے نہ دبنے والے موت سے کہاں گھبراتے ہیں لیکن ایسے کم ہی ہوں گے جو بڑھاپے سے نہیں گھبراتے ہوں۔ موت کا کیا آئی اور چل دیئے۔ بڑھاپے میں اتنی آسانی سے نجات نہیں ملتی۔ بات یہ ہے کہ بڑھاپے کے بعد کوئی اور منزل دکھائی نہیں دیتی۔ دُکھیا اتنی دیکھ چکی کہ پھر آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا بچپن، جوانی، بڑھاپا، یہی ہماری جانی پہچانی منزلیں ہیں۔ ویسے ایک بڑے نباض نے زندگی کی سات منزلیں دی ہیں ظرف کی بات ہے۔ سات منزلوں پر ہی کیا موقوف۔ شاعروں نے تو زندگی کو جانے کتنے خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ اس کی اکائی ملیامیٹ کر کے رکھ دی۔ جانے عمر کی کس منزل پر پہنچ کر غالب نے کہا تھا۔

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

عجیب بات ہے، بچپن تو پلک جھپکتے گزر جاتا ہے اور جوانی یوں آئی، یوں گئی کہ۔

بجلی ہوا سے پوچھ رہی ہے کدھر گئی

بڑھاپا ثقیل غذا ہے، ہضم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ چھاتی پر دھری رہتی ہے۔ بڑھاپا گھڑی کا وہ کانٹا ہے۔ جو چابی بغیر کسی جگہ آکر رُک جاتے دکھائی دیتی ہے۔ کانٹا دکھائی دیتا ہے۔ وقت آگے نہیں بڑھتا۔ قطب بن جاتا ہے۔ ہلنے کا نام نہیں لیتا۔

مشکل یہ ہے کہ دوا دارو کی دن دونی رات چوگنی ترقی نے، بڑھاپے کی مدت خواہ مخواہ طویل اور دیرپا کر دی ہے اور بڑھاپے میں کچھ ایسا ہوتا بھی ہے کہ جینے کی ہوس، ایکا ایکی بڑھ جاتی ہے اور آپ جانیں۔ انسان ہوس کا ہے۔ چاہے جس حالت میں ہو۔ دوائیاں تو اپنا اثر دکھاتی ہی ہوں گی، لیکن یہ جینے کی ہوس، اکسیر ثابت ہوتی ہے۔ قوتِ ارادی خود

کی ایک دولت ہے۔ بہر حال، یہ طے ہے کہ بچپن اور جوانی کے مقابلے میں بڑھاپے کی مدت بڑھانے کے نسخے عام ہو چکے ہیں اور یہیں سے الجھنا کا تازہ بتازہ نو بہ نو سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ٹوٹتے ہوئے پل کی مرمت آسان نہیں، یہ بڑھاپا ہے بڑھاپا، دل نہیں کہ۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

زندگی کو بلاوجہ طول دینے کا مقصد یہ ہوا کہ آپ مجھے مار عمر کو طول دینے کے گر تو سیکھ لئے۔ کچھ خاندانی نسخے "ہمی ہتھیلیے" لیکن یہ بھول گئے کہ زندگی روز بروز کتنی طوفانی ہوتی جا رہی ہے طرح طرح کے مسئلے مالی، ذہنی نفسیاتی، اخلاقی جسمانی۔ وہ زمانے لد گئے جب خاندانوں کے بوڑھوں کی کس قرینے اور خلوص سے دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ ہر فرد خدمت کے لئے مستعد، اب خاندان کا ہر فرد اپنے اپنے [illegible] میں مبتلا ہے۔ بزرگوں کی خدمت کا وقت کہاں سے نکالے۔ خلوص تو ہے اُسے عملانے کی مہلت کہاں! خاندان ہی بکھر چلے۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ بڑھاپے میں ساتھ دینے والے نہ رہے۔ وہ تو کہیے۔ ریڈیو ہے، ٹیلی ویژن ہے۔ بزرگوں کے پاس اگر انسان نہیں رہ سکتے۔ تو کم از کم انسان کی آواز تو ہے۔ تصویر تو ہے۔ وال دَلیا جو مل جائے، مقامِ شکر۔

بڑھاپے کو سلیقے سے قرینے سے گزارے جانے کا ڈھنگ سب کو نہیں آتا۔ نئی عمارت کھڑی کرنے میں شاید اتنی تنظیم، ایسی ترتیب، اتنی عرق ریزی نہ ہوتی ہو گی۔ جتنی ایک گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں جی کڑا کر کے یہ مان لینے میں بشاشت محسوس کرنی چاہیئے کہ صحت دوا سے اور بڑھاپا خضاب سے واپس نہیں آتا۔ بڑھاپے کو بڑھاپا سمجھ کر زندگی گزارنے کا قرینہ آ جائے تو مشکل بڑی حد تک آسان ہو سکتی ہے۔ یہ سلجھے یا الجھے، کا دعویٰ یا زعم کس کام کا، کون آئے گا کرم جب ہیں۔ خود فریبی سے کہیں کام چلتا ہے، قدرت کا قانون اور ہے۔ انسان کا اور۔ بڑھاپے میں جوانی کی اکڑ کیسے کام دے سکتی ہے۔ وہ دن ہوا ہوئے۔ جب یہ کہا جاتا تھا کہ جوانی کھلتی ہے تو عقل بڑھ جاتی ہے۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ نظریہ خود بوڑھا ہو چکا۔ اس کی تکرار بڑھاپا۔ جوانی جب مرض معلوم دے اور جوان، مریض تو سمجھ لیجئے۔ بڑھاپے نے پڑاو ڈال دیا۔

بڑھاپا در اصل زندگی سے جنگ نہیں۔ مصالحت ہے۔ سمجھوتا ہے، جوانی میں تیس مار خاں رہے ہوں گے۔ اب تو بتیس پر گزارہ ہے۔ منہ پر جھریاں، ہاتھوں میں رعشہ، کمزور نظر، زمین کی جانب کمر کا جھکاؤ۔ یہ سب چیزیں زندگی سے کچھ اور چاہتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ انسان اس کو ماننا نہیں چاہتا۔ بڑھاپا چھپانا چاہتا ہے۔ اُسے یہی کھٹکا ہے کہ کوئی ہمیں اندر سے دیکھ نہ لے۔ چھپاؤ جتنا چھپا سکتے ہو۔ نتیجہ یہ کہ بڑھتا جاتا ہے بڑھاپے کو برضا و رغبت قبول کر لینا چونکہ ہمیں آتا، ایک اور مشکل۔ لیکن ہم ہی ہم کی بیماری، دیگر تلخ و شیریں بیماریوں کے علاوہ بڑھاپے میں ایک دم سے زور پکڑ لیتی ہے۔ ہمارا بدل ممکن نہیں جو ہم کر سکتے ہیں وہ دوسرا نہیں کر سکتا۔ ہم ناگزیر ہیں۔ ہم نہ ہوں گے تو دنیا کا نظام الٹ جائے سبحان اللہ دیکھا آپ نے بڑھاپے کا کتنی بتی۔ چراغ بجھنے سے پہلے بھڑک اٹھنے والی کیفیت یعنی "ہمیں ہیں" ارے بھائی ہر چیز کا بدل بلکہ نعم البدل۔ زندگی کا کاروبار ہر حال میں چلتا رہے گا۔ شمعیں جلتی بجھتی رہتی ہیں۔ انجمن باقی رہے گی۔ اپنے پیاروں سے کون جدا ہونا چاہتا لیکن جدا ہونا پڑتا ہے۔ خون کا فساد یا محبت کی مار، کبھی کبھی ہم سے کہلواتی ہے کہ تم سے جھوٹ کریں نہیں سکتے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ بچے پھل نکل کر چھوٹ جاتے ہیں۔ زندگی کی گاڑی کبھی تیز چلے گی کبھی مدہم، لیکن رُکے گی نہیں۔ بڑھاپا در اصل قناعت چاہتا ہے، تحمل چاہتا ہے، بُردباری چاہتا ہے، بُرد

تسنیم کوثر

مچھر مکھیاں اور چھینکیں عرف شومی تحریر!

ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی ہماری چھٹیاں مچھر، مکھیاں اور چھینکیں مارتے گزر گئیں۔ چھٹیوں سے پہلے ہم یہی کہتے تھے کہ چھٹیاں آئیں گی۔ تو یہ کریں گے وہ کریں گے یہ ہرگز نہ ہوگا کہ لمبی تان کر سونے کے سوا کچھ کر کے نہ دیں گے۔

سونے میں بس ایک قباحت یہ ہے کہ اکثر سوتے میں خواب دکھائی دیتے ہیں اور ٹھوس حقیقتیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ہم نے ٹھان لی تھی کہ ٹھوس حقیقتوں کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں گے ۔۔۔۔۔۔ مگر ہمارے اور ارادوں کی طرح یہ عہد بھی بودا ثابت ہوا۔

ترے توڑنے سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ؛ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

چھٹیاں تیز تیز چلنے سے شروع ہوئیں اور رفتار بڑھا کر بھاگنے لگیں تو ہم ذرا ہوش میں آئے اپنے آپ کو جھنجھوڑا کہ کچھ تو کام پورا ہو۔ سوچا چلو کچھ اور نہ سہی تو کم از کم جو کاٹھ کباڑ ہم نے کونوں کھدروں میں سنبھال رکھا ہے اسی کو ٹھکانے لگا کر ثواب دارین حاصل کریں چنانچہ ایک دن سویرے سویرے باوضو ہو کر خشوع و خضوع کے ساتھ پرانے کاغذات جو چھانٹنے بیٹھے ہیں تو سارا دن بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے ۔۔۔۔۔

مصیبت یہ ہے کہ ہم تحریر (خواہ کسی قسم کی ہو) پڑھے بغیر ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتے۔ حتی الوسع کسی کی تحریر ضائع ہونے سے ہی گریز کرتے ہیں۔ جس طرح کاکروچ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بلانوش ہوتا ہے اور کھانے کو جو چیز بھی مل جائے نہیں چھوڑتے۔ اسی طرح تحریروں کے بارے میں ہم بلانوش واقع ہوئے ہیں ۔۔۔۔۔ یہ مشہور زمانہ ادیبوں کی تحریروں پہ کچھ موقوف نہیں بلکہ ہم اپنے گھر کے سامنے والا کھیلے رہ کر آنے والی سودے کی پڑیوں، اسکول کے بچوں کی کاپیوں سے پھاڑے گئے ورقوں سے بنائے گئے لفافوں (جو عموماً مختلف شعراء کے اشعار، نصیحت و تبلیغ تشریحات سے مزین ہوتے ہیں) اور اپنے گھر کے پتے پر آنے والے بھولے بھٹکے خط بھی اسی دلچسپی اور ذوق و شوق سے پڑھتے۔ غرضیکہ انسانوں کی لکھی گئی ایک ایک سطر کی عزت افزائی کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کاغذ پھینکنے کا کام ہمارے لئے کس قدر مشکل ہوگا۔ مدیر ہوتے تو ان قلم برداشتہ تحریروں کو اپنے رسالے کی زینت بناتے۔ پڑھنے سے گھر والوں کو ماشاء اللہ معطل ہوئے۔ کم از کم ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہمارے عزیز از جان کاغذوں کے ڈھیر سے کچھ نمونے آپ کی نذر ہیں اور ان کی اہمیت بتائیے کہ ان بیش قیمت دستاویزات (جن کی غالباً کچھ نہ کچھ تاریخی اہمیت بھی ضرور ہوگی) ہم کس طرح کوڑے کے ڈھیر کی نذر کر دیں ۔۔۔؟

تحریر باعث آمد

تاریخ ۔ ۲۳/۲/۷۳

میں پروین اختر ولد اختر الاسلام حلفیہ اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ چھوٹی کاکی نسرین اختر عرف چھنو متعلم جماعت چہارم جب قرآن مجید (ماشاء اللہ) ختم کرلے گی تو ایک محدود مگر پُر وقار "سادہ" تقریب میں اس کے اس زبردست کارنامے کی داد دی جائے گی اس تقریب میں اس کی خوش خوراک اور چٹوری سہیلیوں کو مدعو کرکے ان سے تحفے بٹورنے کی سبیل پیدا کی جائے گی۔ تقریب میں دیگر "خورد و کلاں" کو بھی تشریف کا ٹوکرا اٹھانے کو کہا جائے گا۔ اس بات کا اس سے پوری سنجیدگی کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے اور یہ رسید لکھ دی گئی ہے۔ تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ لیکن اگر اس کو سند نہ ہی سمجھا جائے تو بہتر ہوگا۔

العبد ______ ہدایت کرنے والا تمہارا

گواہان:

(۱) تمکین اختر (آگے دستخط ہیں) (۲) تنویر الاسلام (آگے دستخط ہیں) (۳) ولایت بی بی (آگے انگوٹھے کا نشان ہے)

(۲) یہ دوسری تحریر غالباً دیہات کے کسی پرائمری یا مڈل سکول پر پڑنے والے "چھاپے" کی دلخراش روداد ہے۔

"ایک دن کوئی دس بجے کے قریب تمام استانیاں نہایت اطمینان سے سکول پہنچیں۔ صورت حال یہ تھی کہ استانی مقصودہ حسب معمول آنے کے چنے منگوا کر انہیں پھانکنے کے بعد برقع اوڑھ کر گھر تشریف لے جا چکی تھیں۔ دو ایک استانیاں ابھی سکول ہی نہیں آئی تھیں مگر تاج سلطانہ صاحبہ ابھی ابھی تشریف لائی تھیں۔ اور انہوں نے ابھی تک برقعہ نہیں اتارا تھا۔ ایک ہاتھ میں دوائی کی شیشی پکڑے وہ بقیہ استانیوں کو اپنے فرزند ارجمند کا کارنامہ سنا رہی تھیں۔ کہ کس طرح موصوف نے چارپائی پر بیٹھ کر جو الٹی کی ہے تو چھینٹے کوئی چھ فٹ تک گئے (موصوفہ کارنامہ بیان کر چکنے کے بعد دوائی لینے کے لئے ڈاکٹر کے پاس جانے کا ارادہ رکھتی تھیں) بقیہ تمام استانیاں نہایت انہماک سے ان کی تقریر سننے میں محو تھیں۔ ابھی تک کسی نے حاضری نہیں لگائی تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ سکول تو ابھی "لگا" ہی تھا۔ اتنی جلدی کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی پُر مغز تقریر۔ زور و شور سے جاری تھی کہ یکایک یوں محسوس ہوا جیسے بھونچال آگیا ہو۔ کوئی نصف درجن آدمیوں نے سکول کا دروازہ اس زور سے پیٹنا شروع کیا کہ بچے سہم گئے اور استانیاں دہشت زدہ ہو گئیں۔ خیر کسی نے ہمت کرکے دروازہ کھول دیا۔ معلوم ہوا کہ بڑے ڈائریکٹر نے اچانک چھاپہ مارا ہے۔

اب جو ان ڈائریکٹر صاحب نے سکول کی حالت دیکھی تو غصے کے مارے لال پیلے ہونے لگے اور حکم دیا کہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ فوراً حاضر ہوں۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کا یہ حال تھا کہ جوتیاں اتار، پاؤں پھیلا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ افتاد پڑی تو گھبراہٹ کے مارے دایاں جوتا بائیں پاؤں اور بایاں جوتا دائیں پاؤں میں پہن لیا اور سر پہ دوپٹہ لپیٹ سرپٹ بھاگیں۔ باقی استانیوں میں بھی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ سکول کے بچے سمجھے کہ چھٹی کرانے والے آگئے ہیں۔ چنانچہ سب نے شور مچا مچا کر اک ہنگامہ برپا کر دیا۔ بہت سے بچے ڈر کے مارے سکول چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ذرا سی دیر میں بھرا پُرا سکول خالی ہو کر رہ گیا۔

ادھر جب ہیڈ مسٹریس صاحبہ ڈائریکٹر صاحب کے حضور پہنچی ہیں تو وہ خوب گرجے برسے کہ یہ سکول ہے یا مچھلی منڈی۔ اس کے [illegible] میں اوّل معلمہ صاحبہ چپ چاپ کھڑی تھر تھر کانپتی رہیں۔ تب ڈائریکٹر صاحب ٹھنڈے ہوئے اور کہا کہ اچھا حاضری کے رجسٹر دکھائیے رجسٹر ڈھونڈے جانے لگے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ رجسٹر کہاں رکھے ہوئے ہیں۔ سب کی سب "معلمات و معظمات" رجسٹر ڈھونڈ رہی تھیں اور ڈائریکٹر صاحب کا پارہ لحظہ بہ لحظہ چڑھ رہا تھا۔ آخر خدا خدا کرکے رجسٹر ملے تو سب کی جان میں جان آئی۔ مگر بدقسمتی تو ملاحظہ ہو کہ کسی کی حاضری رجسٹر پر موجود نہ تھی----! پھر بچوں کی حاضری کا مسئلہ درپیش ہوا۔ بہت سے بچے افراتفری کا فائدہ اٹھا کر فرار ہو چکے تھے

تیسا ندہ بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے گنتی کی گئی تو کل ۱ کہتر بچے نکلے۔ ۱۹ اُستانیاں اور اکہتر بچے ! ایک - ظاہر ہے کہ نتائج قطعی حوصلہ افزا تھے ......

اس اچانک چھاپے کے نتیجے میں زیادہ تر اُستانیوں کو سزا کے طور پر دور دراز علاقوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ گویا چڑیوں کا چنبہ ...کر رہ گیا۔

ھ یہ کسی سکول کے بچے کے قلم سے ہے۔ یہ بظاہر ایک مضمون ہے جو کہ مضمون کا صرف ایک صفحہ دستیاب ہے۔ اس لئے عین اندازے سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ مضمون کا موضوع شہری اور دیہاتی زندگی کا موازنہ ہے۔ بچہ لکھتا ہے (بظاہر دیہاتی زندگی سے شروع ہوتا ہے)

"ہر چیز خالص ملتی ہے۔ مثلاً دودھ، دہی، لسی وغیرہ جس کی وجہ سے دیہات کا ہر فرد صحت مند ہوتا ہے۔ دیہات میں کسی چیز میں ملاوٹ نہیں ہوتی۔ لیکن ان باتوں سے زندگی کے مسئلے تو حل نہیں ہو سکتے۔ دیہات میں ہر وقت فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی پانی کی باری پر لڑتا ہے۔ تو کبھی کوئی زمین کی خاطر لڑتا ہے۔ دیہات میں بچے کبھی بھی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ بالکل جاہل رہتے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ شہر میں آپ بچوں کو تعلیم دلا سکتے ہیں۔ جس سے آپ کا بچہ ایک بڑا افسر بن سکتا ہے۔ شہر میں رہنے کے زیادہ فائدے ہیں۔ غرضیکہ آپ کو شہر میں زیادہ سکون ملتا ہے اگر شہر میں آپ بور ہو رہے ہوں۔ تو آپ کسی فلم پہ جا سکتے ہیں جس سے آپ کا ٹائم نکل جائے اور آپ بوریت سے بچ جائیں گے۔ آپ سیر کیلئے اچھی اچھی جگہ جا سکتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں کوئی خطرہ احق نہیں ہوگا کہ دیہاتی زندگی سے بہتر شہری زندگی ہے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے شہری اور دیہاتی زندگی پر اس ذہین بچے کا بے لاگ تبصرہ۔ اب آئیے ایک عدد خط کی طرف

(۴) یہ خط غالباً کسی کامیاب و خوشحال بزنس مین نے اپنے کسی عزیز یا دوست کو لکھا ہوگا۔ طوالت سے بچنے کے لئے ہم فقط ایک حصہ نقل کر رہے ہیں۔

"قالین میرا خیال ہے اب تک بھائی کلیم صاحب کے گھر ہوگا۔ میں نے بھائی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ جب بھی انوار صاحب آئیں ان کو دیدیں۔

آپ کی ملاقات جب بھی شفیق صاحب سے ہو یا لکھدیں کہ میرے لئے B.A کا سرٹیفکیٹ "لاہور سے تہیہ کریں جو پیسے ہونگے دے دوں گا۔

بنام شیخ اصلاح الدین

31st May 1938

Matric 1955

B.A 1961 ہونا چاہیئے

سنا ہے وہاں بہت آرام سے ہو جاتا ہے۔ اس سے مجھے کافی فائدہ ہو سکتا ہے۔

آخر میں شیخ صاحب پھر یاد دہانی کراتے ہیں۔

" انوار صاحب آپ کے

سرٹیفکیٹ ضرور بھیجیں "

آخر میں ہم ایک پمفلٹ سے محض ایک اقتباس نقل کر رہے ہیں۔ گو ہماری دانست میں پورا پمفلٹ نقل کرنے کے قابل ہے پمفلٹ عنوان ہے "آوازۂ حق" نمبر ۲۲ لکھنے والے کوئی عبدالشکور صاحب ہیں پمفلٹ پر انہوں نے اپنی دکان کا پتہ بھی شائع کر دیا ہے درجا بجا اشعر استعمال کئے ہیں پمفلٹ کا آغاز بسم اللہ کے بعد ان اشعار سے ہوتا ہے۔

جس کی منزل فنا ہو نہ سکے
ایسی منزل کو کیوں مٹے کوئی
آوازِ حق جس کی حفاظت کرے خدا،
وہ آواز کیا دبے جسے روشن کرے خدا

اور پھر پمفلٹ میں ایک باب ہے۔

"عنوان نمبر (۱۱)

میرے مغرور بھائیو مجھ پر شک نہ کرنا۔ نہ میں درویش ہوں، اور نہ کوئی نجومی ہوں۔ اور میرے ان خیالات کو معمولی طور سے دیکھ لینا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسجد اقصیٰ پر یہودیوں نے آگ لگا دی اور آگ لگا دینے کے بعد اُس کی کھدائی کیوں شروع کروائی۔ لہٰذا اس کا معمولی سا خیال پیش کرتا ہوں۔ شاید یہ صحیح نہ ہو، اس کی کھدائی یہاں شروع کر دی کہ سلیمان علیہ السلام نے اس سرزمین میں صندوق دفن کیا ہوا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسی چیز ہے۔ جس کی بنا پر دنیا کی کوئی طاقت اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ سوائے اس پروردگار عالم کی طاقت کے یہودی و نصاریٰ اس چیز کی تلاش کر رہے ہیں۔ اور اب کچھ دنوں تک برج سلیمانی کی بھی کھدائی شروع کر دیں اور اس صندوق کی تلاش کریں گے۔ اور اس چیز کا نام خواہ دجال رکھ لیا، یا کوئی اور نام دیدیں۔ لہٰذا اس کے مقابلے میں ایک خیال پیش خدمت ہے۔ ۱۹۶۷ء سے "مہینے" میں پہلی تاریخ سے لیکر تیس تاریخ تک یعنی اسی مہینہ میں حضرت امام مہدی علیہ السلام کا ظہور ہو چکا ہے۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا ہے کہ یہ آپ نوٹ کر لیں۔

افسوس ہے کہ جگہ کی کمی کے باعث پمفلٹ کے باقی باب یہاں نقل نہیں کئے جا سکتے۔ پمفلٹ کے آخری باب میں عبدالشکور صاحب نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے معاف کر دیں کیونکہ میں ان پڑھ ہوں۔"

اختتام پر انہوں نے پھر چند شعر عرض کئے ہیں۔

الٰہی وہ نظر پیدا کر کہ انعام بھی سراپا نور پیدا ہو
جدھر عاشق نظر ڈالے بنے جنت وہیں حور پیدا ہو
جنابِ عشق کی منزل بہت ہے دور ابھی
رفیقِ راہ نہیں ہم سفر ہے دور ابھی
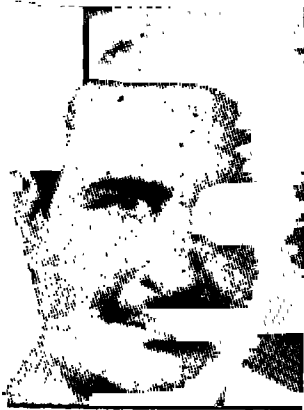
کرنل غلام سرور — منصور قیصر — ڈاکٹر وحید قریشی

احمد شجاع پاشا — منشا یاد — رشید امجد

عبدالوحید — جاوید ناصر — طاہر ممتاز

جاوید اقبال ستار

حسن عباس رضا

جان کاشمیری

ضمیر اظہر

نجمی صدیقی

شاہد واسطی

شفیق ہاشمی

سرور انبالوی

حفیظ رضوانی

اعجاز اعظمی
احمد شریف
اسلم جدون
طالب قریشی
وزیری پانی پتی
شیدا حسن زیدی
میر زیدی
مظفر رزمی
قمر ہاشمی
رئیس فروغ

فیروزہ بخاری

عذرا مجید

تسنیم کوثر

حسین بانو

ثمینہ راجہ

نسیم نازش

بشارت علی سید

خالد اقبال یاسر

ملک محمد عظیم
مینجر نیرنگِ خیال

شاعری

فراق گورکھپوری
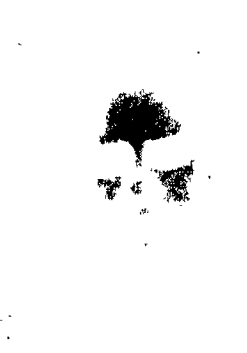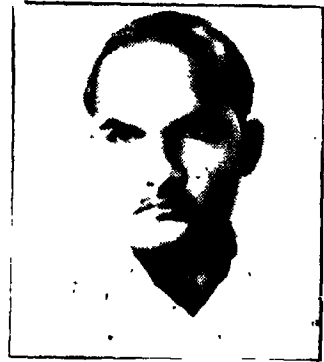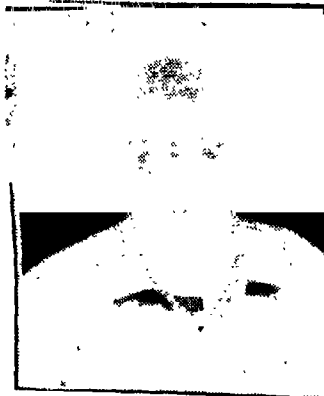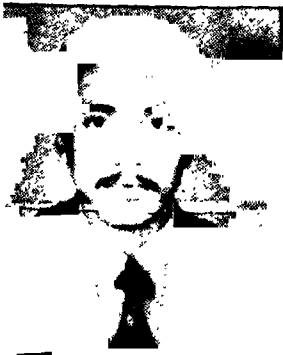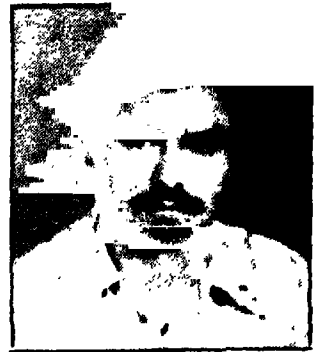
دورِ فلک کچھ رُکا رُکا سا
قافلہ کچھ ٹھہرا ٹھہرا سا

تھمی تھمی سی گردشِ دوراں
روزِ قیامت رُکا رُکا سا

دِل اُمڈا سا آنکھ بھری سی
آج تو حسن بھی ہے اپنا سا

بے لنگر ہے پریم کی کشتی
روپ بھی ہے چڑھتا دریا سا

عشق ہو امرت یا ہو ہلاہل
ایک جہاں ہے پیاسا پیاسا

دل کو تجھ سے دِل سے تجھ کو
ایک جھجک سی اک کھٹکا سا

آج نہ جانے کیوں ہوتا ہے
دل میں درد ہلکا ہلکا سا

عشق میں ایک عذاب سا دل پر سر پر رحمت کا سایا سا
دیکھ فراقؔ خوشی پھر اپنی اس میں ملائے غم تھوڑا سا

تلوک چند محروم

رباعیات

کھلتا یہ راز علم و حکمت پہ نہیں　　جب تک کرمِ خاص بصارت پہ نہیں

معلوم ہوا ہے بعدِ فکرِ بسیار　　پردہ آنکھوں پہ ہے حقیقت پہ نہیں

(۲)

کانوں نے سنی نہیں ہے آواز کہیں　　آنکھوں نے بھی دیکھے نہیں انداز کہیں

دل سے پیہم مگر ہے آتی یہ صدا　　موجود ہے وہ انجمن ناز کہیں

(۳)

ظلمت کے مقابلے میں موجود ہے نور　　معدوم اُسے نہ جان جو ہے مستور

فانی ہم ہیں تو کوئی باقی ہے ضرور　　اے مُنکرِ ذاتِ حق! ذرا کھول آنکھیں

(۴)

کیوں ظلمتِ وہم نے تجھے گھیرا ہے　　کیوں عالمِ تاریک تری دنیا ہے

کر اُس کے خیال سے دِل اپنا روشن　　خالق جو مہر و ماہ و انجم کا ہے

احسان دانش

جو سلجھانے کی الجھن میں پڑے ہیں وہ سب خود کو غلط سمجھے ہوئے ہیں
کریں گے عکس سے کیا خاک باتیں بغل میں جن کے دھندلے آئینے ہیں
ابھی گھر سے نہ نکلو مان جاؤ ابھی تو قمقمے بھی جل رہے ہیں
ہیں وہ بھی لوگ ہم سے رہروؤں میں کہ جن کے ساتھ رستے چل پڑے ہیں
فقیروں میں بھی پائے ہیں مسیحا پکارا ہے تو مُردے بھی اُٹھے ہیں
ذرا ٹھہرو بچھڑنے سے تمہارے کئی پیماں شکن یاد آ رہے ہیں
ذرا ذرّوں کے سینوں میں تو جھانکو یہ سب بجھتے ہوئے سورج پڑے ہیں
مرے اشعار جو ہوتے ہیں مشہور خدا شاہد ہے ذاتی تجربے ہیں

کہاں جانا تھا اے احسان دانش
جنابِ من کدھر کو چل پڑے ہیں

شان الحق حقی

یہ لطفِ غزالاں یہ فیضِ غزل

گوارا ہے کچھ زندگی آج کل

غمِ آرزو نغمگی میں بدل

مئے شعلہ خو آبگینوں میں ڈھل

لبوں پر تبسم ہے ابرو پہ بل

بتائے کوئی اس معمّے کا حل

خرابہ ہے شاخِ نشیمن نہیں

مجھے دیکھنا ہے بلاؤں کا بل

گوارا ہے کچھ اس طرح اس کا جور

کہ ہو جیسے اپنے ہی کرموں کا پھل

وہ سنبھلے سے لہجے میں کچھ کچھ ہنسی

کہ جیسے چھلکتا ہو گگری سے جل

مجھے تو ہے یہ نیکی ہی عزیز

مٹا لیجیے اپنی تیوری کے بل

محبت کی بے چینیاں ایک جگ

محبت کی آسودگی ایک پل

خیالوں کے گوہر صدف در صدف

محبت کی باتیں غزل در غزل

اختر ہوشیارپوری

خود اپنی ذات نہ ہو گی تو غم جہاں ہوگا
کوئی تو تیرا ہوگا جو درمیاں ہوگا

نہ مل سکے گا سفر خط کشیدہ راہوں سے
جہاں بھی جائیں گے سر پہ یہ آسماں ہوگا

کھلے کواڑوں پہ جی بھر کے دستکیں دے لو
کہ میرے بعد یہ دروازہ بھی کہاں ہوگا

رواں دواں ہیں مسافر ہوا کے دوش بدوش
کہ لامکاں سے بھی آگے کوئی مکاں ہوگا

میں زینہ زینہ اتر کر بھی اپنے صحن میں ہوں
جو کھو گیا ہے کہیں میر کارواں ہوگا

زمانہ ایسا بھی خالی نہیں ہے لوگوں سے
کوئی تو ہوگا کہ جس پر ترا گماں ہوگا

یہ اور بات کہ چھاؤں مجھے ملے نہ ملے
مگر یہ پیڑ کسی دن تو سائباں ہوگا

جلا ہے شام ڈھلے آج میرے ساتھ اختر
کہ بے بات مرے گھر میں بھی دھواں ہوگا

سنگ کی بارش ہے سر پہ دیکھنا
دیکھنا اے آئینہ گر دیکھنا

چاند کی شاخوں پہ طائر سو گئے
تم تو پس منظر کا منظر دیکھنا

گھر گیا ہوں اجنبی لوگوں میں میں
میرے ہمدردوں کا لشکر دیکھنا

میں نے آئینے سجائے ہیں بہت
تم کبھی آ کر مرا گھر دیکھنا

ناؤ جب آسودۂ گرداب ہو
تم کنارے سے سمندر دیکھنا

شور سا کیا پس دیوار ہے
شہر والو چھت پہ چڑھ کر دیکھنا

اب یہی میرے مشاغل رہ گئے
سوچنا اور جانب در دیکھنا

کون ان تاریک راہوں پر چلے
ہاں سرِ شب سو گئے اختر دیکھنا

منیر نیازی

ہجرِ شب میں اِک قرارِ غائبانہ چاہیئے
غیب میں اِک صورتِ ماہِ شبانہ چاہیئے

سُن رہے ہیں جس کے چرچے شہر کی خلقت سے ہم
جا کے اِک دن اُس حسیں کو دیکھ آنا چاہیئے

اس طرح آغاز شاید اِک حیاتِ نو کا ہو
پچھلی ساری زندگی کو بھول جانا چاہیئے

وہ جہاں ہی دوسرا ہے وہ بہت دیر آشنا
اس جہاں میں اُس سے ملنے کو زمانہ چاہیئے

کرم حیدری

چند کرنوں کو ہی کیوں روز بکھرتا دیکھوں
کاش سورج بھی کبھی اپنا دمکتا دیکھوں

تو مرے عشق کو اک جذبۂ عامی سمجھے
میں ترے حسن کو آفاق میں یکتا دیکھوں

اپنی آنکھوں میں تو کانٹے بھی چبھو لوں لیکن
کس طرح پھولوں کو راہوں میں سسکتا دیکھوں

بیج کچھ اور بوئے پھل اور، یہ قصہ کیا ہے
کن طلسمات کی فصلوں کو میں پکتا دیکھوں

کون سے دور میں قدرت نے مجھے بھیجا ہے
مجھ سے پہلے جو کوئی دیکھ نہ سکتا دیکھوں

اپنے چہرے کو بھی خود اپنے سے کترا کش پاؤں
اپنے سائے کو بھی پہلو سے سرکتا دیکھوں

برف ہے سر پہ مگر آگ ہے سینے میں وہی
دل کو جب دیکھوں تو پہلا سا دہکتا دیکھوں

اک نیا پردہ ہے آنکھوں پہ زمانے کی کرمؔ
کون جانے کہ میں کب اس کو سرکتا دیکھوں

محسن احسان

قسمتِ دل زدگاں میں نہیں آرام ابھی
مہرباں اِن پہ ہے کچھ تلخیٔ ایام ابھی

ختم ہوتا ہی نہیں شیوۂ بربادیٔ شہر
تازیانوں کی سزائیں ہیں سرِ عام ابھی

کسی فریب سے نہ چٹکا گُل آواز کوئی
گویا سناٹے ہیں تقدیرِ در و بام ابھی

ہم نے سینے میں اسے تھام کے رکھا ہے بہت
اپنا نغمہ بھی ہے بلبلؔ کی طرح خام ابھی

جس کا لہجہ ہے حسیں جس کے خد و خال ملیح
محسنؔ آنکھوں کی ہے ٹھنڈک وہ خوش اندام ابھی

حبیب احمد صدیقی

ایک دل کے ٹوٹتے ہی دفعتاً
سب تمنائیں ہوئیں بے خانماں

زندگی کو اپنی جولانی سے کام
ہو کوئی دلگیر یا ہو شادماں

جس سے خوش آہنگ تھا سازِ حیات
ہے وہ گلبانگِ تمنا اب کہاں

ساتھ وہ عہدِ تمنا کے گئے
اب متاعِ غم کہاں اور ہم کہاں

زندگی کا جب نہ ہو کچھ مدعا
زندگی کا ہر نفس ہے رائیگاں

یہ جہاں ہو یا ہو فردوسِ بریں
کارفرمائی دل ہے جاوداں

وسعتِ عالم ہے ناپیدا کنار
عرصۂ علم و عمل ہے بیکراں

بے رسوخ و اثر نہیں ملتا
یہ نہ کہتے ثمر نہیں ملتا

دو گھڑی جس سے دل کی بات کریں
ایسا بندہ بشر نہیں ملتا

ایسے وابستہ اُس کے در سے ہوئے
اب ہمیں اپنا گھر نہیں ملتا

زندگی میں رہی نہ زندہ دلی
کوئی شوریدہ سر نہیں ملتا

دیدنی ہے یہ دل کی بے قدری
اب کوئی فتنہ گر نہیں ملتا

وعظ تو خیر وعظ ہے اب تو
شعر میں بھی اثر نہیں ملتا

جانیں کیا اُس غریب پر گزری
خط تو خط نامہ بر نہیں ملتا

یوں تو ہیں اہلِ علم و فضل بہت
کوئی صاحب نظر نہیں ملتا

راہنمائی کے دعویٰ دار بہت
کوئی بھی راہبر نہیں ملتا

دیکھے جن کے دہن شرر افشاں
ان کے دل میں شرر نہیں ملتا

رفعتِ سلطان

محبت کی کہانی یاد آئی
مجھے اپنی جوانی یاد آئی

تراشا تیرا پیکر شاعری سے
طبیعت کی روانی یاد آئی

تری یادوں کی خوشبو، میں، خموشی
رُتوں کی مہربانی یاد آئی

وہ محفل میں ترا طرزِ تکلم
وہ اپنی بے زبانی یاد آئی

نئے چہرے مری آنکھوں نے دیکھے
تو دل کو اِک پرانی یاد آئی

فضا میں ہو رہی تھی سنگ باری
مجھے جب گل فشانی یاد آئی

اگر ہنستے ہوئے دیکھا کسی کو
تو دل کی نوحہ خوانی یاد آئی

غزل چھیڑی کسی نے جب بھی رفعت
تری جادو بیانی یاد آئی

کب ہوا جشنِ سبو یاد نہیں
تھی تری یاد کہ تو، یاد نہیں

چاندنی رات، ملاقات، بہار
کون آیا لبِ جو، یاد نہیں

دل تھا صد چاک، یہ ہے یاد مجھے
کب کیا کس نے رفو، یاد نہیں

وجد آیا تھا کسے میری طرح
سُن کے آوازۂ ہُو، یاد نہیں

رُوح کی پیاس بجھائی کس نے
جامِ جم تھا کہ کدو، یاد نہیں

روشنی بخش گئے ظلمت کو
کس کے انوارِ گلو، یاد نہیں

کون تھا مل کے بچھڑنے والا
کون رویا تھا لہو، یاد نہیں

باوضو تھیں مری آنکھیں رفعت
کون بھولا تھا وضو، یاد نہیں

ضمیر اظہر

گُل میں ہے نہ خوشبو میں نہ نغماتِ صبا میں
وہ چیز جو شامل ہے رخِ ماہ لقا میں

دیکھے تھے کسی شوخ کے بکھرے ہوئے گیسو
بادل میں کشش ہے نہ وہ انداز گھٹا میں

کلیاں تو چٹکتی ہیں فنا ہوتی ہے شبنم
اِک جنس کی تاثیر بظاہر ہے صبا میں

تصویر سی بن جاتی ہے سو رنگ کی یکدم
کیا سحر ہے فنکاریِ الفاظ و صدا میں

معمور ستاروں سے ہیں گھر اہلِ ریا کے
مدھم سا ہے مٹی کا دیا کُنجِ وفا میں

آ جائے کبھی شعر کے پیکر میں تو کیا ہو
وہ سوز جو لرزاں ہے یتیموں کی دعا میں

اتنا ہی نہیں لب پہ کسی نام سے اظہر
بے نام سا ارمان کہ ہے دل کی فضا میں

قمر ہاشمی

ہوائے دشتِ تنہائی چلی ہے　　　دلِ پُرشور میں خاک اُڑ رہی ہے

طرب کا نغمہ کیا دل سے اُٹھے گا　　　یہ شہنائی نہیں ہے بانسری ہے

وہ مجھ سے داستانِ غم سُنیں گے　　　کہ یہ بھی اِک ادائے دلبری ہے

بہار افروز ہونٹوں کا تبسم　　　گلوں پر رقص کرتی چاندنی ہے

شفق یہ دل کے داغوں کی ہے یا پھر　　　دُکانِ لالۂ صحرا سجی ہے

وہاں تو بے بہا موتی ہیں آنسو　　　جہاں اک بے حسی ہے بے دلی ہے

محبت سرنگوں ہے مدتوں سے　　　وفا اپنے ہی ہاتھوں مر چکی ہے

وہ ظلمت ہے کہ راہیں تک ہیں اوجھل　　　غنیمت ہے جو دل کی روشنی ہے

کسی کی سنگ باری کا اثر کیا　　　کہ ٹوٹا دل بھی ہیرے کی کنی ہے

تماشا کیا دلِ آشفتگاں کا
قمرؔ ویران پکچر گیلری ہے

پرتو روہیلہ

غم اٹھایا ہے ترے پیار میں کتنا کتنا
سانحہ جان پہ گزرا ہے تو کیسا کیسا

وقت کی شاخ پہ بھیگا ہوا کپڑا ہوں میں
جس سے ٹپکے ہے مری جان کا قطرہ قطرہ

کیسی شب ہے کہ درختوں پہ پرندے جاگے
سسکیاں لیتا اٹھا خواب سے بچہ بچہ

وہ مرے درد کے سورج تلے آ کر بیٹھیں
حق کو دیکھا ہے سدا جنہوں نے سایہ سایہ

اپنی تالیف کو اب مانگے ہے دفتر دفتر
وہ کہانی کہ جو مرقوم ہے چہرہ چہرہ

ایک ٹھوکر تھی سرِ منزلِ غم کھائی تھی
ہر قدم آج تلک پڑتا ہے بہکا بہکا

ضبط کے حکم نے زخمی کیا پہلو پہلو
شکوۂ عشق سوا پھیلا ہے سینہ سینہ

میں وہ سرکش ہوں کہ پیوندِ زمیں بھی ہو جاؤں
آسماں پہ ہو مری خاک کا ذرہ ذرہ

شفق ہاشمی

وہ کیسی نیند دے گیا کہ خواب ٹوٹتا نہیں
بہارِ جسم و جاں کا وہ سراب ٹوٹتا نہیں

رفاقتیں ہوا کی آفرش اسے ڈبو گئیں
وگرنہ سنگِ مہر سے حباب ٹوٹتا نہیں

زمیں کی نخوتوں کا پے بہ پے یہ احتساب ہے
عبث تو آسمان سے شہاب ٹوٹتا نہیں

بہا کے بستیوں کو سیلِ تند و تیز لے گیا
جو بند ٹھیک باندھتے عذاب ٹوٹتا نہیں

بدن کے شاخسار پر شباب بن کے کھل اٹھا
صبا کے لمس سے کبھی گلاب ٹوٹتا نہیں

وہ کتنے موسموں سے ہے رفیقِ جسم و جاں شفقؔ
مگر وہ پہلے روز کا حجاب ٹوٹتا نہیں

وفا براہی

ناقدِ باکمال سے پوچھو
دورِ ماضی کو حال سے پوچھ

منزلِ شوق کھو گئی کیوں کر
پر شکستہ خیال سے پوچھ

رقصِ آسیب کا سبب کیا ہے
عاملِ قیل و قال سے پوچھ

کاوشِ روزگار کا حاصل
ہستیِ لازوال سے پوچھ

کیوں حقارت سے دیکھتے ہیں لوگ
اپنے دستِ سوال سے پوچھ

عقدۂ سازِ بے نوا ہے کیا
مطربِ ماہ و سال سے پوچھ

بزمِ امکاں میں کیوں اداسی ہے
اس کو چشمِ خیال سے پوچھ

مدعا کیا ہے رقصِ ہستی کا
گردشِ بے مثال سے پوچھ

کیوں تصور ہے ظلمتِ شب کا
آفتابِ جمال سے پوچھ

پوچھنا ہے وفاؔ اگر کچھ اور
پیرِ گردوں مثال سے پوچھ

لیث قریشی

کھوئی ہوئی مجھ کو تری تصویر ملی ہے
کس خواب پریشاں کی یہ تعبیر ملی ہے

کچھ اور سوا ہو گیا احساسِ اسیری
جب بھی کوئی ٹوٹی ہوئی زنجیر ملی ہے

بازار کی توہین بھی شرما گئی ہو گی
گھر والوں سے گھر ہی میں جو توقیر ملی ہے

کیا شکوۂ بے مہریٔ گلہائے تمنّا
یہ اپنے لہو کی ہمیں تاثیر ملی ہے

تدبیر کا قائل تو ہمیشہ سے ہوں لیکن
اب کے مری تدبیر سے تقدیر ملی ہے

ہے کشتِ وفا اپنے لہو سے بھی مقدّس
ماں باپ سے ورثے میں یہ جاگیر ملی ہے

سچ ہی تو کہا تھا کوئی گالی تو نہ دی تھی
کس جرم کی پھر مجھ کو یہ تعزیر ملی ہے

پہنائے دیوانۂ ہستی میں مجھے لیثؔ
تعمیر نہیں حسرتِ تعمیر ملی ہے

میں ساٹھ سال کا ہو کر بھی آج تک ہوں جواں
مری بہار سے رہتی ہے دُور دُورِ خزاں

تمام عمر مری نذرِ تجربات ہوئی
ملا نہ دوست کہ جس پہ ہو دوستی نازاں

مرے کلام کی کیا ہو تعارفی تقریب
کہ جو عیاں ہو اسے اور کیا کروں میں عیاں

کتابِ زیست میں یوں تو کئی فسانے ہیں
کسی کو دے نہ سکا آج تک کوئی عنواں

نہ عافیت، نہ سکوں ہے نہ روح کو آرام
میں کیسے کہہ دوں پھر اپنے مکاں کو اپنا مکاں

یہ میرا دل تو شریکِ غمِ زمانہ ہے
مگر یہ غم کہ زمانہ ہے میرے درپئے جاں

بنامِ شعر و سخن کس سے دوستی کیجے
بزعمِ خویش ہے ہر شخص غالبِ دوراں

مرے قویٰ ہیں اگر مضمحل تو کیا غم ہے
کہ میری فکر زیادہ ہے جسم و جاں سے جواں

نہیں اجازتِ اظہارِ حق مگر اے لیثؔ
زہے نصیب کہ میرا قلم ہے پھر بھی رواں

ابوالفطرت میر زیدی

دیتے ہیں سبھی لوگ حوالے دل کے
ہے کوئی جو طوفان سنبھالے دل کے

ہم گوشہ نشینوں کو نہ چھیڑو صاحب
ورنہ ابھی پڑ جائیں گے لالے دل کے

یہ آدمی ہر رنگ بدل سکتا ہے
انسان کہاں ہوتے ہیں کالے دل کے

اچھا ہوا تم نے بھی نہ مانی دل کی
ہم نے بھی تقاضے کئی ٹالے دل کے

زیدی نے زباں اپنی ہلائی نہیں اب تک
اور چھوڑ دیئے آپ نے چھالے دل کے

میری تقدیر کہ میں رہ گیا تنہا یارو
کون کس حال میں ہے آج تمہیں کیا یارو

ان کے سینے میں جو دل ہے اسے میرا کہنا
آج سے پہلے یہ احساس نہیں تھا یارو

کون کہتا ہے اسے میرے جنوں سے بہتر
عقل تو وقت پہ دے جاتی ہے دھوکا یارو

مجھ سے بے باک سخنور کے لئے مشکل ہے
آج کے دور میں جی مار کے جینا یارو

پیار ہی پیار میں ہم دار تک آ پہنچے ہیں
یہ بھی ہوتا ہے محبت کا طریقہ یارو

انقلاب آئے تو ایمان کی قوت جانے
حال معلوم ہو کچھ اہل نظر کا یارو

اور کچھ کام ابھی وقت سے نمٹانے ہیں
پھر ملیں گے کسی چوراہے پہ اچھا یارو

اس نے طوفان میں ہر موج سے ٹکر لی ہے
آج تک آپ نے زیدی کو نہ سمجھا یارو

سرشار صدیقی

کس نے لکھی نہیں وصال کی بات
میں نے کہہ دی، تو ابتذال کی بات؟

جسم تا جسم کوئی قرب نہ بُعد
ہاں، مگر جرأتِ سوال کی بات

"عشق" ناکامیِ ہوس کا نام
ہجر محرومیٔ وصال کی بات

کوئی چہرہ بھی بے نقاب ہوا
چل پڑی اس کے خط و خال کی بات

جو گنہگار بے گنہ ہی تھے
اُن پہ کھلتی ہی کیوں وصال کی بات

صرف چالیس سال کے سن میں
زیب کیا دے غمِ مآل کی بات

انارکلی

پہلی بار اُس نے میرے لئے
رات کی تیرگی اور تنہائی میں
اپنی چوکھٹ سے باہر نکالے قدم
اور اسے حاکمِ وقت کی طرح سے
اس کے ماں باپ نے
اپنے ہی گھر کی دیوار میں چُن دیا

اور میں
ایک معصوم شہزادے کی طرح سے
اپنے رنگین وعدے لئے
اپنے سنگین دعوے لئے
جان و دل کی فتوحات کی راہ میں
ایک تازہ محاذِ نظر پر
اک نیا جسم
تسخیر کرنے روانہ ہوا

افتخار عارف

بہارِ اندیشہ

اب کے بار بھی
موجِ بہار نے
ساعتِ مہر میں
ہار سنگھار سے
ہم دونوں کے نام لکھے ہیں
اور دعا مانگی ہے کہ "اے راتوں کو جگنو دینے والے
سوکھی ہوئی مٹی کو خوشبو دینے والے
شکر گزار آنکھوں کو آنسو دینے والے
ان دونوں کا ساتھ نہ چھوٹے"
اور سنا یہ ہے کہ ہوائیں اب کے بار بھی تیز بہت ہیں
شہرِ وصال سے آنے والے موسم ہجر انگیز بہت ہیں

پتہ نہیں کیوں؟

پتہ نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی کوئی خواب بکھرا
تو رات میری امانتیں مہرباں سورج کو سونپ جائے
پتہ نہیں کیوں میں چاہتا ہوں
پتہ نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ جب دعاؤں کو ہاتھ اٹھیں
کوئی میرے بلند ہاتھوں میں پھول رکھ دے
پتہ نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ اب کے میرے عدو مقابل میں جتنے آئیں
میری آنکھوں میں جذب ہو جائیں اور ترکش میں تیر جتنے
میرے سینے میں ٹوٹ جائیں
پتہ نہیں کیوں میں چاہتا ہوں

ہوائیں وہ ہیں کہ ہر زلف پیچ دار ہوئی
کسے دماغ کہ اب آرزوئے شانہ کرے

چلو تو اب کے کوئی واردات ہو جائے
زمانہ یوں بھی تو ہر بات کا فسانہ کرے

ابھی تو رات کے سب نگہ دار جاگتے ہیں
ابھی سے کون چراغوں کی لو نشانہ کرے

سلوک میں بھی وہی تذکرے وہی تشہیر
کبھی تو کوئی اک احسان غائبانہ کرے

میں سب کو بھول گیا زخم مندمل کی مثال
مگر وہ شخص کہ ہر بات جارحانہ کرے

نئے موسم کی خوشبو آزمانا چاہتی ہیں
کھلی باہیں سمٹنے کا بہانہ چاہتی ہیں

فصیل جسم کو ہر طور ڈھانا چاہتی ہیں
نمو کی خواہشیں اظہار پانا چاہتی ہیں

نئے آہو، نئے صحرا، نئے خوابوں کے امکاں
نئی آنکھیں نئے فتنے جگانا چاہتی ہیں

نگارِ شام بے منزل بھٹکتی آرزوئیں
بسیرے کے لیے کوئی ٹھکانہ چاہتی ہیں

بدن کے سرپھرے باغوں کی شوریدہ ہوائیں
نشاطِ گمرہی کے گیت گانا چاہتی ہیں

بدن کی آگ میں جلنے لگے ہیں پھول سے جسم
ہوائیں مشعلوں کی لو بڑھانا چاہتی ہیں

یہ اب کھلا کہ کوئی بھی منظر مرا نہ تھا
میں جس میں رہ رہا تھا وہی گھر مرا نہ تھا

میں جس کو ایک عمر سنبھالے پھرا کیا
مٹی بتا رہی ہے وہ پیکر مرا نہ تھا

پھر بھی تو سنگسار کیا جا رہا ہوں میں
کہتے ہیں نام تک سرِ محضر مرا نہ تھا

نا معتبر ہوئے یہ ابھی کل کی بات ہے
شہرِ مثال میں کوئی ہمسر مرا نہ تھا

سب لوگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ تھے
اک میں ہی تھا کہ کوئی بھی لشکر مرا نہ تھا

وہی پیاس ہے وہی گھرانا ہے
شبگیر سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

دریا پہ قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

کاسۂ شام میں سورج کا سر اور آوازِ اذاں
اور آوازِ اذاں کہتی ہے فرض نبھانا ہے

ایک جزیرہ اس کے آگے پیچھے سات سمندر
سات سمندر پار سنا ہے ایک خزانہ ہے

سب کہتے ہیں اور کوئی دن یہ ہنگامۂ دہر
دل کہتا ہے ایک مسافر اور بھی آنا ہے

بحر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رستہ دیکھنے والی آنکھوں کے انہونے خواب
پیاس میں بھی دریاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے ہیں
ایک ذرا سی جوت کے بل پر اندھیاروں سے بیر

پاگل دیے ہواؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
رنگ سے خوشبوؤں کا ناطہ ٹوٹتا جاتا ہے

پھول سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
ہم نے خاموشی کا عہد کیا ہے اور کم ظرف

ہم سے سخن آراؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

شاخ بہ شاخ گھومیے اور گلاب دیکھیے
ایسا بھی کیا کہ عمر بھر ایک ہی خواب دیکھیے

ایسا بھی کیا کہ عمر بھر ایک سی تشنگی رہے
اور فریب کھائیے اور سراب دیکھیے

پیکرِ مہ وشاں بھی ہے ایک کھلی ہوئی کتاب
حوصلے ساتھ دیں تو پھر نت نئے باب دیکھیے

ڈوب گئے جو ماہتاب ان کو بھلا بھی دیجیے
پھر نئے زخم کھائیے پھر نئے خواب دیکھیے

شیشہ گرانِ شہرِ غم موسمِ سنگ آ گیا
کیجیے پھر شمارِ زخم فردِ حساب دیکھیے

جمیل یوسف

ایک نظم

یہ زنِ نغمہ گر و عشق شعار　　اس کو اپنے سے ہی فرصت ہے کہاں

نرگسیت نے کیا ہے اس کو　　اپنی ہی ذات کے گنبد میں نہاں

عشق ہے اپنے بدن سے اس کو　　اس کی حسرت میں ہوئی ہے حیراں

ہے بدن اس کا دریدہ جب سے　　یہ اسی کرب میں ہے نوحہ کناں

پاس آتے ہوئے گھبراتی ہے　　کرتی ہے آرزوئے وصل کہاں

خود پسندی کا تقاضا ہے یہی　　اپنی راہوں میں ہے یہ خود ہی رواں

اپنے ہی نقشِ قدم ڈھونڈتی ہے　　لے کے تنہائیوں کا بارِ گراں

رہتی ہے اپنے تعاقب میں صدا　　اپنے سائے سے ہراساں ترساں

جس خرابے میں گزر ہے اس کا
اس خرابے میں کوئی مرد کہاں

پروین سید فنا

(۱)

شعلۂ جاوداں

یہ برگِ تر
اس کو زرد آندھی کا ڈر
نہ خوفِ خزاں
کہ اس کی رگوں میں سچ کا لہو رواں ہے
یہ وقت کی گردشوں میں
اپنی انا کے محور پہ ایستادہ
ابد کی منزل پہ شادماں ہے
یہی تو شعلۂ جاوداں ہے

(۲)

زرد چہرے پہ ڈھونڈتے ہو گلاب!

ریزہ ریزہ وجود کی تہہ میں
کونسے رنگ کے تمنائی
دشت کی دھول میں اٹا چہرہ
درد کی لو سے آنکھ بھر آئی
زرد چہرے پہ ڈھونڈتے ہو گلاب؟

(۳)

منتظر آنکھیں

ہوا کے دوش پہ اڑتے ہوئے لمحوں سے پوچھو
صبحدم شبنم سے بھیگے پھول کے چہرے
کی آنکھوں میں رُکے آنسو — !
گزشتہ رات
کربِ انتظارِ شوق — !
پتھر ہو گئیں وہ منتظر آنکھیں
اسے آنا تھا ہنگامِ سحر سے پیشتر
شہرِ فسوں کے قفل کی سب کنجیاں تھیں
جس کے ہاتھوں میں — !

اقبال ساجد

باغ میں کل رات اشکوں کے بچھونے لگ گئے
پھول بچوں کی طرح شاخوں پہ رونے لگ گئے

آگ کے در اور دھوئیں کی چھت مقدر ہوگئی
کتنے گل زادے یہاں شعلوں پہ سونے لگ گئے

لٹ گیا دل کا عجائب گھر مگر یہ تو ہوا —
ہاتھ کچھ اس کے بھی، سونے کے کھلونے لگ گئے

پہلے ہم نے جسم کی کاٹیں رگیں اور اس کے بعد
گوشت کے ٹکڑے سرِ مقتل پرونے لگ گئے

پھر سے ساجد جھاڑ دی ہے دل سے مایوسی کی گرد
پھر سے تازہ خواب ہم آنکھوں میں بونے لگ گئے

اپنا الگ معاشرہ، اُس کا الگ سماج ہے
ہم ہیں غریب و سادہ شخص اور وہ زرمزاج ہے

خوف کے نیل آنکھ میں جاگ رہے ہیں اشک اشک
آج بھی دل کے مصر پر، جیسے خدا کا راج ہے

شہر میں ہو کہ دشت میں، خوب رہے گا معرکہ
ہم بھی چراغِ طبع ہیں، وہ بھی ہوا مزاج ہے

خواب کی فصل ذہن میں، ابر کی رت نگاہ میں
بھوک مکیں ہے پیٹ میں، اپنا حصول اناج ہے

اُس کی خوشی کے واسطے ہنستے ہیں کھوکھلی ہنسی
ہم تو قلق پسند ہیں، اور وہ خوش مزاج ہے

پھرتے ہیں شہر شہر ہم، لے کے دکانِ شاعری
اب سے نہیں شروع سے اپنا یہ کام کاج ہے

جس کو کینسر ہوا، جان سے وہ گزر گیا
جو ہے مریضِ شاعری، دہر میں لاعلاج ہے

قمر جمیل

رات دیوانی ہے اس رات سے اے میرؔ نہ بول
دیکھ تنہائی سے پھر نالۂ شبگیر نہ بول

اتنی فرصت دے خدارا کہ محبت آجائے
دیکھ ابھی قصۂ جاں اے میری تصویر نہ بول

کتنے دیوانے ہیں مہتاب کی زنجیر کے ساتھ
کتنے زندانی ہیں اے سایۂ شمشیر نہ بول

ہاں گزر اور ذرا اور ذرا آہستہ
میری ویرانی سے اے کاتب تقدیر نہ بول

میں تشنہ لب ہوں مگر جامِ یار لایا ہوں
خدا کی یاد میں پھولوں کا ہار لایا ہوں

یہ اک چراغ جو روشن تھا سوگواروں میں
تمہارے طاق سے جاکر اُتار لایا ہوں

خدا کے واسطے چرچا نہ کر غزالوں میں
کہ آج تجھ کو بر لئے شکار لایا ہوں

کیا جو عرض کہ میرا سخن قیامت ہے
کہا میں ایسی قیامت ہزار لایا ہوں

قمر جمیل

روشنی جاں سے آئی ہے
شہرِ غزال سے آئی ہے

دیکھ یہ بنتِ شبِ بہار
جامِ سفال سے آئی ہے

صبح میں آج یہ روشنی
اُس کے وصال سے آئی ہے

میری بہار یہاں جمیلؔ
تیرے جمال سے آئی ہے

شہر میں سب کی ہیبتیں، محفلوں میں نواگری
پھر بھی میرے لہو میں تھی ایک عجیب قلندری

چاند میں جیسے فاختہ، شاخ پہ جیسے چشمِ نم
غم ہے عجیب کھوکھلا رات عجیب مسخری

اُس کی گلی سے آئے ہیں لوگ یہ سوچتے ہوئے
روح میں ہفت آسماں آنکھ میں اک کبوتری

ایک خیال کی پری شیشۂ جاں میں آئی تھی
وہ بھی اُڑا کے لے گئی یار کی شامِ کافری

رات بہشت میں مجھے میرا خدا بھی مل گیا
میں نے اُسی کو بیچ دی اپنی کلاہِ افسری

قمر جمیل

مہتاب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص
یہ خواب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

نیلم کی طرح رات چمکتی ہے دیکھنا
کمخواب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

نغمہ میں ڈوبنے کے لئے میرا ہمنشیں
بیتاب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

وہ دیکھو فرشِ گل ہے کہ ہمراز ہے کوئی
محراب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

اس زندگی کے بیچ بلاتا ہوا جمیلؔ
گرداب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

رشید نثار

جیب شکستہ دامن خالی، پاپ نہیں ہے پن بھی نہیں
دل پر ہاتھ ہے پاؤں زخمی جینے کا کوئی گن بھی نہیں

ذات میری گمنام کمنڈ ہے، راج محل آسیب کا گھر
کون بچی ہے کون ان داتا اب تو برستا ہن بھی نہیں

ریزہ ریزہ شخصیت سے، سرد ہوا بھی بدنیت ہے
وقت کی چکی کیا پیسے گی، گیہوں بھی نہیں ہے گھن بھی نہیں

کس پاتال میں سورج ڈوبا، کس کھائی میں چاند گرا
کیسی دھوپ اور کیسا سایا تاروں کی کن من بھی نہیں

کس نے لفظ کی حرمت لوٹی، حرف کہاں پہ قتل ہوا
ذہن پہ قفل ہیں اجڑی سوچیں ہونٹ نہیں ہیں گن بھی نہیں

شہر کی بھیڑ میں کھونے والا، اک جنت کا باسی تھا
کب لوٹے گا وہ متوالا، اس کی کوئی سن گن بھی نہیں

مہر زباں پر لمبی سوچیں کس کو کہہ دیں، کس کو نوچیں
نہر فرات پہ بازو ٹوٹے ہاتھ نہیں ناخن بھی نہیں

پاؤں دھروں تو ٹھوکر کھاؤں کٹ جاؤں کٹ آؤں
میرا زماں نہ کوئی مکاں ہے بیخ نہیں ہے بن بھی نہیں

سید احسن زیدی

عشق میں کیسے جان سے گزرے
ہجر کے امتحان سے گزرے

تیری محفل سے اس طرح اٹھے
کوئی جیسے جہان سے گزرے

پوچھتے کیا ہو وسعتیں اپنی
بارہا آسمان سے گزرے

ٹوٹ کر رہ گیا ہوں اب ایسے
تیر جیسے کمان سے گزرے

کوئی شکوہ نہیں کیا تجھ سے
بیخودی میں گمان سے گزرے

ذکرِ شیداؔ بھی اور ترے لب پر
ہائے کیسے دہان سے گزرے

شوکت ہاشمی

رائیگاں خوابوں کے دکھ یا گم شدہ رشتوں کے دکھ
سب یہاں پر سہہ رہے ہیں آخری سانسوں کے دکھ

مستند ہم نے کیا آوارگی کی رسم کو
ہم نے بانٹے شہر بھر کی جاگتی راتوں کے دکھ

آج خود ٹوٹا تو آنسو ایک بھی نکلا نہیں
وہ رُلا دیتے تھے جن کو کانچ کی گڑیوں کے دکھ

ایک نے ٹھوکر لگائی ایک دھکا دے گیا
لوگ یوں بھی بانٹتے ہیں ڈولتے قدموں کے دکھ

اس سے بڑھ کر آ نہیں سکتی قیامت کوئی اور
مائیں بھی محسوس اب کرتی نہیں بچوں کے دکھ

لوٹ کر آنا تو تھا اس کو مگر آیا نہیں
چند لمحوں میں بھلا دیتا تھا جو برسوں کے دکھ

ڈھیر کر دے گی یہ میرے جسم کی مٹی مجھے
ایک دن کھا جائیں گے مجھ کو میری سوچوں کے دکھ

قہقہے یوں بھی لگائے میں نے اکثر ہاشمیؔ
کیوں سنے کوئی میرے اندر کے سناٹوں کے دکھ

رشیدہ سلیم سیمیں

لو حادثہ اِک اور یہ دل سوز ہوا ہے
دنیا نے ہمیں پیار سے منسوب کیا ہے

کچھ تذکرۂ دوست سے روشن ہے یہ محفل
کچھ آج چراغوں میں حرارت بھی سوا ہے

بھرتی ہے نئے رنگ وہی گردشِ دوراں
رشتۂ غمِ جاناں سے جہاں ٹوٹ گیا ہے

تاریک ہوئے ہیں جو سرِ عرش ستارے
شاید کسی مجبور کا دل ڈوب گیا ہے

مجنوں کا فسانہ بھی پرانا سہی لیکن
اِک تازہ کہانی کا یہ عنوان ہوا ہے

آج اُن کی نگاہوں میں بھی ہیں درد کے آثار
شاید یہ ہماری ہی وفاؤں کا صلہ ہے

ضبطِ غمِ دل سے ہے بپا ایک تلاطم
سیمیں کہیں روکے سے بھی طوفاں رُکا ہے

شوکت واسطی

عجیب بات ہے دن بھر کے اہتمام کے بعد
چراغ ایک بھی روشن ہوا نہ شام کے بعد

سنائیے کیسے رودادِ شہرِ ناپرساں
کہ اجنبی رہے یاں مدتوں قیام کے بعد

خرد علیل تھی دورِ شراب سے پہلے
قدم میں آئی تھی لغزش شکستِ جام کے بعد

ضرور توڑ کے نکلے اسیرِ زنجیر ہیں
پڑے مگر یہ پرندے قفس میں دام کے بعد

جناب سوچ کے کیا ہم رکابِ موجِ ہوا
کہ بیٹھ جانا تھا جب ایک آدھ گام کے بعد

رہے چراغ دریچے میں در کھلے رکھنا
مسافر آن نکلتے ہیں بعض شام کے بعد

کرشمہ ایک ہی دیکھا ہے راہنماؤں کا
مقام سخت تر آیا ہر اک مقام کے بعد

ستم ظریفیٔ تاریخ ہے کہ مسند گیر
ہمیشہ خاص ہوئے انقلابِ عام کے بعد

کرم نواز تھے شوکت سلام سے پہلے
بگڑ گئے ہیں جو یک لخت یوں سلام کے بعد

اعجاز اعظمی

دو نظمیں

لکیر

ازل سے تا ابد یونہی
رواں دواں ملے گی یہ
جہاں جہاں بشر گیا
لکیر کھینچ کر گیا
کہیں جنونِ تمکنت
میں سرخ رنگ کر گیا
حصارِ آتشیں کہیں
حسین و دلنشیں کہیں
کہیں کہیں پگھل گئی ہے
روٹیوں کی آنچ سے
کہیں کہیں پھسل گئی ہے
عاشقانہ چال سے
کہیں کہیں الجھ گئی ہے
ذہن کے ابال سے
کہیں نشانِ امن ہے
کہیں نزاع عام ہے
کہیں پہ شرق و سط ہے
کہیں پہ ویت نام ہے
لکیر ہی کے واسطے یہ فتنۂ دوام ہے
فضا میں تیرتی ہوئی
خلا کو چیرتی ہوئی
چاند پر اتر گئی
لکیر تیز گام ہے
اسے مرا سلام ہے

آدرشوں کے کھنڈر

ظلمتوں کے ورق
نور کے حاشیے
زندگی کے سبق
درد کے تبصرے
گردشوں کے کھنڈر میں
بھٹکتے ہوئے
حسرتوں کے دیئے
یاس کے قافلے
قربتیں کھو گئیں
منزلیں سو گئیں
لوٹتی ساعتوں کو بھی آواز دو
پیار بیدار ہے
چھیڑ دو پھر کوئی داستانِ وفا
آگہی کے لئے
زندگی کے لئے

اقبال فریدی

مٹی کی دیوار

تتلی خوشبو جھونزا جادو سارے میرے سراغ
دودھ کٹورے شہد کی نہریں آنکھیں بھرے ایاغ
اِک دن جگمگ جگمگ ہوگا پیشانی کا داغ

دن جانے والے آئے اب توبہ بند ہوئی
پردۂ شب نے لاکھ چھپایا سسکی بلند ہوئی
جسم کی مٹی ، مٹی میں آخر پیوند ہوئی

مٹی کے دروازے کے اُس پار نہیں ہے کوئی
کہنے والے کہتے ہیں اک حسن، حسیں ہے کوئی
بے شک اے اقبال فریدی یار کہیں ہے کوئی
آؤ چلیں اس پار

آسی غازیپوری

سکون بخش مجھے سبز بخت ایسا تھا
وہ تپتی دھوپ میں بھی اک درخت ایسا تھا
اکیلا کر گیا اندھی مسافتوں میں مجھے
گِلہ نہیں ہے کہ میرا ہی بخت ایسا تھا
مثالِ سنگ مرے ساتھ کوئی بات نہ کی
وہ اجنبی تو طبیعت کا سخت ایسا تھا
تمام گاؤں نے کاٹیں مری جڑیں، شاید
مرا وجود بھی سوکھے درخت ایسا تھا
اُڑا کے وادیٔ قربت میں لے گیا مجھ کو
تمہاری مہرباں یادوں کا تخت ایسا تھا
غریب شہر ہی آسی نہ تھا پریشاں سا
امیرِ شہر بھی کچھ لخت لخت ایسا تھا

عذرا وحید

نہالِ شوق پہ جب جب کھلے گلاب کے پھول
اُداس آنکھوں میں بکھے گئے سراب کے پھول

وہ سب بہار کے سائے تھے شاخِ ہجراں پر
کئے شمار تو مرجھا گئے خواب کے پھول

تمام رات مرے سبز رنگ آنگن پر
برستے ہیں تری یادوں کے تیرے خواب کے پھول

گلاب لہروں کے لب فرطِ غم سے پاگل تھے
سمندروں میں سجے تھے کئی حباب کے پھول

تھیں زرد بانہوں کی مانند پتیاں جن کی
خزاں رتوں میں کھلے تھے کئی عذاب کے پھول

چراغ بن کے سرِ رہگزر جلے جو کبھی
وہ ہاتھ خشک ہیں جیسے کسی کتاب کے پھول

ہر طرف اک سنگِ در ہے آستاں کوئی نہیں
دیدہ و دل کے لئے اب امتحاں کوئی نہیں

زندگی سیدھی سڑک ہے بے شجر بے پیچ و خم
اب حقیقت ہی حقیقت ہے گماں کوئی نہیں

کچھ شکستہ آئینے ماضی کے ایوانوں میں ہیں
فصلِ گُل کا صحنِ گلشن میں نشاں کوئی نہیں

چھپے چڑیوں کے باہر اجنبی قدموں کی چاپ
دل کی دھڑکن کی صداؤں سے اماں کوئی نہیں

خالی چہروں کی نمائش ہے بھرے بازار میں
اور سارے شہر میں خالی مکاں کوئی نہیں

پتلیوں پہ ثبت ہیں سب نقش لمحے زنگار رنگ
موت کے گلشن میں بھی کنجِ اماں کوئی نہیں

اک شجر ہے گھر سے باہر جو سدا سر سبز ہے
ایک دروازہ ہے جس کا پاسباں کوئی نہیں

اکرم طاہر

وہ درد کہ ورثے میں انساں نے جسے پایا
جذبوں میں تو آیا ہے لفظوں میں نہیں آیا

اک حرفِ تمنّا ہے جو لفظ نہیں بنتا
اس عکس کے جلووں نے آئینے کو دھندلایا

تعبیر کی کثرت سے ہر خواب پریشاں ہے
اب اشک کا اک قطرہ ہے آنکھ کا سرمایا

کیا جسم پہ اترائیں، کیا روح پہ نازاں ہوں
یہ دولتِ دنیا ہے، وہ حشر کا سرمایا

اُمید کی چنگاری دامن میں سُلگتی ہے
دل راکھ ہوا جل کر کندن نہیں بن پایا

کلیوں کو چٹکنے دو، پھولوں کو مہکنے دو
پھر خاک اڑا دیگے جب رنگِ خزاں چھایا

جلوت کے سرابوں میں خلوت کے خرابوں میں
تسکین نہیں دیکھی، آرام نہیں پایا

گردش میں بھی کاسہ تھا، سر رند بھی پیاسا تھا
میں بزمِ شبانہ سے یہ دیکھ کے اُٹھ آیا

شامِ صحرا اُداس کتنی ہے
ہم نشینوں کی آس کتنی ہے

ہم فقیروں کے پاس آئی ہے
شامِ غم بدحواس کتنی ہے

پس رُووں ہی سے پوچھ لینا تھا
جستجو کس کو راس کتنی ہے

بے دلی تجھ کو کیا خبر ہوگی
موسموں میں مٹھاس کتنی ہے

اب یہ گلچیں سے پوچھیئے گل میں
رنگ کتنا ہے، باس کتنی ہے

نیم عریاں لباس کہتا ہے
آرزو بے لباس کتنی ہے

بھر کے چھلکے ہوس کے پیمانے
پھر بھی یاروں کو پیاس کتنی ہے

مجھ سے بے دل کو کیا خبر طاہر
آس کتنی، ہراس کتنی ہے

قیصر قلندر (بھارت)

یادوں نے بازو پھیلائے ارمانوں نے نازک ہات
امیدوں کے گجرے پہنے آئی ہے پھر تنہا رات

وقت کی شاخوں سے ٹوٹے ہیں، لمحوں کے انمول گلاب
عمرِ گریزاں! تیرے بس میں خوشبو کی ہے کیا سوغات ؟

کب زنجیرِ جدائی ٹوٹے، کب چھوٹیں خوشیوں کے ہرن
آسودہ راحت کی صبحیں، نغموں کی کب ہو برسات

ارضِ تمنا پر ٹپکی ہیں جیسے لمحوں کی بوندیں
صحرا صحرا درد کی دنیا، بدلے بدلے سے حالات

چُپ کی شبنم سبزہ سبزہ، سناٹا گاؤں گاؤں
شہر کے ہنگاموں میں میرے من کی کون سنے ہے بات

شام کی دلہن گنگوں زینے اُتری دن کے آنگن میں
نغموں کی حساس خموشی درہم برہم رات کی رات

درد کی آنچ سے تپ کر نکھرا کندن صورت دل قیصر
دکھ غموں کی اگنی جاگے، لاکھ ہوا اشکوں کی برسات

روزِ حساب ہے چلو صدمے رقم کریں
آئے تو ہیں غموں کا ذرا بوجھ کم کریں

سر سے ہراس و خوف کی چادر اتر گئی
زخموں کا وہ شمار دل و جاں بہم کریں

اپنی عنایتوں سے نوازا کبھی کبھی
محرومیوں کے ذکر سے کیا آنکھ نم کریں

وہ سب کے دل کا حال اگر جانتا نہیں
ہم کیوں نہ داستانِ فضیلت رقم کریں

پھر سوچیے کہ اذن کے ترکش پہ ہاتھ ہے
ہم جب بھی چاہیں خواہشوں کا سر قلم کریں

عرفانِ غم کی بات یہاں مشتہر کریں
شائستگیِ درد سے آگاہ ہم کریں

ہر شخص نے تراش لیا ہے خدا نیا
مشکل یہ ہے کہ سر کو کہاں جا کے خم کریں

مینائے حرف و صوت میں فردا کی مے کہاں
قیصر کہاں اب آرزوئے جامِ جم کریں

وزیری پانی پتی

معتبر ہے خوش فہمی، مطمئن ہے دیوانہ
در وسیلِ مہتابی، داغِ شمع کاشانہ

بزم بزم چرچے ہیں، شمع شمع حیراں ہے
چاند سے اُلجھ بیٹھا، اِک شریر پروانہ

آج واقعی گویا، تا بہ لب نہ آئے گی
موجِ مے دکھاتی ہے، شوخیٔ عروسانہ

یوں عرق عرق ہو کر، بادہ ناپنے والے
لا سکے تو لا کوئی، تشنگی کا پیمانہ

دوستی تو اِک جانب، عہدِ عاشقی میں بھی
ہم نباہے جاتے ہیں، چشمکِ حریفانہ

عقل و دل میں کچھ ایسا فرق بھی نہیں یعنی
سوچتا ہے فرزانہ، دیکھتا ہے دیوانہ

مجھ میں اے وزیری ہے، ایک جنگ سی جاری
ذہنیت ملوکانہ، زندگی غلامانہ

نجمی صدیقی

بیٹھ رہے خامشی سے جو بھی جہاں ہے
کوئی نہیں جانتا کہ کون کہاں ہے

سوچ رہا ہوں کہ رات کون ملا تھا
آج میرے منہ میں جانے کس کی زباں ہے

تم نے کہاں سے یہ خاک سر میں سجا لی
میں نے دیا تھا تمہیں جو پھول کہاں ہے

آگ تو پیڑ کے تنے میں رات لگی تھی
سوکھی ہوئی ٹہنیوں میں اب بھی دھواں ہے

رات گئے چیختی ہیں تیز ہوا میں،
میرے پڑوس میں بھی کوئی خالی مکاں ہے

مجھ کو نئے راستوں نے گھیر لیا ہے
پھر بھی وہی پیڑ میرے گھر کا نشاں ہے

پاؤں تلے کی زمیں بھی چلنے لگی ہے
کیا مرے راستے میں سنگِ گراں ہے

شاخ ہری تھی یہ کون کاٹ گیا ہے
سب کا اگر نجمی ایک سود و زیاں ہے

فیروزہ بخاری

تجھ سے تکرار میں جو حد سے گزر جاؤں گی
میں تو یہ سوچ کے اُس وقت سے ڈر جاؤں گی

آب بن کے میں سمندر سے اُٹھی تھی لیکن
ابر بن کے بھی میں صحرا پہ اُتر جاؤں گی

یوں عبث مجھ سے عداوت کی نہ زحمت کرنا
ایک اُڑتی ہوئی بدلی ہوں گزر جاؤں گی

کچھ ستم اور زمانے کے عنایت ہوں اگر!
اپنے خوابوں کی طرح میں بھی بکھر جاؤں گی

چاند کی طرح میرا دل بھی ہے نکھرا نکھرا
چاندنی ساتھ رہے گی میں جدھر جاؤں گی

اِک تمنا ہے کہ مر جاؤں تو سچ کی خاطر
میں نہیں ہوں گی مگر روشنی کر جاؤں گی

اِک انا ہی تو میری راہ کی دیوار ہوئی
یہ جو ڈھ جائے تو یہ ہوگا کہ مر جاؤں گی

دوست دو چار معتبر رکھنا
دھیان میں رکھنا عمر بھر رکھنا

دل لگانا زمین والوں سے
خواب میں چاند کا سفر رکھنا

نیند کا کیا ہے آ ہی جائے گی
جاگنا ہے تو کچھ خبر رکھنا

تنگ و دو حال کی بجا پھر بھی!
رنگِ فردا پہ کچھ نظر رکھنا

شب تیرہ میں مہر چمکے گا!
حدتِ عزم و بال و پر رکھنا

عالمِ دل ہو صبحِ نو جیسے!
زیورِ درد زیبِ سر رکھنا

تیرگی اُس پہ جورِ پیہم بھی
اب تو لازم ہے راہبر رکھنا

فیروزہ بخاری

آرزو

خداوندِ برتر میری آرزو ہے
رہِ زندگی میں مجھے آشنا کر
اِک ایسی خوشی سے
کہ جیسے تڑپ اخترِ صبح دم کی
کہ جیسے سکوں خلوتِ نیم شب کا

مجھے وہ خوشی دے خداوندِ برتر
کہ میرے وطن کا پھریرا فضا میں
بہ شانِ دلاویزی و سربلندی
رہے عظمت آرا
کہ ہے عظمتِ سرزمینِ وطن سے
میری شانِ بالا، میری آن باقی
میرے شہرِ دل میں اُمنگیں جواں ہیں
اور اِس پر خداوندِ برتر یہی آرزو ہے
فقط ہو تری ذات کا اک بھروسہ
میری روح اور قلب کی روشنی سے
ہو بزمِ جہاں کا ہر اک ذرۂ روشن
فروزاں فروزاں فروزاں فروزاں

"وسوسہ"

بیل اُگی جب تنہائی کی
خطرے میرے آگے تھے
لیکن جوں جوں یہ بڑھتی تھی
خدشے بھی کچھ جاگے تھے
دیواروں سے اونچی ہوئی اب
بیل میری تنہائی کی
قد میں یہ مجھ سے بھی بڑی ہے

رام لعل نابھوی

مسکراؤ۔ ہنسی کی بات کرو
ہنس پڑو اور خوشی کی بات کرو

معنیٔ رنج و غم بدل ڈالو
جب ملو دل لگی کی بات کرو

دشمنی کر کے تم نے کیا پایا
پھر سے کچھ دوستی کی بات کرو

پھول کھلتے رہیں گے گلشن میں
کھلتے دل کی کلی کی بات کرو

موت سب کچھ سمیٹ لے گی میاں
دو گھڑی زندگی کی بات کرو

اب اندھیروں کا ذکر کیا معنی
چاند ہے چاندنی کی بات کرو

کس لئے توڑتے ہو دل میرا
کچھ تو دل بستگی کی بات کرو

جب ملو نابھوی سے ہنس کے ملو
پھول یا پنکھڑی کی بات کرو

نسیم سحر

خاموش ہیں لوگ یوں گھروں میں
گویا کہ ہیں دفن مقبروں میں

اب کس پہ ہو اعتماد کس کو؟
شامل ہوئے دوست مخبروں میں

جھیلیں ہوئیں خشک تو عجب کیا؟
قحط آب ہے جب سمندروں میں

فردا کے عتاب سے ڈریں وہ
یہ عہد ہے جن کی ٹھوکروں میں

مایوس سی ہو گئی ہیں آنکھیں
کچھ بھی تو نہیں ہے منظروں میں

سچ کہنے کی کر گیا ہوں جرأت
گردانا گیا ہوں خود سروں میں

آئے گا وہ انقلاب اب کے
اصنام ڈھلیں گے پتھروں میں

ڈر جائیں نہ اپنی صورتوں سے
رکھتے نہیں آئینہ، گھروں میں

شاہد اصلی

کوئی سایہ ہے نہ چہرہ کوئی
روز کھلتا ہے دریچہ کوئی

بھولتا ہی نہیں منظر کیا تھا
کاش کل رات نہ ملتا کوئی

اور بھی گہری ہوئی تیرہ شبی
اے خدا چاند کا ٹکڑا کوئی

یوں پلٹتا ہوں میں گھر کو جیسے
شام کو آئے پرندہ کوئی

ساتھ پھر ہو گیا بچوں کا جلوس
گھر سے نکلا تھا اکیلا کوئی

شام پھر آ گئی گھر میں شاہد
آج پھر گھر نہیں آیا کوئی

ریاض خوارزمی

شعلۂ عشق کے قابل بھی کوئی دل ہوتا
اک سمندر تھا کوئی اس کا بھی ساحل ہوتا

اک زلیخا تو نہ تھی کتنی زلیخائیں تھیں
حسنِ یوسفؑ کے سوا کون مقابل ہوتا

پھول ہیں سبزہ ہے گلشن میں نہیں آ بلبل
ہوتا آباد چمن شور عنادل ہوتا

کیسا ویرانی کا عالم ہے ہے کیا آبادی
کچھ جو ہوتا تو پھر اندیشۂ حاصل ہوتا

تابِ نظارہ نہیں یار سے کیسے شکوے
آنکھ ہوتی تو فلک پر مہِ کامل ہوتا

بات بن جاتی جو احسانِ عنایت لیتے
خود تری راہ کا ہر وسوسہ باطل ہوتا

میں اگر جاں رہِ تسلیم و وفا میں دیتا
اس قدر تو نہ پریشاں مرا قاتل ہوتا

وہ مری پیشکشِ شوق کو کیوں ٹھکراتے
دل خلوص اور محبت سے جو مائل ہوتا

اے ریاض ہم جو سمجھتے کبھی انداز کرم
ہے جو موجوں کا تلاطم وہی ساحل ہوتا

طالب قریشی

کٹے نہیں جو عیوب، آئے وہ سر ہمارے
مخالفت بھی اُبھارتی ہے ہُنر ہمارے

سَروں پہ تانی ہوئی ہے شب کی اُداس چادر
ہمارے کشکولِ ذات میں ہیں مفر ہمارے

سجے ہیں نیندوں کی لہر پہ خواب کے مناظر
بشارتوں کی حدوں میں آئے سفر ہمارے

نہ کھینچ راہوں میں مصلحت کی فصیل کوئی
بکھر گئے ہیں ہوا سے پھر بال و پَر ہمارے

ابھی تو آنکھوں میں نشہ باقی ہے قربتوں کا
بہت سے احباب ہیں ابھی معتبر ہمارے

جُدا نہ بیٹے کو آ کے کر دے کوئی سُہاگن
ابھی سے آنکھوں کی پتلیوں میں ہیں ڈر ہمارے

بہارِ خواہش بھی اب کے صحرا بدوش آئی
شجر سے طالبؔ اُتر گئے ہیں ثمر ہمارے

علی اصغر ثمر

پتھر جو مل گیا تو اثر یہ دعا کا تھا
یا اس میں دخل کچھ مری آہِ رسا کا تھا

گردانی جائے کیوں یہ خطا آدمی کی جب
آبادیٔ جہاں کا ارادہ خدا کا تھا

گزرا جو آج پاس سے نظریں چُرا کے وہ
چہرے پہ اس کے رنگ وہی آشنا کا تھا

مسرور تھا جو ذہن تو مخمور قلب و جان
تیرا خیال تھا کہ وہ جھونکا صبا کا تھا

میں آج اس کے سامنے کچھ بھی نہ کہہ سکا
لیکن سکوت میں بھی اک عالم صدا کا تھا

طوفانِ غم کو کس نے ثمرؔ اس طرح سہا
لیکن یہ حوصلہ بھی مری ہی وفا کا تھا

حسن عباس رضا

وقت سے پہلے مرجانے کی خواہش میں
ریت بدن سے آتے تھے ہم بارش میں
یوں لگتا ہے اک دن دھر لیے جائیں گے — زندگیاں کرنے کی گھناؤنی سازش میں
کبھی تمنا تتلی ہاتھ نہیں آئی — بھول سی عمر فگار ہوئی اس کوشش میں
شہزادی سے وصل بھلا کب ممکن ہے! — لیکن حرج بھی کوئی نہیں اِس خواہش میں
جتنی دعائیں ازبر تھیں، سب بھول گئے
جب سے لیکھ ستارہ آیا گردش میں

دے ہاتھ میں سوہنا ہاتھ، کہ سجری سیج سجے
پھر چھیڑ ملن کی بات، کہ سجری سیج سجے
مرے داتا! ہجر کی گھڑیاں ہم پر قہر ہوئیں — اب مہر کی ہو برسات، کہ سجری سیج سجے
مجھے یاد ہے اُس نے آخری خط میں یہ پوچھا تھا — کب آئے گی وصل کی رات، کہ سجری سیج سجے
مرا کاسۂ لب برسوں سے خالی ہے، اس میں — کچھ صدقہ، کچھ خیرات، کہ سجری سیج سجے
اک خواہش نیم کھلے دروازے میں جاگی — کوئی دم توڑ کے بارات، کہ سجری سیج سجے
شہزادی مانگ دعا اُس رنگلے موسم کی
ہم جس میں کھیلیں اک ساتھ، کہ سجری سیج سجے

احمد رئیس

کبھی جب دھوپ سے جلتے ہوئے لمحے لگے ہم کو
تری دیوار کے سائے بہت اچھے لگے ہم کو

سکوں کے ساحلوں پر بیٹھ کر جب بھی کبھی سوچا
تو کتنے اجنبی منظر بہت پیارے لگے ہم کو

کبھی ہر موڑ پر خوشبو کے پیکر ساتھ ساتھ آئے
کبھی گھر کے در و دیوار بھی جلتے لگے ہم کو

جو میرے ساتھ پہروں گھومتے پھرتے تھے سڑکوں پر
وہی مانوس چہرے، اجنبی چہرے لگے ہم کو

تمہارا نام ہم کو اب بھی اپنا نام لگتا ہے
تمہارے پیار کے قصّے سدا اپنے لگے ہم کو

سمندر جیسی آنکھوں میں چھپا رکھا ہے کیا تو نے
کہ تجھ کو دیکھنے والے ترے جیسے لگے ہم کو

کبھی یوں بھی ہوا ہر موڑ پر آواز دی اُس نے
کبھی باتیں اُسی کی، دور کے قصّے لگے ہم کو

تیری خوشبو کے سایوں میں کبھی جی کو ڈوبتے دیکھا
تیرے آنگن کی بیلوں میں یہ دل اُلجھے لگے ہم کو

ثاقب حزیں

اِس جہانِ دل کو پھر زیر و زبر دیکھے گا کون
اِس نظر کے پیچ و خم میں وُہ خبر دیکھے گا کون
ایک دو پل کا مسافر ہے بس اَب جانے کو ہے
ہچکیاں ہیں آخرِ شب کی سحر دیکھے گا کون
جانے کس کس راہ سے جائے گی یہ اَور کس طرف
اوٹ میں اُن بند پلکوں کے نظر دیکھے گا کون
تم کو روشن اَور چمکیلی نگاہوں کی طلب
میری پلکوں پر جمی گردِ سفر دیکھے گا کون
ایک ویرانہ شکستہ عہد کی تکمیل کا
اپنے ماضی کو کوئی بارِ دگر دیکھے گا کون
مر گئے تو اُن کے جلوؤں کی پذیرائی کہاں !!
اے حزیں تحت الثریٰ سے بام و در دیکھے گا کون
سلسلے پھر سے تصوّف کے کرے تازہ کوئی
ایک ذرے میں نہاں یہ بحر و بر دیکھے گا کون
کس نے آزادی کی خاطر ٹھوکریں کھائیں حزیں
ظلمتیں کس نے سہی ہیں اور سحر دیکھے گا کون

بشارت علی سید

ر وہ دل کا درد پرانا آج مجھے تڑپائے ہے
بری یاد اور تیرا سپنا پہروں خون رلائے ہے

یرا الہڑ تار نگ نہ دیکھو میرے دل کی بات نہ پوچھو
ہندا دیکھو چوری چوری اسکے گھر کو جائے ہے

پیار کا یہ انداز نہ سمجھا، پیار کا یہ انداز عجب ہے
ر ہے میرے دل کی دھڑکن وہ مجھ سے شرمائے ہے

یا کیا گزری، کیا کیا بیتی اس انجان دوانے پر
جس کی باتیں دل کو توڑیں وہ ہی دل بہلائے ہے

رہتا ہوں میں خون کے آنسو دل میں ہوک سی اٹھتی ہے
جب تیرے وعدوں کا منظر آنکھوں میں لہرائے ہے

احمد شریف

گیت

رَین سماں جب ڈھلتا ہے
سورج جوت اُگلتا ہے

رات میں رستہ پانا ہے
منزل کو اپنانا ہے
دور دیا اِک جلتا ہے
سورج جوت اُگلتا ہے

تھاہ سے موتی ملتے ہیں
پھول خزاں میں کھلتے ہیں
موسم رُوپ بدلتا ہے
سورج جوت اُگلتا ہے

موسمی رُت جب آتی ہے
ماٹی پھول اُگاتی ہے
دھوپ سے روپ نکلتا ہے
سورج جوت اُگلتا ہے

پیرا کرم

یوں تو چمکا تھا سرِ مژگاں ستارا شام کا
کس نے دیکھا، کون سمجھا یہ اشارا شام کا

دل ہے جیسے دور ویرانے میں اک مدھم دیا
زندگی اپنی ہے گویا استعارا شام کا

رُک گیا تھا ڈوبتے لمحوں کا جیسے آبشار
بہتے بہتے تھم گیا تھا جیسے دھارا شام کا

تھک کے بیٹھا تھا مسافر سرمئی دہلیز پہ
اس توقع پر ملے شاید سہارا شام کا

منہ چھپا کر ملگجی چادر میں اوجھل ہو گیا
اپنے ہاتھوں جس نے خود چہرہ سنوارا شام کا

وقت کی گہری اُداسی کھینچ لی تصویر میں
کتنا سچا روپ آنکھوں میں اتارا شام کا

کاروبارِ سیم و زر میں زندگی مصروف تھی
کون کرتا اس اندھیرے میں نظارا شام کا

ساحلوں پر ڈھونڈتی پھرتی تھی اکرم زندگی
تھا یہیں کچھ دیر پہلے وہ دلارا شام کا

سُرور انبالوی

تلاشِ نکہتِ گُل میں چلا تو میں بھی ہوں
کہ دوشِ وقت پہ مثلِ صبا تو میں بھی ہوں

اُٹھا کے بزم سے مجھ کو وہ خود بھی رویا ہے
مژہ پہ اُس کی ابھی تک سجا تو میں بھی ہوں

مہ و نجوم سے مجھ کو بھی کچھ تو نسبت ہے
بلندیوں سے فلک کی گرا تو میں بھی ہوں

تمہاری بزم سجانے کی آرزو لیکر!!
چراغِ شام کی لَو میں ڈھلا تو میں بھی ہوں

بگڑ نہیں جو وہ مجھ سے کھچا کھچا سا ہے !
خود اپنی ذات سے اب تک خفا تو میں بھی ہوں

مہ و نجوم اگر آپ کے جلو میں ہیں
پلک پلک پہ کسی کی سجا تو میں بھی ہوں

دھنک کا رنگ ہے یا گُل کا وہ تبسّم ہے
سُرورؔ پہروں اُسے سوچتا تو میں بھی ہوں

میرا آدرش میری زمیں میں مسلسل سفر میں رہا

اجنتا کے غاروں سے آزاد ہو کر
گیا کی زمینوں میں برگد کے نیچے میں عرفان کی منزلوں سے گزرتا رہا
آسمانوں سے مجھ پہ کرم اور عنایات
کی بارشوں کے سبھی سائیاں
بجلیاں لیکن اطراف میں گر کے میری زمیں چاٹتی ہی رہیں
جنگلوں کے سہرے چُپ اندھیروں نے
مجھ کو اماں بخش دی
مجھ پہ پیڑوں سے گرتے رہے پھول، پھل
میں سنورتا رہا
اپنے آدرش کے معبدوں کے لئے میں نے چھوڑی زمیں
اس کی آسائشوں ریشمی راحتوں سے کنارہ کیا
بستیوں بستیوں اور سنہرے کلس والے شہروں میں
پیغام میرا گیا
لوگ بنتے رہے ظلم و آلام کی چکیوں میں ازل سے
جو پستے تھے ویسے ہی پستے رہے
میرا آدرش میری زمیں میں مسلسل سفر میں رہا
وادیِ سندھ سے برِ اعظم چین کے پھیلے ہوئے ساحلوں تک
میرے نقشِ پا ہر طرف نیلے آکاش کو
چھونے والے ہمالہ سے پاتال میں پھیلتی وادیوں سے
اترتے ہوئے سبز گہرے سمندر کو چھوتے رہے
مجھ پہ یلغارِ آلام ہوتی رہی
میرا آدرش میری زمیں میں مسلسل سفر میں رہا
میرے کتبے چٹانوں پہ کندہ ہوئے
آسمانوں سے بادل برستے رہے
جتنے سورج بھی مشرق سے نکلے نئی زندگی مجھ کو دیتے رہے
مغربی سمت سے آندھیاں اٹھ کے مشرق کو
نزدیک تر مجھ سے کرتی گئیں
میری جھیلوں میں چاہت کے انمٹ کنول یونہی کھلتے
میرا آدرش میری زمیں میں مسلسل سفر میں رہا
وقت کا تیز دھارا زمانوں کی تاریخ کو اپنے ہمراہ
نہ جانے کہاں کھو گیا
ٹیکسلا اور ہڑپہ گئے وقت کے میوزم بن گئے
ڈھیر مٹی کے موہن جو داڑو بنے
قرن ہا قرن سے میرے کتبے چٹانوں پہ میری گواہی کو موجود
پتھروں سے مٹے، درسگاہوں میں تاریخ کے طالب علموں
کی بحثوں کا محور بنے
میرا آدرش میری زمیں میں مسلسل سفر میں رہا

حسن سوز

اگرچہ گھر مرا ویران کر گیا وہ شخص
دل و نگاہ کو یادوں سے بھر گیا وہ شخص

غروبِ مہر سے پہلے جو گھر گیا وہ شخص
اُٹھا یہ شور کہ بے موت مر گیا وہ شخص

دکھا کے ترکِ تعلق کا راستہ مجھ کو
بہت سی مشکلیں آسان کر گیا وہ شخص

وہ بات جس کی توقع بھی مجھ سے رکھتا تھا
سُنی تو رُوٹھ بھی اس بات پر گیا وہ شخص

بھروسہ اب کسی دریا کا اور نہ پربت کا
کہ آج ریت کی صورت بکھر گیا وہ شخص

بصد بہار پریشانیوں میں زندہ تھا
ملا سکوں تو چپ چاپ مر گیا وہ شخص

تمام حسنِ محبت میں فاصلوں کا تھا
قریب آیا تو دل سے اُتر گیا وہ شخص

مخدوم منور

اِک خواب کا سفر تھا کہ جاں کا عذاب تھا
وہ زندگی کا حسنِ جہاں بے حساب تھا

جب رشتۂ شجر سے علیحدہ ہوا تھا میں
دھرتی پہ اُبھرتا ہوا اک انقلاب تھا

میں شاملِ گناہ تھا لیکن مرا وجود
اس اعتبارِ دہر میں دائم سراب تھا

میں آئینہ صفت لئے امکاں کی جستجو
لوحِ جہاں پہ لکھی ہوئی اِک کتاب تھا

مخدوم اس طرح تو نہ چاہا تھا پر وہ شخص
دیکھا شبِ وصال تو پھر بے حجاب تھا

حسین بانو

امر

گیلی نرم ریت میں
ہم دونوں کے چلنے سے
جو ریت ہٹی
اس ریت میں سجناں
برسوں گزرے
ہم اور تم مل جائیں گے
اور امر ہو جائیں گے

پریت

سندر ناری
پریت نہ کرنا
لوگ یہاں کے جھوٹے ہیں
وعدہ کر کے ، ناتا کر کے
نئی رتوں میں کھو جاتے ہیں

ہرجائی

ٹھنڈے جذبے بیکل راتیں
نیند میں ڈوبے میرے سپنے
بھیگے ہونٹ یہ تیرے میرے
ڈوب چکے پاتال میں جذبے
سجناں دل کی بات کہو نا ـــــ!
کیا ہم دونوں ہرجائی ہیں ؟

پرائے

میرے حسن کی گرمی سے اس کا جسم یوں پگھلے ہے
برکھا قرب کی شدت کی اس کے دل میں اترے ہے
جیسے چاند چڑھے تو خود کو دیکھ نہ پائے
لیکن ساری دنیا دیکھے ہے
روپ سنگھار کروں میں سجناں
ہونٹ میرے مسکائے ہیں
پر تیم بن میں جی نہ پاؤں
سنا ہے اب وہ پرائے ہیں

معتمد صدیقی رضی

دستار کو اب اس سے بچانا محال ہے
اے کجکلاہ یہ وہی دستِ سوال ہے

لوٹا نہیں ہے فیصلہ دے کر مرے خلاف
سنتے ہیں محتسب بھی مرا ہم خیال ہے

دریا کو ہم عبور تو کر آئے ہیں مگر
صحرا میں ڈوبنے کا بڑا احتمال ہے

وہ تجھ سے رابطے کے نشیب و فراز تھے
اور اب تو زندگی میں بڑا اعتدال ہے

ہر ذائقہ دہن میں سُلگ کر دھواں ہوا
شعلہ سا ہے زباں پہ کہ حرفِ سوال ہے

جان کاشمیری

جہدِ پیہم کے سدا خبط کو سر میں رکھنا
پاؤں تھک جائیں تو سوچوں کو سفر میں رکھنا

رفتہ رفتہ یہی بن جاتا ہے گھر کا مالک
کارِ دشوار ہے مہمان کو گھر میں رکھنا

جان لیوا ہے جو شاخوں پہ مسلط ہے سکوت
حوصلہ خار کا پھولوں کے نگر میں رکھنا

بجھتے بجھتے جو سنا جائے کہانی شب کی
ایسا انجم کوئی آغوشِ سحر میں رکھنا

میں خطا کار خطا ہے مری پہچان مگر
وصفِ انساں ہے فرشتوں کو نظر میں رکھنا

عزمِ منزل نہ کہیں بوجھ تلے دب جائے
زادِ رہ حسبِ ضرورت ہی سفر میں رکھنا

پکنے سے پہلے ثمر کوئی زمیں بوس نہ ہو
ایسا بھی جوشِ نمو تخمِ شجر میں رکھنا

فرحت شہزاد (امریکہ)

دل اپنا گر نہیں۔ نہ سہی پر جگر تو ہو۔
آخر شبِ فراق میں اتنا اثر تو ہو!!!

یہ کیا کہ میں ہی تیرے لئے در بدر پھروں
اِک دن میری گلی سے بھی تیرا گزر تو ہو

منزل کی کس کو فکر ہے اے خضرِ کم نظر
پر اِس سفر میں کوئی میرا ہمسفر تو ہو

ناصح۔ میں ہنس بھی لوں گا تری بات مان کر
لیکن شبِ فراق ذرا مختصر تو ہو

شہزاد شوقِ سجدہ سہی بام پر مگر
جس در پہ خود بخود جھکے سر ایسا در تو ہو

بلبل کاشمیری (لندن)

کام میں ناکام جب ہوتے ہیں بے تدبیر لوگ
پھر عبث لاتے ہیں لب پر شکوۂ تقدیر لوگ

قیس پیمائش پہ ہے اور کوہکن مزدور ہے
کیا کوئی "الفت محل" کرنے لگے تعمیر لوگ؟

دور جانا ہے ابھی سونے دو سارا دن اِنہیں
یہ تھکے ماندے ستارے۔ رات کے رہگیر لوگ!

اصل سے یہ نقل کتنی پُر فسوں ثابت ہوئی
دیکھ کر تصویر تیری بن گئے تصویر لوگ

دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی آتا ہے نظر
دیکھتے اے کاش اپنی آنکھ کا شہتیر لوگ!

محفلِ عشرت میں بُلبُل یہ اچانک کیا ہوا
شمع گریاں۔ گل پریشاں۔ سرگراں دلگیر لوگ

قطعات

نسیم نازش

ایک طرف سے اندھے ہوتے ہیں
یہ کیسے آئینے ہوتے ہیں

تنہائی کا خوف تھکاتا ہے
یا پھر بوجھل رستے ہوتے ہیں

عمر مسلسل کٹتی رہتی ہے
زیست کے قاتل لمحے ہوتے ہیں

بن ان کے ہر آنگن سونا ہے
گھر کی رونق بچے ہوتے ہیں

جن میں جدائی ربط بڑھاتی ہے
ایسے بھی کچھ رشتے ہوتے ہیں

باہر سے تو ہنستے ہیں نازش
اندر لوگ سسکتے ہوتے ہیں

اسحاق آشفتہ

فعل ہو جس کا صدق سے خالی
قول پہ یوں وہ لڑکھڑاتا ہے
جیسے کوئی نحیف سا بوڑھا
ہلتے دانتوں سے پان کھاتا ہے

اپنے فن کی جو شاعر کم ہیں
خود ہی تعظیم کرتا رہتا ہے
سو کے اعداد کو وہ گر بیٹھے
سو پہ تقسیم کرتا رہتا ہے

نہ نگاہیں چرا کے پھرتا تو
نہ یہ ہاتھوں پہ دل لیا ہوتا
کہیں بہتر تھا عشق سے پہلے
کسی شانہ سے مل لیا ہوتا

عبدالعلی شوکت

سائے سائے چلتے رہنا دھوپ سے بچنا عام تو ہے
دیکھنا سب کچھ اور چپ رہنا نیکی کا اک کام تو ہے

نوک پلک لفظوں کی سنواروں اونچا سوچوں اونچا دیکھوں
کمینہ لوگوں پر پھر بھی کہہ دوں مجھ پر یہ الزام تو ہے

پیر فقیر منجم ڈھونڈوں جادو ٹونا بھی کر دیکھوں
دل من مانی کرتا جائے عقل کہے اوہام تو ہے

چاند ستاروں سے خوشبوؤں کی کرنیں مانگ کے میں لاؤں
ہر گھر میں ہو شمع فروزاں خواہش خوش انجام تو ہے

شدتِ جذبہ علم و تفکر، گہرائی اور گیرائی
کیف و تشنج مثلِ پیمبر سخنوری الہام تو ہے

حیران ہے انسان زمانے کے دو پاٹوں میں پھنس کر
صبح شفق آلود اگر ہے شام بھی خوں آشام تو ہے

شوکت پست و بلند سبھی سے ملتا ہے دکھ بانٹتا ہے
گرچہ وہ بدنام بہت ہے لیکن اونچا نام تو ہے

حفیظ رضوانی

اپنی جبیں سے سجدے اتارے چلے گئے
نقشِ قدم کو تیرے ابھارے چلے گئے

وہ دل، یہ ولولے نہ تمنا نہ حوصلے
جیتے تھے جن پہ ہم وہ سہارے چلے گئے

موجوں نے کر دیا تھا کناروں کو آس پاس
کشتی سے دور آپ کنارے چلے گئے

تھی کس بلا کی راہِ تمنا میں بےخودی
تم سامنے تھے پھر بھی پکارے چلے گئے

ہر منظرِ جہاں پہ نگاہیں جمائے ہم
تصویر تیری دل میں اتارے چلے گئے

حفیظ ہم ایسے صبر و قناعت کے لوگ ہیں
جیسے بھی گزری عمر گزارے چلے گئے

عابد ودود

[...]کر خیال تو اپنا کسی کو دیوانے
[...] اپنے دور میں ہیں دوستی کے پیمانے

[...]ے خلوص سے جن کو رفیقِ غم سمجھا
[...]ہی نے بخش دیئے ہیں یہ دل کے ویرانے

[...]ہاں تو ہر کوئی دولت کی آنچ میں پگھلا
[...]ھی کو چھین لیا میرے شوقِ بے جانے

[...]زاں کے عہد میں غنچے تلاش کرتا ہوں
[...]یری نظر سے کوئی رنگِ گل تو پہچانے

[...]د کو آہنی میزاں میں تولنے والو
[...]یارِ عشق میں ہوتے نہیں ہیں فرزانے

[...]ہ اپنی طرح کا انسان ڈھونڈنے والا
[...]ہ میرے شہر کا عابدؔ کدھر گیا جانے

موج فرازی

زندگی تھی چار دن کی جس طرح آئی گئی
اے مسیحا مفت میں تیری مسیحائی گئی

اُن چراغوں نے کیا گم کردۂ منزل مجھے
جن چراغوں میں ترے چہرے کی لو پائی گئی

بے نیازی سے لگاوٹ سے ادا سے شرم سے
کس طرح ہر آنکھ میں وہ چشمِ ہرجائی گئی

بوالہوس کہہ لو مگر پہنچے لب و رخسار تک
اصل میں دانا وہی تھے جن کی دانائی گئی

رازداں اپنا بنایا یہ ستم بھی خوب ہے
کارفرمائی کسی کی ہم سے فرمائی گئی

شہر میں ہر شخص کو پاتا ہوں اپنا ہی رقیب
وہ گلی تو شہر بھر کی رہگذر پائی گئی

نیر جہاں

بے بسی

ایک موہوم سی اُمید ہے شاید اک دن
اشک بہہ بہہ کے مٹا دیں گے سبھی پچھلے غم
دل سے گم گشتہ محبت کے نشاں دھونے کو
ہر نئے شہر میں جاتے ہیں بڑے شوق سے ہم

کوچے بازار نظر آتے ہیں روشن روشن
جیسے دنیا کی نہیں ہوا نہیں کوئی الجھن
صاف شبنم سے نہائے ہوئے پیڑوں کے تلے
ہنستے چہرے غم و آلام سے آزاد لگے
شاہراہوں پہ کھڑی حسن میں ڈوبی اپنے
ہر عمارت نے بسا رکھے ہوں جیسے سپنے

ہم بھی چہرے پہ سجاتے ہیں تبسم کے دیئے
سوچتے ہیں تری یادوں کے بھنور سے نکلے
دل یہ ناداں کہیں ایسے بہل سکتا ہے
دیکھتے دیکھتے منظر یہ بدل سکتا ہے
عہد رفتہ کی گھٹا دل پہ مرے چھاتی ہے
ایسے ماحول میں پھر یاد تری آتی ہے

کوچے بازار نظر آتے ہیں سوئے سوئے
بھول سے جیسے اِدھر آ گئے کھوئے کھوئے
سرنگوں غمزدہ خاموش سے پیڑوں کے تلے
غم و آلام میں لپٹے ہوئے مُردہ چہرے
شاہراہوں پہ کھڑی سوچ میں ڈوبی ڈوبی
ہر عمارت ہے کہ بیوہ کوئی روئی روئی

میرے ہونٹوں پہ ہنسی خشک ہوئی جاتی ہے
دل پہ اک چوٹ سی ہے ہر دم کہ لگی جاتی ہے
تو بتا دے میں کدھر جاؤں کہ بھولوں تجھ کو
ہر نئی راہ تری راہ بنی جاتی ہے

جاوید اقبال ستار

زخم کھا کر جو مسکرا نہ سکوں
راز تیرا کوئی چھپا نہ سکوں

اس لئے میں نے کاٹ لی ہے زباں
کوئی شکوہ زباں پہ لا نہ سکوں

اس قدر تُو قریب ہے دل کے
زخم اپنے تجھے دکھا نہ سکوں

بند آنکھوں جو میں نے دیکھا ہے
کھول کر میں اسے بتا نہ سکوں

تم عنایت تو کر رہے ہو مگر
یہ نہ ہو سر بھی میں اٹھا نہ سکوں

عزیز اعجاز

آدابِ وفا

اس نے
اپنے کومل جسم کی خوشبو
مجھ کو سونپتے وقت
کہا تھا
مری ظرف سے
اسے دوامی تحفہ سمجھو
وہ دن ہے اور آج کا دن ہے
میں اُس کے اس تحفے کو
سانسوں میں بسائے پھرتا ہوں

"دیوار سے دیوار تک"

اندھی سوچوں کے
صحرا میں جانے کب سے
بھٹک رہا ہوں
ہاتھوں کو جو راہ سجھائی دیتی ہے
اس کی منزل کوئی نہیں
اندھی سوچوں کے صحرا کی
سائیں سائیں کرتی
پہنائی کے سوا

ڈرامہ

میرزا ادیب

خواب اور تعبیر خواب

(ایک تمثیل ۔ ریڈیائی تکنیک میں)

کردار

یعقوب ——
بیگم یعقوب ——
ارشد —— یعقوب کا ایک پرانا دوست
رضوی صاحب —— ہمسایہ
بیگم رضوی —— رضوی صاحب کی بیگم
مفتی صاحب —— ہمسایہ
بیگم مفتی —— مفتی صاحب کی بیگم
رضیہ —— یعقوب کی بچی
محمود —— رضیہ کا بھائی

اور

فیروز —— ڈرائیور

(افتتاحی موسیقی کے بعد کسی قدر دور سے سائیکل کی گھنٹی کی
آواز آنے لگتی ہے۔ جو بتدریج بلند ہوتی جاتی ہے۔ یکایک
سائیکل سوار کے گرنے کا صوتی تاثر۔ اور اس کے ساتھ ہی بیگم یعقوب
کے بھاگنے کا شور)

بیگم: ہائے اللہ میں مر جاؤں۔ زیادہ چوٹ تو نہیں لگی۔؟

یعقوب: نہیں۔

بیگم: کیوں نہیں لگی۔ ضرور لگی ہے۔ کئی بار کہہ چکی ہوں کہ اب اس مصیبت کو دفع دور کر دیں۔ انجر پنجر ڈھیلا
ہے اس کا۔ نہیں سنتے آپ، آج گر پڑے ہیں۔

یعقوب: بیگم! ذرا ہاتھ پکڑو۔ اُف۔

بیگم: نہیں چلا جاتا تو بلاؤں کسی کو، سہارا دے کر اندر لے جائے۔

یعقوب: نہیں کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گھٹنے پر چوٹ لگی ہے۔ ٹھہرو اپنے پاؤں پر چلتا ہوں۔

بیگم: میں پوچھتی ہوں، کیوں نہیں پیچھا چھوڑتے اس کا؟ حد ہو گئی ہے۔

یعقوب: بڑا ساتھ دیا ہے اس نے، کم از کم دس برس تو ابا جان نے چلائی ہوگی۔ دادا جان نے بھی چند برس چلائی

بیگم: اور خدا خیر کرے پندرہ برس سے آپ چلا رہے ہیں۔

یعقوب: بیگم میں تو اس کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا۔ مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہیں ہے کیا کیا جائے۔ معاملہ

بیگم: یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ سائیکل کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اور نوکری کا معاملہ ہے۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکی۔ سائیکل
کا نوکری سے کیا تعلق؟

یعقوب: اندر چلو، بتاتا ہوں۔

بیگم: پلنگ پر لیٹ جائیے۔

یعقوب: معمولی سی چوٹ آئی ہے، لیٹ گیا تو یہ معمولی چوٹ شاید غیر معمولی ہو جائے۔ کرسی پر بیٹھوں گا۔

بیگم: (آواز دیکر) رضیہ بیٹی! چولہے پر چائے کا پانی رکھ دو۔

یعقوب: نہیں بیگم! رہنے دو۔

بیگم: روز دفتر سے آتے ہی چائے پیتے ہیں، آج کیا ہے۔ لگتا ہے کچھ پریشانی ہے۔

یعقوب: سچ پوچھو اس پریشانی ہی کے خیال میں گر پڑا تھا۔ سوچتا ہوا آرہا تھا، راستے کی اینٹ نہ دیکھ سکا۔

بیگم: پریشانی۔ کیسی پریشانی۔ نوکری کا معاملہ تو ٹھیک ہے نا۔ اس کو تو کچھ نہیں ہوا نا ؟

یعقوب: نوکری کی صحت ٹھیک ہے۔ چشم بد دور اسے ابھی کچھ نہیں ہوا۔ البتہ ایک فرق ہے یا پڑ نے کا امکان ہے۔ اب شاید دفتر جاتے آتے وقت میں سائیکل میرا ساتھ نہ دے سکے گی۔ بھئی گھبراؤ نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہوئی پہلے دفتر سمن آباد میں تھا، سائیکل سے کام نکل جاتا تھا، پندرہ بیس منٹ جانے میں، پندرہ بیس منٹ آنے میں، اب دفتر گلبرگ چلا جائے گا، آنے جانے میں بہت وقت لگے گا۔ دقت الگ ہوگی۔ اور تم جانو مشقت اٹھانے کی اب عمر نہیں ہے۔

بیگم: دفتر والوں سے کہا ہوتا، میں اتنی دور نہیں آ جا سکتا۔

یعقوب: بیگم! کبھی کبھی تم بھی کمال کر دیتی ہو۔ گویا انہیں میری خاطر دفتر واپس سمن آباد میں لے آنا چاہیئے۔ بھئی! انہیں اپنے کاروبار کا خیال کرنا چاہیئے، کاروبار میں کام کرنے والوں کا نہیں۔ اور یہی انہوں نے بھی کیا ہے۔

بیگم: یہ تو ٹھیک ہے۔ پر اب ہوگا کیا۔

یعقوب: اور کچھ ہو نہ ہو، میں اتنی دور سائیکل پر آ جا نہیں سکتا۔ روز کہتی تھیں اب اس کی جان بخشی کیجئے۔ نوکری ہی تو اس کی جان بخشی، اب تو خوش ہو نا۔

بیگم: لیکن اب ہماری جان پہ جو آ بنے گی۔

یعقوب: یہ تو ہوگا ہی۔ کیا کر سکتا ہوں۔

بیگم: کوئی اور ذریعہ۔ میرا مطلب ہے — یعنی کر —

یعقوب: میں تمہارا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ ذریعے تو ہیں بلکہ کئی ہیں۔ خرچ زیادہ ہو تو چیخنا چلانا مت۔

بیگم: مہنگائی کے اس دور میں زیادہ خرچ۔ سوچ لیجئے۔

یعقوب: کافی سوچا ہے بیگم! سارا راستہ یہی تو سوچتا رہا ہوں، اور اسی سوچ کا نتیجہ بھی تم نے دیکھ لیا ہے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ گھر کے قریب حادثہ ہوا۔ سڑک پہ ہو جاتا تو اس وقت ہسپتال میں ہوتا۔

بیگم: خدا کے لیے منحوس باتیں مت کیجئے۔

یعقوب: بیگم صاحبہ۔

بیگم: کہیئے جناب۔

یعقوب: معلوم ہے کتنی عمر ہو چکی ہے میری ؟

بیگم: آپ کی عمر — جب ہماری شادی ہوئی تھی تو سنا ہے آپ اکتیس برس کے تھے۔

یعقوب: غلط بالکل غلط

بیگم: "معاف کیجئے ایسی بات ہم عورتوں کو زیب دیتی ہے۔ مردوں کو نہیں۔ چلئے آپ تیرہ۔ وہ کیا مصرع ہے۔ "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن" (ہنسی پڑتی ہے)

یعقوب: تم نے تو میری عمر کے ہندسے کو الٹا کر رکھ دیا ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ اب میری عمر ساٹھ برس کی ہوئی۔

بیگم: ٹھیک ہے۔

یعقوب: بیگم! ساری عمر سائیکل چلاتے چلاتے تھک گیا ہوں۔ اب جی چاہتا ہے کہ کچھ آرام ملے۔ اور شاید تم بھی یہی

بیگم: اس کا علاج یہ تو نہیں ہے کہ گھر میں بیٹھ جائیں۔ بس میں جائیں۔ منی بس میں جائیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ سائیکل پہ ہی؟ یہ کوئی علاج نہیں ہے۔

یعقوب: شاید درست کہا ہے تم نے۔

بیگم: یہ شاید شاید کیا لگا رکھی ہے آپ نے۔ کوئی اور علاج نہیں ہے۔

یعقوب: بے گھر میں بیٹھنے کی بجائے اس چیز میں بیٹھیں جس میں بیٹھ کر جہاں جی چاہے پہنچ جائیں۔ اور وہ بھی فٹافٹ۔

بیگم: فٹافٹ؟

یعقوب: بالکل۔

بیگم: وہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟

یعقوب: یہ بھی کوئی معمّا ہے بیگم؟

بیگم: خواب تو آپ نے بڑا شاندار دیکھا ہے۔

یعقوب: خواب تو شاندار ہے ہی۔ تعبیر بھی شاندار ہو جب مزہ ہے، بیگم وہ کیا کہا ہے کسی نے۔ بہرحال خوب ہے۔ زندگی۔ اے زندگی، تیرا کام ہے خواب دیکھنا۔ تعبیر خوشگوار ہو یا ناخوشگوار۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے

بیگم: بہت خوب کہا ہے۔ مگر خواب کی تعبیر بھی شاندار ہونی چاہئے۔

(کال بیل)

یعقوب: (بلند آواز سے) کون صاحب؟

ارشد: (باہر سے) میں ہوں ارشد۔

یعقوب: بیگم میرا دل کہتا ہے یہ ارشد خان یونہی نہیں آئے آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ کیا کہا ہے غالب

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

بیگم: کچھ نہ کچھ کیا ہوگا۔ ارشد صاحب پہلے نہیں کبھی آئے؟

یعقوب: لیکن آج ان کا آنا قیامت کا آنا ہے
ارشد رہا ہوسے) یعقوب صاحب! پاؤں میں مہندی لگا رکھی ہے کیا۔
یعقوب: ارے نہیں بھائی نہیں
(وقفہ)
ارشد: السلام علیکم
یعقوب، بیگم: وعلیکم السلام
بیگم: کہئے بھائی جان! کیا حال ہے۔ گھر میں سب خیریت ہے۔
ارشد: گھر میں ہر طرح خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوندکریم سے نیک مطلوب ہوں۔
بیگم: رضیہ! تمہارے بھائی جان آئے ہیں چائے کے ساتھ بھی کچھ لانا سمجھ لیا نا۔
ارشد: یعقوب صاحب! ایک خبر سنی ہے زبانی طیور کی۔
یعقوب: معلوم نہیں طیور نے آپ سے کیا کہا ہوگا۔ میری زبانی سنئے، نوکری سے جواب مل گیا ہے۔
بیگم: کیوں ایسی بری باتیں سناتے ہیں۔ نہیں ارشد بھائی جان ایسی کوئی بات نہیں۔ ہوا فقط یہ ہے کہ ان کا دفتر گلبرگ میں چلا گیا ہے
ارشد: پیدل یا سوار ہو کر۔
بیگم: توبہ۔ آپ مذاق سمجھتے ہیں۔ (ہنسی)
یعقوب: سنئے ارشد صاحب! معاملہ بڑا غور طلب ہے۔ میں قریب قریب بوڑھا ہوگیا ہوں۔ سائیکل چلانا اور دوڑ چلانا میرے بس کا روگ نہیں رہا۔ ظاہر ہے میں بڑے صاحب سے کہہ دوں گا۔ حضور:

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ
بس اب خانہ آباد دولت زیادہ

ارشد: استعفےٰ دے دیں گے یا ریٹائرمنٹ کی درخواست۔
یعقوب: جو کچھ ہوگا آپ دیکھ لیں گے۔
بیگم: نہ جانے ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟
یعقوب: میں ہی جانتا ہوں جو میرے دل پر گزرتی ہے۔
بیگم: بھائی جان! یہ بڑا خوشگوار خواب دیکھ رہے تھے۔
ارشد: کیسا خواب؟
یعقوب: ایک آرزو ہے۔
ارشد: پتا نہیں آپ کا خواب کیا ہے، آرزو کیا ہے۔ مگر اس عمر میں موٹر آپ کی ضرورت ہے، یہ میں جانتا ہوں۔

یہی کہتا ہوں۔

یعقوب: یہی تو وہ خواب اور آرزو ہے۔

ارشد: پوری ہو گئی ہے۔

بیگم: کیا مطلب!

ارشد: یعقوب صاحب کی آرزو پوری ہوگئی ہے۔ یعنی جو خوشگوار خواب آپ کے شوہرِ نامدار نے دیکھا تھا اس کی تہ خوشگوار ہے

بیگم: وہ کس طرح؟

ارشد: وہ اس طرح کہ میں اگلے مہینے یو۔ ایس۔ اے جا رہا ہوں، کم از کم ایک سال کے لئے۔ میری گاڑی بیکار تو رہ نہیں سکتی

بیگم: تو۔؟

ارشد: چند روز کے بعد آپ کے دروازے پر کھڑی ہوگی۔

یعقوب: بیگم! اسے کہتے ہیں شاندار خواب اور شاندار خواب کی شاندار تر تعبیر۔

بیگم: مگر اس کے ہمارے دروازے پر کھڑی ہونے کی شرط کیا ہے؟

ارشد: جو آپ کو منظور ہو۔

بیگم: قیمت تو بہرحال دینی پڑے گی۔

ارشد: بہت آسان قسطوں میں۔

یعقوب: کچھ رقم بڑے صاحب دے دیں گے۔ اُن کا وعدہ ہے میرے ساتھ۔

ارشد: جو بھی مناسب سمجھیں کریں، مجھے کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے۔ گاڑی آپ کی ہے، جب جی چاہے پیچ دیں نہیں ملے گی۔

یعقوب: گویا معاملہ طے ہو گیا؟

ارشد: طے ہو گیا صاحب، طے ہو گیا۔

یعقوب: کیا شان ہوگی۔ دفتر کلرک میں ہوگا۔ جانا گاڑی میں بیٹھ کر۔

ارشد: اور آنا بھی گاڑی میں بیٹھ کر۔

یعقوب: نوکری محفوظ رہی۔ سبحان اللہ۔ بیگم! اب تو چائے وغیرہ وغیرہ۔

بیگم: (آواز دے کر) رضیہ! بڑی سست لڑکی ہے۔ خود جاتی ہوں۔

(موٹر کے ہارن کی آواز بار بار آتی ہے بیگم بھاگتی ہوئی آتی ہے)

: کیا ہوگیا ہے، کیا کانوں کے پردے پھاڑنے کا ارادہ ہے ؟

ب : حد ہوگئی ہے بیگم ! دروازے پر گاڑی کھڑی ہے اور تم نے ادھر آکر دیکھا بھی نہیں ۔

: دیکھ چکی ہوں اور دیکھ بھی رہی ہوں ۔

ب : بیگم ! سب سے پہلے یہ بتاؤ گاڑی کا رنگ کیسا ہے ؟

: اچھا ہے ۔

ب : صرف اچھا ۔ بات بنی نہیں بیگم ، کہو نہایت اچھا ، بہت پیارا ۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ شہر میں بہت کم گاڑیوں کا ایسا رنگ ہوگا ۔ اسے آسمانی رنگ بھی نہیں کہہ سکتے ۔ کچھ عجیب رنگ ہے ۔ یہ بتاؤ بالکل نئی لگتی ہے یا نہیں ؟

: یہ خوبی تو ہے اس میں ۔

ب : یعنی بالکل نئی لگتی ہے ۔

: ہاں ، بھائی جان نے بڑی مہربانی کی ہے ، کون ایسی نئی گاڑی اتنی کم قیمت پر دیتا ہے ۔

ب : رضیہ اور محمود سکول سے نہیں آئے ۔

: وہ آج سکول گئے کہاں ہیں ، اتنی خوشی ہوئی ہے گاڑی آنے کی کہ صبح سکول جانے کے لئے طرح طرح کے بہانے بنانے لگے ۔

ب : ہیں کہاں ۔

: بازار گئے تھے ۔

(رضیہ اور محمود کا شور)

حد : (بیک وقت) گاڑی آگئی ؟

: دیکھ تو رہے ہو ۔

: امی ! دروازہ کھولئے ۔

: ابھی نہیں ، ذرا صاف کر لینے دو ، شام کو سیر کا پروگرام بنائیں گے

: شام کو امی ؟

ب : شام کو چلیں گے ۔ محمود بیٹے ۔

: سارے شہر کی سیر کریں گے ابو ۔

یعقوب: کیوں نہیں۔ ضرور کریں گے۔
محمود: ابو، میں اب اسکول کی بس میں نہیں بیٹھوں گا۔
بیگم: وہ کیوں؟
محمود: اپنی گاڑی جو ہے، بس میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ میں تنگ آگیا ہوں۔
رضیہ: اور ابو میں بھی، اپنی گاڑی میں جایا کروں گی، ہمارے سکول میں صرف ایک لڑکی اپنی گاڑی میں آتی ہے وہ فائزہ ہے نا امی۔ وہ جو لال کوٹھی میں رہتی ہے، وہی آتی ہے۔ ہماری گاڑی دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔
محمود: چھٹی کے روز پکنک ہوگی
یعقوب: ضرور ضرور

(مفتی صاحب آتے ہیں)

مفتی صاحب: سبحان اللہ۔ چشم بددور، بھئی یعقوب، مبارکبادیں۔ ہزاروں، لاکھوں، بے شمار، ان گنت،
یعقوب: شکریہ، مفتی صاحب، بہت بہت شکریہ۔
مفتی صاحب: بہت اچھی گاڑی ہے۔ لال کوٹھی والوں کی بھی گاڑی ہے۔ مگر اس کا تو جواب نہیں۔
یعقوب: ذرہ نوازی ہے مفتی صاحب، آپ جانتے ہیں ساری عمر سائیکل گھسیٹی ہے، بلکہ سائیکل نے مجھے گھسیٹا ہے۔ اب دفتر بہت دور چلا گیا ہے۔ وہاں پہنچنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ چھٹی مل جاتی۔ گاڑی ایک بڑی ضرورت ہے۔
مفتی صاحب: کیوں نہیں، کیوں نہیں؟

(رضوی صاحب آتے ہیں)

مفتی صاحب: آئیے آئیے رضوی صاحب! آگے آئیے رُک کیوں گئے؟
رضوی: مفتی صاحب
مفتی صاحب: ارشاد رضوی صاحب
رضوی صاحب: یہ واقعی یعقوب صاحب کی کار میرے سامنے کھڑی ہے یا میں کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہوں
مفتی صاحب: رضوی صاحب! خواب دیکھنے کا زمانہ لد گیا۔ آپ بہ سلامتیٔ عقل و ہوش یعقوب صاحب کی کار دیکھ رہے ہیں۔
رضوی صاحب: یعقوب صاحب! میری طرف سے اور میرے گھر کے ایک ایک فرد کی طرف سے آپ کو اور آپ کے سارے گھر والوں کو مبارکبادیں۔
یعقوب: شکریہ شکریہ، بہت بہت شکریہ۔

رضوی صاحب: بھابھی جان آپ کو بھی

نیلم: آپ یعقوب صاحب کے سب گھر والوں کو مبارکبادیں دے چکے ہیں۔ گھروالوں میں شاید میں بھی شامل ہوں۔

یعقوب: واہ وا شاید کا ایسا خوبصورت استعمال۔ واہ وا۔؟

(بیگم ہنستی ہے)

رضوی صاحب: واہ۔ وا۔ بھئی بہت اعلیٰ بہت خوبصورت گاڑی ہے۔

یعقوب: اتفاق سے مل گئی ہے۔

رضوی صاحب: اتفاق سے نہیں، حسن اتفاق سے کہیئے۔

مفتی صاحب: بجا فرمایا۔ واقعی یہ حسن اتفاق ہے

رضوی صاحب: آپ یقین کریں گے یعقوب صاحب

یعقوب: کیوں نہیں کروں گا۔ ضرور کروں گا۔

رضوی صاحب: مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی ہے۔ جتنی آپ کو ہوئی ہے۔ سچ کہتا ہوں۔

مفتی صاحب: ہم سب کو خوشی ہوئی ہے۔ ادھر میری بیگم بھی صبح کہہ رہی تھی میں بھائی جان یعقوب کے گھر جاکر باجی کو مبارک باد دوں گی۔ بہت خوشی ہوئی ہے صاحب۔

مفتی صاحب: یہی حال میری بیگم کا بھی ہے۔

رضوی صاحب: اپنے عزیز دوست اور پرانے ہمسائے کی خوشی میں شریک ہونا تو گویا فرض ہے اور ہم جو بہت خوش ہیں تو اپنا فریضہ ادا کر رہے ہیں

مفتی صاحب: بجا فرمایا۔ بالکل بجا فرمایا۔ یہ ہماری مشترکہ خوشی ہے۔

(رضیہ آتی ہے)

رضیہ:۔ امی

نیلم: جی بیٹی

رضیہ: خالہ جان آئی ہیں۔

مفتی صاحب: میری بیگم آگئیں؟ کہہ تو رہی تھیں۔

رضیہ: نہیں خالو رضوی کی۔

مفتی صاحب: اچھا ان کی بیگم آئی ہیں۔ وہ بھی آرہی ہوں گی۔

نیلم: آئیے اندر چلیں۔

مفتی صاحب: بسم اللہ

رضوی صاحب: (سرگوشی کے سے انداز میں) مفتی صاحب دیکھ رہے ہیں آپ۔

مفتی صاحب: رضوی صاحب! آنکھیں جو دکھا رہی ہیں دیکھ رہا ہوں۔

رضوی صاحب: کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یعقوب گاڑی خریدے گا اور وہ بھی اتنی شاندار۔

مفتی صاحب: رضوی صاحب قسمت جب دینے پر آتی ہے تو چھت پھاڑ کر دے دیتی ہے۔

رضوی صاحب: تو قسمت نے یہ گاڑی چھت پھاڑ کر دی ہے۔

مفتی صاحب: (ہنس کر) ارے صاحب میں نے تو محاورہ استعمال کیا ہے۔ بھئی یہ قسمت کی دین ہے۔

رضوی صاحب: آپ قسمت کی دین کہیں، میں تو اسے قسمت کی ستم ظریفی کہتا ہوں۔

مفتی صاحب: بجا فرمایا ہے۔

(یعقوب آواز دیتے ہیں)

یعقوب: رضوی صاحب، مفتی صاحب۔

رضوی اور مفتی: (ایک آواز) آتے ہیں۔

رضوی صاحب: کیا کریں گاڑی دیکھ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اور ہم خوشی سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔

مفتی صاحب: بجا فرمایا۔

یعقوب: اندر چلئے ہماری دونوں بھابیاں بھی آ چکی ہیں۔

مفتی صاحب: انہیں آنا ہی چاہیئے تھا۔

(وقفہ)

رضوی صاحب: آپ لوگوں نے گاڑی دیکھی ہی نہیں۔

بیگم رضوی: دیکھی کیوں نہیں۔ میں تو دروازے پر کھڑی تھی جب گاڑی سامنے سے گزری۔

بیگم مفتی: اور یہی حال میرا بھی تھا۔

رضوی صاحب: اس طرح دیکھنے یعنی دروازے پر کھڑے ہو کر اور اس طرح بالکل قریب آکر دیکھنے میں کچھ فرق ہے۔

مفتی صاحب: بالکل بجا فرمایا ہے آپ نے رضوی صاحب۔ اس طرح دیکھنا تو یوں ہے جیسے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور نکل گیا۔ اور اصل دیکھنا تو اس طرح ہے

رضوی صاحب: ہاں صاحب ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔

بیگم مفتی: بار بار دیکھیں گے۔ سو بار دیکھیں گے۔

رضوی صاحب: میں باہر ابھی ابھی مفتی صاحب سے کہہ رہا تھا کہ یعقوب صاحب کو ان کی محنت کا پھل ملا ہے۔

مفتی صاحب : ساری عمر سائیکل پر سواری کی ہے ، قدرت نے انعام دیا ہے ۔
رضوی صاحب: اور واقعی مستحق شخص کو دیا ہے
مفتی صاحب : رضوی صاحب ! یہ بہت بڑی بات ہے کہ کسی شخص کو اس کی محنت کا پھل مل جائے۔ کہاں ملتا ہے محنت کا پھل ۔
رضوی صاحب : قسمت ساتھ دے تو ملتا ہے ۔
بیگم رضوی : باہر چل کر ذرا دیکھیں۔
رضوی صاحب : ضرور ضرور۔
بیگم : چائے تیار ہو رہی ہے۔
بیگم رضوی : ہا ہے کیا تمہیں سوکھی چائے پر ٹرخانے کا ارادہ ہے ؟
بیگم : نہیں نہیں سوکھی نہیں ۔ گیلی اور بھاری بھرکم چائے ہوگی۔
بیگم مفتی ، میں نے کہا ذرا اس کی حفاظت کیجئے ۔ میرا مطلب ہے گاڑی کا مناسب خیال رکھیئے۔
بیگم رضوی : آئے دن چوری کی واردا تیں ہوتی رہتی ہیں۔ لوگ سائیکل تک نہیں چھوڑتے۔
بیگم مفتی ، گاڑی کے پرزے تک نکال کر لے جاتے ہیں ۔ گاڑی کے قیمتی پرزے نکل جائیں تو اس میں رہ کیا جاتا ہے۔
بیگم رضوی ؛ خاک بھی نہیں ۔
یعقوب : ہم حفاظت کریں گے بھابھی ۔
بیگم رضوی : بڑی حفاظت کی ضرورت ہے ، گھر کے دروازے اندر سے مقفل کر کے سویا کریں ۔
یعقوب : پہلے تو کبھی تالا نہیں لگایا تھا۔
بیگم رضوی : اب لگایا کیجئے ۔
یعقوب : ہاں اب تو لگانا ہی پڑے گا۔

(رضیہ اور محمود چائے کے برتن اور کھانے کی چیزیں میز پر رکھتے ہیں)

بیگم مفتی : ماشا اللہ۔
بیگم رضوی : بڑا تکلف کیا ہے آپ نے
بیگم : تکلف کیا کرنا ہے ۔ امیرانہ ڈال دیا ہے
بیگم رضوی : یہ امیرانہ ڈال دیا ہے تو امیرانہ پلاؤ زردہ کیا ہوگا ؟

منظر — رات کا وقت

خاموشی۔ اس خاموشی میں دور سے ٹھک ٹھک کی آواز۔ گھڑیال دو بجاتا ہے
ٹھک ٹھک کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے

بیگم: (آہستہ سے) میں نے کہا۔ یعقوب صاحب۔ یعقوب صاحب۔

یعقوب: (غنودگی کے عالم میں) کیا ہے

بیگم: سنتے ہیں آپ؟

یعقوب: کیا۔؟

بیگم: ٹھک ٹھک۔ گاڑی دروازے کے پاس کھڑی ہے۔ خدا نخواستہ اٹھ کر دیکھیے۔

یعقوب: گیراج کے اندر ہے اور گیٹ مقفل ہے۔ کیوں نیند حرام کرتی ہو۔

بیگم: تو یہ آواز کیسی ہے۔ خدا خیر کرے، اٹھ کر دیکھیے تو بیگم مفتی نے کہا تھا نا چور گاڑی میں سے قیمتی پرزے۔

یعقوب: گیٹ بند ہے بیگم۔ سونے دو مجھے

بیگم: چور گیٹ ہی سے کب آتے ہیں، ذرا دیکھ لیجیے اطمینان ہو جاتا۔

یعقوب: اچھا تم کہتی ہو تو یونہی سہی۔

بیگم: اللہ گاڑی کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

(وقفہ)

بیگم: ٹھیک ٹھاک ہے؟

یعقوب: ہاں بیگم، ٹھیک بھی ہے اور ٹھاک بھی۔

بیگم: تو وہ ٹھک ٹھک۔

یعقوب: ایک رکشا سواری لئے جا رہا تھا۔ ہمارے گھر کے گیٹ کے قریب خراب ہو گیا۔ ڈرائیور اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ اسی کی ٹھک ٹھک تھی۔ خوامخواہ مجھے بے آرام کر دیا۔

بیگم: اطمینان تو ہو گیا نا۔ گاڑی کی حفاظت کرنا ہمارا کام ہے

یعقوب: گاڑی کا تو اب پتہ نہیں رہے گا۔ اگر اس طرح راتوں کو دو دو بجے جاگنا پڑا تو ہماری صحت کا حفاظت

بیگم: گاڑی اپنے ساتھ ہمارے لئے کچھ ذمہ داریاں بھی لے کر آتی ہے۔

یعقوب: اب نیند آنے سے رہی۔

بیگم: آ جائے گی۔ پھر آرام بناتے ہیں۔

[illegible]

بیگم: سب سے پہلے بڑی خالہ کے ہاں جانا ہے۔ صبح سویرے چلے جائیں گے ناشتہ کر کے۔ دس گیارہ بجے واپسی ہوگی
بارہ بجے سہی۔ آتے ہوئے امجد صاحب کے ہاں بھی تھوڑی دیر کے لئے چلے جائیں گے اور شام کو باغ جناح میں
بچوں کو لے کر۔

یعقوب: تمہاری بڑی خالہ ماڈل ٹاؤن میں رہتی ہے نا۔ سات آٹھ میل دور۔ امجد صاحب کا گھر سٹیشن کے پاس ہے۔

بیگم: تو پھر کیا۔

یعقوب: اور تو کچھ نہیں ہوا پٹرول کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ کیا مصرعہ ہے۔ احتیاط احتیاط احتیاط احتیاط

بیگم: چھوڑیے بھی جانے ایسی احتیاط۔ گاڑی خریدی ہے تو اس سے کچھ فائدہ بھی اٹھانا چاہیے۔

یعقوب: تو شام کے وقت بچوں کو لے کر باغ میں چلیں گے۔ پکنک ہو جائے گی۔

بیگم: پکنک کیسی۔ یہ تو محض سیر ہوگی۔ پکنک کے لئے تو ہرن مینار جائیں گے۔

یعقوب: ہرن مینار۔

بیگم: ہاں سب چلیں گے۔ شام تک رہیں گے وہاں۔ ڈرائیور کا بندوبست ہو گیا ہے؟

یعقوب: پارٹ ٹائم کے لئے صبح سے لے کر دو بجے تک۔ مجھے دفتر چھوڑ آئے گا اور واپس لے آئے گا۔

بیگم: پوری ڈیوٹی نہیں دے گا؟

یعقوب: فی الحال نہیں۔ کسی کمپنی کی گاڑی چلاتا ہے۔

بیگم: یعقوب صاحب مجھے یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ آپ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی گاڑی میں دفتر جائیں گے۔

منظر: صبح کا وقت - ہارن کی آواز

یعقوب: بیگم ڈرائیور بلا رہا ہے۔ دیر ہو جائے گی

بیگم: رضیہ کو اپنی کتاب ہی نہیں مل رہی۔

یعقوب: بڑی دور جانا ہے بیگم

بیگم: گاڑی پانچ نہیں تو دس منٹ میں پہنچا دے گی آپ کو۔

(بلند آواز سے) رضیہ

رضیہ: جی امی۔

بیگم: ملی کتاب

رضیہ: مل گئی ہے۔

بیگم: تو آجاؤ نا۔ تمہارے ابو کو بہت دور جانا ہے۔

(ہارن)

جلدی کرو۔

رضیہ: آ رہی ہوں امی۔

یعقوب: محمود کہاں ہے ۔ ؟

بیگم: وہ تو گاڑی میں بیٹھ چکا ہے

یعقوب: چلو رضیہ۔ تم بھی بیٹھ جاؤ۔ کل یوں نہیں ہوگا۔ سب کے سب آٹھ بجے تیار ہو جائیں۔

بیگم: پہلے تو آٹھ بجے سے پہلے ہی تیار ہو جاتے تھے

رضیہ: امی! اب تو گاڑی ہے نا۔ فوراً پہنچا دے گی

بیگم: اچھا جاؤ۔ بس ذرا سنئے۔

یعقوب: کیوں پیچھے سے آوازیں دیتی ہو۔ کیا ہے

بیگم: رضوی صاحب نے نوکر بھیجا تھا

یعقوب: کیا کہا ہے انہوں نے ؟

بیگم: کہا ہے میرا دفتر راستے میں پڑتا ہے ذرا لفٹ دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

یعقوب: راستے میں کہاں پڑتا ہے مجھے شمال کی طرف جانا ہے اور ان کا دفتر مشرق میں ہے۔ خیر ٹھیک ہے۔

بیگم: نیکی کا کام ہے

یعقوب: اچھا گاڑی کی وجہ سے ہمیں نیکی کا کام کرنے کی توفیق ہوئی ہے۔ (ذرا سا وقفہ)
بیٹھو رضیہ (بلند آواز سے) رضوی صاحب !

رضوی: (کسی قدر فاصلے سے) آ رہا ہوں۔

یعقوب: بس اب آ جائیے ۔

رضوی: ایک منٹ میں آ رہا ہوں۔

رضیہ: میں آگے بیٹھوں نا ابو (

یعقوب: ابھی تک تم بیٹھی نہیں ہو۔ جلدی کرو۔ فیروز گاڑی بیک کر لو۔ ٹرن کرنے میں آسانی رہے گی۔ ہارن دو
ایک منٹ کیا معاذ اللہ منٹ ہو گئے ہیں۔ مجھے دفتر سے دیر ہو جائیگی۔

(ہارن)

رضوی صاحب: (دور ہی سے) آ رہا ہوں ایک سیکنڈ میں۔

یعقوب: اب ان کا ایک سیکنڈ خدا جانے کب ختم ہوگا۔
(رضوی صاحب آتے ہیں)
رضوی صاحب: شکریہ شکریہ۔
یعقوب: ادھر آجائیے رضوی صاحب
رضوی صاحب: یعقوب صاحب، معاف کیجئے رات میرے برادران لا آگئے تھے انہیں بھی دفتر جانا ہے میرے دفتر کے ساتھ ہی ان کا دفتر ہے۔ صرف ایک منٹ کے فاصلے پر۔
یعقوب: راشد صاحب آئے ہیں۔
رضوی صاحب۔ جی جی۔ بہت خوش ہوئے آپ کی گاڑی کا سن کر۔ تیار ہو چکے تھے۔ بس آدھ منٹ اور
یعقوب: بہتر۔ تیار ہو چکے ہیں نا۔
رضوی: جی ہاں

(گاڑی سٹارٹ ہوتی ہے)
منظر: واپس گھر ہیں۔
یعقوب: بیگم معلوم ہے صبح کتنے بجے دفتر پہنچا تھا۔
بیگم: پونے نو بجے آپ گھر سے نکل گئے تھے۔
یعقوب: گھر سے تو نکل گیا تھا۔ رضوی صاحب کو لفٹ دی، ان کے برادران لا کا انتظار کیا۔ دونوں کو ان کے دفتر میں پہنچایا۔ پونے دس بجے کہیں میں اپنے دفتر پہنچا۔
بیگم: پونے دس بجے۔
یعقوب: اور کیا۔ وہ تو میرا باس بہت نیک آدمی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو جواب طلب کر لیتا۔
بیگم: روز کیوں! آج ایسا ہو گیا ہے۔ روز تو نہیں ہوگا۔
یعقوب: رضوی صاحب نے گاڑی سے اترتے وقت کہا تھا آپ نے بھلا کیا۔ خدا آپ کو ہمیشہ بھلا کرنے کی اور توفیق دے۔ مطلب یہ کہ روز لفٹ دے دیا کرو۔ لفٹ دینے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن تیار ہونے میں دیر ہو جاتی ہے میرا تو سرکاری دفتر ہے جہاں لیٹ پہنچنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔
بیگم: آپ ان سے کہہ دیں نا۔
یعقوب: کہنے سے کیا ہوگا۔ انہیں خود احساس ہونا چاہیئے۔
(بیگم مسکراتی ہیں)

بیگم مفتی : سلام علیکم ؛

یعقوب : وعلیکم سلام۔

بیگم : بھائی صاحب کہاں غائب ہیں۔

بیگم مفتی : کچھ پریشان ہیں۔

یعقوب : پریشان کیوں ہیں۔ خدانخواستہ

بیگم مفتی : کیا بتاؤں بھائی صاحب۔ ہمارے معاشرے میں سب سے بڑا مسئلہ بیٹے بیٹی کے لیے رشتہ ڈھونڈنا ہے۔
ہی مہربانی کرے اور قسمت یا ور ہو تو مناسب رشتہ مل سکتا ہے۔ روز رات دن پریشانی۔ گھر گھر پھرو!
سے بات کرو۔ اُس کی منت سماجت کرو۔ رشتہ کرانے والے اداروں کے دروازوں پر دستک دو۔ کم
ایک مہینے سے نگہت کے لیے رشتے کی تگ ودو ہو رہی ہے

بیگم : میں نے سنا تھا رشتے کی بات ہو گئی ہے۔

بیگم مفتی : کہاں ہو گئی ہے۔ ہمیں کوئی لالچ ہے اور نہ اونچے خاندان کی تمنا۔ شرافت ڈھونڈتے ہیں۔ بس اور کچھ
لڑکا نیک ہو۔ پڑھا لکھا ہو۔ شو بازی سے تو ہمیں سخت نفرت ہے۔ مگر لوگ شو بازی پر ہی زور دیتے ہیں۔
جہاں جاتے ہیں سب سے پہلے کہہ دیتے ہیں۔ ہم نہ تو شو کریں گے اور نہ کروائیں گے۔

بیگم : بالکل مناسب رویہ ہے۔

بیگم مفتی : اس رویے میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوگی۔

یعقوب : بالکل نہیں ہونی چاہیئے۔

بیگم مفتی : آج بھی جانا ہے شاہ مان کالونی میں۔

بیگم : خدا کرے بات بن جائے۔

بیگم مفتی : ہاں بہن! وہ۔ کیا کہوں۔ ذرا آئی تھی۔

بیگم : کہیئے۔

بیگم مفتی : جی تو نہیں چاہتا کہ آپ کو تکلیف دی جائے پر کیا کیا جائے اپنے عزیزوں اور ہمدرد ہمسایوں
ہی پر زور چلتا ہے۔

بیگم : فرمائیے ہم کیا خدمت کر سکتے ہیں۔

بیگم مفتی : ذرا گاڑی۔ اوہ معاف کیجئے بے جا تکلیف دے رہی ہوں۔

یعقوب : تکلیف کی تو کوئی بات نہیں۔ ڈرائیور کا مسئلہ ہے۔ شام کو آئے گا۔ ابھی اس سے ملے ہوا ہے۔

مفتی: وقت پانچ بجے کا طے ہو چکا ہے۔ ڈرائیور کی فکر نہ کیجیے۔ میرا بھائی ہے نام منشار وہ بہت اچھی طرح کار بھی چلا لیتا ہے۔ اس کی اپنی کار بھی ورکشاپ میں ہے۔ ورنہ کبھی تکلیف نہ دیتے۔

یعقوب: تو ٹھیک ہے۔

بیگم مفتی: اللہ آپ کا بھلا کرے۔ ایسی کوئی گاڑیاں دروازے پر کھڑی ہوں۔ میں منشار کو بھیج دیتی ہوں۔

رضیہ: ابو

یعقوب: جی بیٹی۔

رضیہ: آپ نے کہا تھا شام کو سیر کے لئے چلیں گے

بیگم: شام کو گاڑی آ جائے گی

یعقوب: شام ہونے میں ڈیڑھ دو گھنٹے باقی ہیں۔ مجھے امید نہیں کہ یہ لوگ سات سے پہلے آئیں۔ ڈرائیور کو ساڑھے چھ کا وقت دے رکھا ہے۔ آئے گا تو رکے گا نہیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔

منظر: گھر۔ بیگم اور بچے یعقوب کا انتظار کر رہے ہیں۔

سود: امی ابو آ گئے ہیں۔

(یعقوب آتے ہیں)

بیگم: آ گئے ہیں۔ میں نے کہا اتنی دیر تک مفتی صاحب کے گھر میں کیوں بیٹھے رہے۔

یعقوب: ہمارا ایک مشترکہ دوست یورپ سے آیا ہے۔ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ بڑی دلچسپ باتیں سنا رہے تھے۔ ابھی اور بیٹھتا مگر یاد آ گیا وہاں جانا ہے۔

بیگم: کہاں جانا ہے؟

یعقوب: کیا تمہیں یاد نہیں رہا۔ خانصاحب نے چائے پہ بلا رکھا ہے۔

بیگم: ہائے میرے اللہ۔

یعقوب: کیوں کیا ہوا۔

بیگم: مجھے تو کچھ یاد ہی نہیں رہا۔

یعقوب: عجیب بات۔ میں نے دفتر جانے سے پہلے تمہیں بتا دیا تھا۔ ایک بار نہیں دو بار۔ پھر بھی بھول گئیں۔

بیگم: اللہ مارا حافظہ ہی کمزور ہو گیا ہے۔

یعقوب: چلو اب تیار ہو جاؤ۔ جلدی۔ بڑی جلدی۔ بجلی کی رفتار سے۔ آدھ گھنٹہ لیٹ ہو چکا ہے۔

بیگم: تیار تو ہو جاؤں گی۔ پر —

یعقوب: پھر کیا۔
بیگم: گاڑی کی ضرورت ہوگی۔
یعقوب: تو کیا پیدل جائیں گے۔ دو میل دور رہتے ہیں خان صاحب۔ آخر یہ قصہ کیا ہے۔ پریشان کیوں ہو گئیں۔
بیگم: مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ رضیہ کی سہیلی کی ماں آگئی۔ کہنے لگی ہمارے ایک عزیز کے بیٹے کی سالگرہ ہے۔
یعقوب: اس میں حرج ہی کیا ہے! سالگرہ ہوتی رہتی ہے۔
بیگم: اس نے کہا۔ بچے گاڑی میں جائیں گے۔
یعقوب: تو کیا گاڑی بھیج دی ہے
بیگم: اس نے جو کہا تھا۔
یعقوب: بچے رکشا ٹیکسی وغیرہ میں نہیں جا سکتے تھے۔؟
بیگم: اس نے مانگی تو میں انکار نہ کر سکی۔
یعقوب: شام سے پہلے گاڑی کسی صورت بھی واپس نہیں آئے گی اس کا مجھے یقین ہے۔ سالگرہ کے پروگرام بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ خان صاحب نے بڑی محبت سے بلایا تھا۔
بیگم: ٹیکسی میں چلے جاتے ہیں۔
یعقوب: گھر میں اپنی گاڑی ہو تو ٹیکسی میں کیوں جائیں۔ خواہ مخواہ پیسے خرچ کریں۔ روز چالیس پچاس کا پٹرول اڑ جاتا ہے۔ یوں نہیں چلے گا بیگم۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ پٹرول کتنا مہنگا ہو چکا ہے۔ میں صرف دفتر آتا جاتا ہوں باقی سارا پٹرول یہ لوگ برباد کر دیتے ہیں۔
بیگم: صاف جواب بھی تو نہیں دیا جا سکتا۔
یعقوب: یہ ٹھیک ہے ہمسایوں کا بڑا حق ہوتا ہے۔
بیگم: اور اپنے ہمسایوں سے تو ہمارے تعلقات برسوں پرانے ہیں۔ آج تک ہمیں کسی سے شکایت نہیں ہوئی۔ محبت سے گزارا ہوتا رہا ہے۔
یعقوب: بیگم! میں نے یہ کب کہا ہے کہ ہمسایوں سے ہمارے تعلقات خوشگوار۔ بلکہ نہایت خوشگوار نہیں ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ضرورت کے وقت ہمیں بھی کوئی دقت نہ ہو۔ اس طرح ہو تو سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہمارے مہربان بھی تعاون کریں۔
بیگم: کس طرح۔
یعقوب: وہ اس طرح کہ جس کو بھی گاڑی کی ضرورت ہو، وہ دو تین روز پہلے ہمیں اطلاع دے دے۔

بیگم : یہ تو آپ کی مہربانی ہے۔ بیگم مفتی سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آپ ان سے بات کر لیجئے۔ ممکن ہے مان جائیں ۔ پھر گاڑی آپ کے لئے ہوگی۔

بیگم رضوی : ان سے بات کروں۔ یعنی بیگم مفتی سے ۔؟

بیگم : کیوں نہیں : وہ کہہ دیں گی کہ آپ گاڑی لے جائیں۔ ہم ٹیکسی کا بندوبست کرلیں گے۔ ایسے معاملات میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ رواداری اسی کو کہتے ہیں۔

بیگم رضوی : بہتر۔ آپ کہتی ہیں تو کہہ سن لیتی ہوں۔

بیگم : ٹھہر تو جائیے ۔ چائے۔

بیگم رضوی : یہ کام بہت ضروری ہے۔

(بیگم رضوی نکل جاتی ہے۔ گاڑی کے ہارن کی آواز)

یعقوب : کیوں بیگم کیا معاملہ ہے۔ بیگم رضوی جلدی جلدی چلی جا رہی تھیں ۔

بیگم : مفتی صاحب کے گھر جا رہی ہیں۔

یعقوب : کس لئے ۔؟

بیگم : آپ کے تجویز کردہ پروگرام پر عمل کیا ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ گاڑی کے لئے دو تین روز پہلے اطلاع ملنی چاہیئے۔ بیگم مفتی نے کل کے لئے دو تین دن پہلے اطلاع دے دی تھی، اور یہ بھی گاڑی کل کے لئے مانگ رہی ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ کو زیادہ ضرورت ہے تو بیگم مفتی سے گفتگو کرلیں ۔

یعقوب : تو ادھر گفتگو کرنے گئی ہیں۔

بیگم : جی ہاں۔

یعقوب : بہت اچھا کیا ہے۔ اب اس پروگرام میں بھی تھوڑا سا اضافہ ہوگا

بیگم : کیا اضافہ؟

یعقوب : ہم پٹرول کے ذمے دار نہیں ہوں گے۔ بیگم ان دس پندرہ دنوں میں میرا تو دیوالیہ ہی نکل گیا ہے آدھی تنخواہ تو اب تک صرف پٹرول پر اٹھ گئی ہے ۔

بیگم : لیکن کسی کو بتائیں گے کیسے کہ گاڑی میں پٹرول کم ہے ۔

یعقوب : بتانے کی ضرورت کیا ہے تھوڑی دور جا کر گاڑی رک جائے گی تو پٹرول ڈلوائیں گے۔ دیکھئے ذرا معلوم ہو جاتا ہے کہ گاڑی میں پٹرول کتنی مقدار میں ہے۔ ڈرائیور بھی بتا سکتا ہے

(بیگم مفتی آتی ہیں)

بیگم مفتی : سلام علیکم !
یعقوب : وعلیکم السلام ۔ آئیے بہن ۔ تشریف رکھئے ۔
بیگم مفتی : آپ نے بیگم صفوی کو میرے ہاں کیوں بھیج دیا تھا
بیگم : میں نے کہا تھا کہ ۔
بیگم مفتی : سو سو باتیں بنائی ہیں انہوں نے آ کر ۔ میں نے صرف یہ کہہ دیا تھا کہ ہمارا گاڑی میں جانا ضروری ہے ۔ آپ کے لئے ٹیکسی کا انتظام کروا دیں گے ۔ بس ہوا میں اڑنے لگیں ۔ زمین پر پاؤں ٹکتے ہی نہیں تھے ۔ کہنے لگیں کیا ہم مجبور مرتے ہیں ۔ جو ٹیکسی کا کرایہ نہیں دے سکتے ۔ ہمیں کیا گاڑی کی پروا ہے ۔ گاڑی نہیں تھی تو ہماری ضرورتیں پوری نہیں ہوتی تھیں ؟
یعقوب : یہ اچھا نہیں ہوا ۔
بیگم مفتی : آپ نے انہیں بھیجا ہی کیوں ۔ گاڑی آپ کی ہے ۔ جس کو چاہیں دیں ۔ جس کو چاہے نہ دیں ۔ اس میں زبردستی کا [illegible] ہے ۔ وہ کون ہوتی ہے مانگنے والی ۔ کسی کا پروگرام غارت کرنے والی ؟
بیگم : میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ آپ سے بات کرلیں ۔
بیگم مفتی : کیسی اچھی بات کی ہے انہوں نے ۔ میں یہ کہنے آئی ہوں کہ ہمیں کل گاڑی کی ضرورت نہیں ہوگی ۔ آپ [illegible] سے بھیج دیں ۔ ان کے دروازے پر ۔
بیگم : ہائے اللہ ۔ آپ بھی کیسی باتیں کرنے لگیں ۔ آپ کو گاڑی کی ضرورت ہے ۔ گاڑی حاضر ہے
بیگم مفتی : جی نہیں ۔ ہمیں ضرورت نہیں ہے ۔ انہیں زیادہ ضرورت ہے ۔ اسی لئے تو انہیں میرے یہاں بھیجا تھا آپ کی گاڑی آپ کو مبارک ۔ ہم باز آئے ایسی گاڑی سے ۔
بیگم : میں نے تو نیک نیتی سے کہا تھا ۔
بیگم مفتی : میں بھی نیک نیتی ہی سے کہہ رہی ہوں ۔ گھر آ کر ہماری بے عزتی کر دی ۔ انہیں کیا حق تھا باتیں بنانے کا کیوں کسی کی سنیں ۔ کسی کا دیا تو نہیں کھاتے ۔ کسی کے احسان مند تو نہیں ۔
بیگم : بیٹھئے تو سہی ، سنئے تو ذرا ۔ یعقوب آپ کہئے ان سے
یعقوب : بھابی ۔ ذرا سنئے ۔
بیگم مفتی : شکریہ ، بہت بہت شکریہ ۔ گاڑی مت بھجوائیے ۔ ہمیں ضرورت نہیں ہے !
(بیگم مفتی چلی جاتی ہیں)
بیگم : کمال ہو گیا ہے

نجیب: ایسے کمال ہوتے ہو رہتے ہیں بیگم۔ ویسے غلطی تمہاری ہی ہے۔ بیگم رضوی کو ان کے گھر بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی؟
اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ بیگم مفتی سے وعدہ کر رکھا ہے۔ گاڑی ان کے ہاں جائے گی
بیگم: میں نے تو سوچا تھا کہ دونوں باہمی گفتگو سے معاملہ طے کر لیں گے
نجیب: تو کیا معاملہ طے کیا ہے مزا آگیا۔
بیگم: آپ کو مذاق ہی سوجھتا ہے۔ یہاں بیگم مفتی ناراض ہو کر چلی گئی ہیں۔
نجیب: لو بیگم رضوی بھی آگئیں۔ آئیے بہن۔
(بیگم رضوی آتی ہیں)
بیگم رضوی: یہ کیا کہا ہے بیگم مفتی نے
بیگم: کچھ نہیں۔ آپ کو بھلا یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ ہم ٹیکسی کا انتظام خود نہیں کر سکتے جو کے نکلے میں کیا
بیگم رضوی: تو اور کیا کہتی۔ ہم خود ٹیکسی کا انتظام نہیں کر سکتے؟ جھوٹ کیا بولا تھا میں نے؟
بیگم: کر سکتے ہیں۔ کیوں نہیں کر سکتے۔
بیگم رضوی: آپ کو کیا معلوم انہوں نے کیا کچھ کہا تھا۔ بولیں۔ رکھیں گاڑی اپنے گھر میں۔ ساری عمر سائیکل گھسیٹی ہے۔ اب
گاڑی مل گئی ہے تو بیگم رضوی کو ہمارے سر پر سوار کر دیا ہے
بیگم: بہن برا نہ ماننا۔ آپ نے ضرور کوئی ایسی ویسی بات کہی ہوگی۔
بیگم رضوی: کیوں کہنے لگی؟
بیگم: ضرور کوئی سخت بات کہی ہوگی۔ آخر کسی وجہ سے ہی انہوں نے کہا ہوگا۔ کہ رکھیں گاڑی اپنے گھر میں۔
بیگم رضوی: میں کوئی ایسی ویسی بات کیوں کہتی؟ دماغ چل گیا تھا کیا میرا
نجیب: بیگم! تم کیوں پوچھتی ہو۔
بیگم: کیوں نہ پوچھوں۔ میں کہتی ہوں۔ انہوں نے ضرور کوئی سخت اور قابل اعتراض بات کہی ہوگی۔ اسی پہ تو انہوں
نے کہا ہوگا کہ ساری عمر سائیکل گھسیٹی ہے
نجیب: گھسیٹی ہے۔ میں کب انکار کرتا ہوں۔
بیگم: لیکن یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔
بیگم رضوی: انہیں سے پوچھو جا کر۔ میں کیا بتاؤں۔ کہا تو انہوں نے تھا۔
(بیگم مفتی آتی ہیں)
بیگم مفتی: جا کر پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بتانے کے لئے آگئی ہوں۔ یہ بات انہوں نے کہی تھی۔

بیگم رضوی : میں نے کہی تھی ؟
بیگم مفتی : اور کس نے کہی تھی ؟ گھر میں گواہ بھی موجود ہے۔ کہو تو حاضر کر دوں۔ میرے بیٹے کا بڑا لڑکا گھر ہی میں تھا۔
بیگم رضوی : بیگم مفتی ! خدا کے لئے جھوٹ تو نہ بولو۔ خدا سے ڈرو۔ کیوں بہتان لگاتی ہو کسی پر۔
بیگم مفتی : جھوٹ تم نے بولا ہے۔ میں کوئی بہتان نہیں لگاتی۔ سچ سچ کہہ رہی ہوں۔ ذرا اپنے ضمیر سے پوچھ کر دیکھو کون جھوٹ بولتا ہے۔ اور کون سچ کہتا ہے۔
بیگم رضوی : تم نے جھوٹ بولا ہے۔
بیگم : ہائے اللہ ! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ کیوں ایسی تلخ باتیں کرتی ہیں۔
بیگم رضوی : اسے کچھ ہو گیا ہے۔ جھوٹ بول کر کہتی ہے میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ میں کہے دیتی ہوں کار ہو گی سوغات تمہارے لئے ہمارے لئے نہیں ہے۔ ہزاروں دیکھی ہیں ایسی کاریاں۔
بیگم مفتی : سوغات نہیں ہے اسی لئے مانگتی پھرتی ہو۔
بیگم رضوی : تم نے نہیں مانگی ؟ چپ رہو اب۔ منہ نہ کھلواؤ۔ یعقوب صاحب کے بارے میں کیا کیا ریمارکس پاس کیا کرتی تھیں۔ سائیکل پر یوں بیٹھا ہے جیسے عورت آٹا گوندھ رہی ہے۔
بیگم مفتی : لاحول ولا۔ یعقوب صاحب ! یہ نا خدا لگتی ہے نا شرم !
بیگم رضوی : زبان سنبھال کر بات کرو۔
بیگم مفتی : اور تم بھی سنبھالو اپنی گز بھر کی زبان۔ منہ میں سماتی ہی نہیں۔ باہر نکل نکل پڑتی ہے
بیگم : ہائے میرے اللہ۔ خدا کے لئے چپ ہو جائیے۔ آج ہو کیا گیا ہے آپ کو۔ صبر و تحمل سے گفتگو کریں۔
یعقوب : بیگم مفتی ! آپ باہر چلیں۔ دوسرے کمرے میں۔
بیگم مفتی : میں گھر جاؤں گی۔ دیکھئے اسے کار ہی۔ مانگے تانگے کی کار میں کیسی شہزادی لگے گی۔
بیگم رضوی : شہزادی تو تم ہو، بلکہ ملکہ ہو۔
بیگم مفتی : دفع دور۔ میری جوتی کو بھی پروا نہیں ایسی کار کی۔
(بیگم مفتی چلی جاتی ہیں)
بیگم : ہائے میرے اللہ۔ رضیہ ! پانی پلاؤ۔
بیگم رضوی : دیکھا کیسی چالاک بنتی ہے۔
یعقوب : اب چھوڑئیے اس قصے کو۔
بیگم رضوی : کہتی ہے مجھے نمائش سے نفرت ہے اور سب سے زیادہ نمائش پسند خود ہے۔ لڑکے کو دیکھنے کے لئے

گاڑی میں تشریف لے جائیں گی۔ سبحان اللہ ایسی ہی نمائش کا شوق ہے تو خود گاڑی کیوں نہیں خرید لیتی ۔؟

بیگم: اب چھوڑیئے بھی نا یہ قصہ!

یعقوب: آپ کا بھانجا کتنے بجے آئے گا۔

بیگم رضوی: آجائے گا ائرپورٹ پر سینکڑوں ٹیکسیاں کھڑی ہوتی ہیں۔

یعقوب: وہ آپ کے لئے نہیں ہیں۔

بیگم: آپ کا بھانجا ہمارا اپنا بھانجا ہے، گاڑی ضرور جائے گی۔ ہر حالت میں جائے گی۔

— وقفہ۔ گاڑی کا ہارن۔ فیروز آتا ہے۔

یعقوب: کیوں فیروز: دس منٹ میں ائرپورٹ پر پہنچ بھی گئے۔ اور بیگم رضوی کے بھانجے کو لے بھی آئے۔

فیروز: وہاں گئے کہاں ہیں جناب!

یعقوب: کیوں۔ رضوی اور بیگم رضوی گاڑی میں بیٹھے ہیں!

فیروز: بیٹھے تھے۔

یعقوب: تو کیا ان کا پروگرام بدل گیا ہے۔

فیروز: نہیں جی!

یعقوب: تو ہوا کیا ہے بھائی۔

فیروز: گاڑی کچھ دور جاکر رک گئی۔ میں نے کہا پٹرول نہیں ہے۔ پٹرول پمپ پر لے چلوں۔ رضوی صاحب نے حیران ہوکر پوچھا پٹرول کہاں گیا! میں نے کہہ دیا یعقوب صاحب نے کہہ دیا ہے جو گاڑی لے جائے وہ خود پٹرول ڈلوائے ان کی بیگم بولیں۔ نہیں جاتے ہم۔ اترو جی! واپس کردو گاڑی۔ اتنی بھی مروت نہیں۔ توبہ توبہ۔ پٹرول ہم خود ڈلوائیں۔ یہ ساری شرارت بیگم صفی کی ہے۔ اترو نا۔

یعقوب: تو وہ گاڑی سے اتر گئے۔

فیروز: جی ہاں!

یعقوب: اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ چابی مجھے دے دو۔

(بیگم آتی ہیں)

بیگم: گاڑی اتنی جلدی واپس کیوں آگئی۔ بیگم رضوی اور رضوی صاحب گئے نہیں۔

یعقوب: وہ ہماری بے مروتی پر ناراض ہوکر گاڑی سے اتر گئے ہیں۔

بیگم: بے مروتی کیسی: ہم نے کون سی بے مروتی کی ہے۔

یعقوب: گاڑی میں پٹرول نہیں ڈلوایا۔ اس سے بڑی بے مروتی کیا ہو گی۔
بیگم: کمال ہے
یعقوب: اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کم سے کم آدمی تنخواہ پٹرول پر خرچ کردی جائے۔
بیگم: یہی چاہتے ہیں یہ لوگ۔
یعقوب: خیر۔ بیگم۔
بیگم: فرمائیے۔
یعقوب: کیا مفتی صاحب بیگم مفتی، رضوی صاحب اور بیگم رضوی کل غریب خانے پر آ سکتے ہیں۔
بیگم: بلایا جائے تو کیوں نہیں آئیں گے۔
یعقوب: تو محمود سے کہو۔ اُن کے ہاں جا کر کہہ دے کہ مہربانی کر کے کل صبح سویرے غریب خانے پر آ جائیں۔
بیگم: وہ کیوں۔
یعقوب: ایک پروگرام کے لیے
بیگم: کیا پروگرام ہے
یعقوب: یہ پروگرام کل تم سنو گی نہیں دیکھو گی۔

دوسرے روز

صبح کا وقت۔ مفتی صاحب، بیگم مفتی، رضوی صاحب اور بیگم رضوی
یعقوب کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہیں۔ یعقوب موجود نہیں ہے۔

مفتی صاحب: آخر صبح ہی صبح ہمیں بلانے کی تُک کیا تھی۔
رضوی صاحب: میں کیا عرض کر سکتا ہوں مفتی صاحب۔ یعقوب کا لڑکا محمود میرے ہاں آیا تھا اور کہنے لگا۔ ابا جی کو
آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ کل صبح تکلیف کر کے بیگم جی کے ساتھ آ جائیں۔
بیگم مفتی: یہی بات ہمیں بھی کہی گئی تھی۔
بیگم رضوی: ہمیں بلایا ہے اور خود غائب ہیں۔
رضوی صاحب: عجیب تماشا ہے۔ (یعقوب آتا ہے)
یعقوب: معاف کیجیے حضرات اور معزز خواتین! آپ کو تکلیف ہوئی۔
مفتی صاحب: ارشاد فرمائیے۔ بات کیا ہے۔ کیوں ہمیں بلایا گیا ہے۔
یعقوب: عرض کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے پہلے ناشتہ۔

رفیق صاحب: ارے جلدی جلدی نہیں صاحب۔ ناشتہ واشتہ رہنے دیں۔ معاملہ کیا ہے یہ بتائیں۔
یعقوب: معاملہ تو کوئی خاص نہیں۔
رفیق صاحب: پھر بھی۔
یعقوب: خاکسار عرض کرتا ہے۔ محترم دوستو اور محترم خواتین میں سب سے پہلے آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے آپ کے درمیان بھی کچھ تلخی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود آپ تشریف لے آئے۔ کن زبانوں سے شکریہ ادا کا
مفتی صاحب: ارے صاحب! اصل قصہ بتائیے
رفیق صاحب: تکلف کی ضرورت نہیں ہے یعقوب صاحب۔
یعقوب: عرض کرتا ہوں۔
مفتی صاحب: اب کر بھی چکئے۔
یعقوب: میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کمزور ہوگیا ہوں
رفیق صاحب: کیا ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہے جو آپ ہمیں بتا رہے ہیں۔
یعقوب: سائیکل چلا چلا کر تھک گیا ہوں
مفتی صاحب: کیا فلسفے بیٹھے ہیں آپ؟ ساری عمر سائیکل چلاتے رہے ہیں آدمی تھکے گا نہیں تو اور کیا ہوگا۔
یعقوب: اک ذرا صبر صاحبان!
رفیق صاحب: ادھر ادھر کی باتوں سے کیا حاصل۔ کچھ کہنا ہے تو کہئے۔ وقت ضائع نہ کیجئے ہمارا۔ بہت کام ہے ہمیں
یعقوب: عرض کرتا ہوں۔ مجھے نوکری بھی کرنی تھی۔ اور سائیکل بھی نہیں چلانی تھی۔
مفتی صاحب: ہمیں اس سے کیا غرض؟ یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے۔
یعقوب: آپ کو غرض تھی، اور آپ کو غرض ہے۔
رفیق صاحب: حد ہوگئی ہے۔
یعقوب: میں نے کسی نہ کسی طرح کار خرید لی۔
رفیق صاحب: تو ہمیں یہ بتانے کے لئے بلایا ہے کہ آپ نے گاڑی خرید لی۔ گویا ہمیں آپ کی اس خوش قسمتی کا علم نہیں تھا آج ہمیں یہ کریہہ خبر سنائی جا رہی ہے۔
یعقوب: آپ نے تو گاڑی خریدنے پر مجھے مبارکبادیں دی تھیں
مفتی صاحب: شاید غلطی کی تھی۔
یعقوب: قطعاً غلطی نہیں کی تھی۔ مبارکبادیں دے کر آپ نے مجھے ممنون کیا تھا۔

رضوی صاحب: تو ارشاد کیا ہے اب۔

(ذرا خاموش رہنے کے بعد)

یعقوب: میرے معزز دوستو اور معزز خواتین! آپ نے مجھے یہ احساس دلا دیا ہے کہ میں نے کار خرید کر سخت غلطی کی ہے میں بداخلاق ہو گیا ہوں کہ ضرورت کے وقت آپ کو گاڑی نہیں دیتا۔ بے مروت ہو گیا ہوں کہ گاڑی میں پٹرول ڈلوانے کے لئے آپ سے کہتا ہوں۔ بدتمیز ہو گیا ہوں کہ کہتا ہوں کہ گاڑی لے جانی ہو تو دو دن پہلے اطلاع دیں۔ میں اپنی ان خامیوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ اس لئے میں نے سوچ لیا ہے کہ گاڑی اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔ آپ میں سے جو صاحب چاہیں اسے لے جا سکتے ہیں۔ ابھی اسی وقت لے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے مفت نہیں لے جائیں گے۔ وہی قیمت...

مفتی صاحب: لاحول ولا۔ کیا یہی کچھ کہنے کے لئے ہمیں بلایا تھا۔

رضوی صاحب: یعقوب صاحب! میں تو آپ کو معقول آدمی سمجھتا تھا۔ آپ تو۔ معاف کیجئے اب کچھ کہہ نہیں سکتا۔

بیگم رضوی: کیوں ہم کیوں یہ چھکڑا خریدیں۔

یعقوب: کیا اب یہ چھکڑا بن گیا ہے۔

بیگم مفتی: اور کیا ہے؟ بابا آدم کے وقت کی گاڑی۔

مفتی صاحب: کمال کر دیا ہے یعقوب صاحب آپ نے۔

رضوی صاحب: خواہ مخواہ وقت ضائع کر دیا۔

یعقوب: مگر رضوی صاحب میں محسوس کرتا ہوں مجھ سے زیادہ آپ کو گاڑی کی ضرورت ہے۔ میں تو بے مروت، بدتمیز، بد لحاظ اور.....

مفتی صاحب: مجھے دفتر سے دیر ہو رہی ہے چلو بیگم۔

رضوی صاحب: میں بہت لیٹ ہو گیا ہوں۔ ناشتہ کرنے کے لئے بھی وقت نہیں ملے گا۔ بیگم چلو نا

بیگم رضوی: چلئے

یعقوب: سنئے تو میرے عزیز دوستو۔ ٹھہریئے ذرا۔ ایک منٹ۔ مجھے جواب تو دیتے جائیں۔ حضرات۔

(ذرا سا وقفہ)

(بیگم یعقوب ہنستی ہوئی آتی ہے)

بیگم: چلے گئے ہیں۔ مگر میں پوچھتی ہوں اس ڈرامے کی ضرورت کیا تھی۔

یعقوب: ضرورت تھی بیگم۔ اب گاڑی کی فرمائش لے کر کوئی نہیں آئے گا۔

(بیگم ہنستی جاتی ہیں)

یعقوب: کیسا رہا یہ ڈرامہ!
بیگم: بہت مزیدار۔ مگر آپ یہ کیا رہے تھے۔
یعقوب: گاڑی۔
بیگم: گاڑی!
یعقوب: ہاں۔ گاڑی اور کیا۔
بیگم: (ہنسی کر) وہ تو۔ میں نے اپنی ایک سہیلی سے معاملہ طے کر لیا ہے۔ اس کے شوہر آج آ رہے ہیں۔ گاڑی لے جانے کے لئے۔
یعقوب: کیا۔ کیا۔؟ یہ تم نے کیا کیا۔
(کال بیل)
بیگم: وہ صاحب آ گئے ہیں
یعقوب: میں۔ یہ کیا کیا تم نے
(دوبارہ کال بیل)
بیگم: وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔ جاتے کیوں نہیں۔
(یعقوب پریشان سا کھڑا ہے۔ بیگم اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے جانے لگتی ہے)
کال بیل پھر بجتی ہے

طاہر مختار

چوہی آپا

اپنے قد سے اونچی ڈالی سے پھل توڑ کر کھانے میں اسے بہت ہی مزہ آتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ کوئی نئی بات تھوڑا ہی تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ ایسا ہی کرتی آئی تھی۔ جب وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پنجوں کو زمین میں عمودی گاڑ کر درخت پر لگے پھل توڑ لیتی تو اس کے بدن کا تار تار اندر ہی اندر بجنے لگتا۔ اس وقت وہ سوچتی کہ اگر چاہے تو انہی پاؤں پر کھڑی ہو کر آسمان کے تارے بھی توڑ سکتی ہے۔ اس کا سر فوراً آسمان سے جا لگتا۔ تمام کائنات اسے سمٹی ہوئی نظر آتی۔ اور اس میں بسنے والے لوگ اسے چھ انچ کے بونے نظر آتے۔ اس کا جی چاہتا کہ ایک ایک کر کے وہ ان سب کو اپنی ہتھیلیوں میں رکھ کر مسل دے۔ مگر جب وہ اپنا آپ دیکھتی تو اسے خود سے خوف آنے لگتا۔ وہ اپنے پھیلے ہوئے وجود کو سمیٹنے لگتی۔ نجانے زندگی کی تیس بہاروں میں اس کا وجود کتنی دفعہ پھیلا اور سکڑا تھا۔ وقت کے بے رحم ہاتھ کے نشانات اس کے رخساروں پر اس طرح چپکے ہوئے نظر آتے تھے جیسے رس سے بھرے ہوئے سیب کے بدن پر انگلیوں کے نشان۔ وہ اپنا ٹھگنا سا بدن مختصر سے کپڑوں میں چھپائے بازار میں سے گزرتی تو ہر آتے جاتے کی نظر اس کی طرف ایسے اٹھ جاتی جیسے تمام آنکھیں اسی کے انتظار میں لگی تھیں۔ لڑکوں میں کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔ "چوہی آپا" .... "چوہی آپا" کی آوازیں ہر طرف سے سنائی دیتیں۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی اس طرح گزرتی کہ کہیں اس کے جسم کا کوئی حصہ انسانوں کی دلدل میں نہ پھنس جائے۔

محلے میں بسنے والے سب لوگ اسے ایک ہی نام سے پکارتے تھے۔ اس کا نام بھی تو ایک ہی تھا۔ اسی محلے میں کئی سال گزارنے کے بعد بھی لوگوں کو اس کے اصلی نام کا علم نہ تھا، ہوتا بھی کیسے؟ کسی نے اتنی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ اس کا نام جانے۔ حالانکہ بند گلی کے آخری مکان میں نئے کرایہ داروں کو آئے ہوئے دو ہفتے بھی نہ گزرے تھے۔ لیکن محلے کے لوگ اس گھر کے ہر فرد کو نام سے جاننے لگے تھے۔ محلے کے منچلے لڑکے اس گھر کا سودا سلف لانے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ لیکن ایک یہ تھی کہ چوہی آپا کے علاوہ اور کوئی نام اس پر جچتا ہی نہیں تھا۔ ایک بات اور بھی تو تھی۔ کبھی اس نے کسی کو منع بھی تو نہ کیا تھا۔ میں اکثر سوچتا کہ شاید اس نام سے اس کو محبت ہو گئی ہے

یا اس نام کے ساتھ اس کی زندگی کا کوئی راز وابستہ ہے۔ عجیب و غریب معمہ تھا جو میری دانست سے باہر تھا۔
وہ مجھے روزانہ ملتی تھی کبھی کبھار تو دن میں دو تین بار ملاقات ہو جاتی تھی۔ جونہی وہ میرے پاس سے گزرتی تو
اس کے ہونٹ خود بخود حرکت کرنے لگتے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ میں اس کے قریب سے اس طرح گزر جاتا جیسے
اسے دیکھا ہی نہ ہو۔

آج صبح سویرے جب میں نے دفتر جانے کے لئے حویلی سے باہر قدم نکالے تو تھوڑی دور ہی چوہی آپا سے
ملاقات ہو گئی۔ چرمی بیگ اپنی انگلیوں میں اٹکائے وہ اس طرح چلی جا رہی تھی، جیسے کہ سانپ زمین پہ رینگتا جا رہا ہو۔
مجھے دیکھتے ہی اس پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر اس کی
آواز اس کے لمبے لمبے دانتوں سے ٹکرا کر واپس حلق میں لوٹ گئی۔ اس نے اپنے دانتوں کو بھینچ لیا۔ ایک باغیانہ تِل
اس کے چہرے پر چھایا تھا۔ وہ پھوٹ پڑنا چاہتی تھی مگر یکدم سرد ہو گئی۔ اپنی بائیں کلائی کو آنکھوں کے قریب
لاتے ہوئے پوچھا "آپ کے پاس وقت ہو گا؟" اور میرے جواب کے انتظار میں چند لمحے کے لئے رُک گئی۔ میں نے
کہا "وقت تو نہیں البتہ گھڑی ضرور ہے"۔ وہ فوراً بولی "جی ہاں! میرا مطلب بھی یہی ہے .... کیا بجا
ہے آپ کی گھڑی میں؟" اور پھر اپنی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کم بخت تو ہمیشہ پیچھے ہی رہتی ہے۔ ہر
روز دیر ہو جاتی ہے۔" میں نے ایک سرسری نگاہ اپنی گھڑی پر ڈالی اور کہا "سات بجنے کو ہیں .... بس
چند منٹ باقی ہیں۔" یہ سنتے ہی وہ ایسی برق رفتاری سے بھاگی جیسے زمین اس کے پاؤں تلے پھسلی جا رہی ہو۔ دور
دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا وہ جا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ ایسی عورت جس میں صرف روح ہی روح ہو اتنی تیز رفتار کیسے ہو سکتی ہے۔
عجیب و غریب چیز تھی وہ بھی۔ وقت سے بہت آگے نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر بے وقوف کہیں کی یہ بھی نہ جانتی
تھی کہ وقت تو ایک منہ زور گھوڑے کی مانند ہے کہ اسے اگر روکنا ہو تو آگے بڑھ کر روکو ورنہ ہر چیز کو اپنے ساتھ کھینچ
کر لے جائے گا۔ اپنی پہنچ سے اونچی چیزوں کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ان چیزوں کو جہاں تک اس کا شعور بھی نہ پہنچ سکتا
تھا۔ مگر ایک جذبہ تھا۔ ایک لگن تھی جو اسے صحراؤں میں دوڑائے پھرتی تھی۔

شام کے وقت میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے چوہی آپا کو کھڑے پایا۔ "کہیے
کیسے آنا ہوا؟ .... خیریت تو ہے نا؟" میرے منہ سے اچانک نکلا اور میں ہڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی
اور ملتجیانہ نگاہوں سے تکنے لگی۔ کئی لمحے جامد ہو گئے۔ میں مجسم حیرت بنا کھڑا تھا۔ "میں اندر بیٹھ سکتی ہوں؟" اس نے خاموشی کو
توڑتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ "جی ہاں۔ آئیے، تشریف رکھیے۔" میں نے ایک ہی سانس میں
نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا۔ ندیا کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ وہ دیوار جو ایک عرصے سے میرے اور اس کے درمیان حائل تھی
ریت کے ٹیلے کی طرح بکھرتی ہوئی نظر آئی۔ ایک پردہ جو ایک عرصہ سے میرے اور اس کے درمیان حائل تھا یکایک

تقار ہو چکا تھا۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ اتنا عرصہ ایک ہی حویلی میں رہنے کے باوجود چھوٹی آپا نے کبھی بھی کسی کو اپنے قریب آنے کا موقع نہ دیا تھا اور نہ خود کسی کے قریب آئی تھی۔ نہ جانے آج کیا ہوا کہ پتھر کی فصیل ریت کی دیوار کی طرح بکھر رہی تھی۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئی اور چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ "آپ چائے پینا پسند کریں گی؟" میں نے پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کے ہونٹ بھی نہیں ہلے۔ اس کے چہرے کی رنگت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ بے حس و حرکت جسم میرے سامنے کرسی میں سمٹا پڑا تھا۔ میں نے نوکر کو چائے لانے کے لئے کہا۔ وہ چائے لے کر واپس آیا۔ میں نے گرم گرم چائے سے بھرا ہوا ایک کپ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ ایک ہی گھونٹ میں ساری چائے غٹاغٹ پی گئی۔ اس کے نزدیک وقت بہت قیمتی تھا۔ ایک لمحہ بھی بےکار ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وقت کو دس سال پیچھے لے جاتی اور خود کو بیس برس کی نوخیز جوانی میں تبدیل کر لیتی۔

چائے کی خالی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا "تمہارے نزدیک زندگی کس چڑیا کا نام ہے؟" میں ایسے اچانک حملے سے بوکھلا گیا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ایک نہایت ہی بونگا سا جواب جڑ دیا۔ "زندگی وہی ہے جو گزر جائے۔" میرا جواب سن کر اس نے طنزیہ لہجے میں کہا "بس وہی جو گزر جائے۔ کتنا اچھا خیال ہے ... اس کے علاوہ کچھ اور بھی تو ہو گی۔" میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا "آپ کا زندگی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ ہنس پڑی۔ پہلی دفعہ میں نے اس کے چہرے پر ہنسی کی لہر ابھرتی ہوئی دیکھی۔ کتنی بے ڈھنگی سی ہنسی تھی۔ اس کے جسم کا تمام کرب اس کے ہونٹوں تک پہنچ چکا تھا۔ وہ کہنے لگی "میں نے زندگی کو صرف محسوس ہی نہیں کیا، سونگھا بھی ہے اور چکھا بھی۔ اس میں طرح طرح کے ذائقے ہیں۔ ایک عجیب و غریب طرح کی ڈش ہے جس نے کھائی وہ بھی پچھتایا اور جس نے نہ کھائی وہ بھی۔" "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا زندگی صرف اسی چیز کا نام ہے؟" میں نے بات آگے بڑھائی۔ "نہیں نہیں۔" وہ فوراً بولی "زندگی وہ نہیں جو گزر جائے۔ زندگی وہ ہے جو گزاری جائے اور تم جانتے ہو میں نے زندگی کیسے گزاری ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بھڑک اٹھی "تم جانتے بھی کیونکر ...... تمہیں ضرورت بھی کیا تھی۔ آخر کیا رشتہ ہے تمہارا میرے ساتھ۔ کبھی تم نے مجھے اس قابل ہی نہ سمجھا کہ میرے ساتھ بات کرو ... تمام مرد خود غرض ہوتے ہیں ——— اپنے خول کے اندر انہیں کتنا سکون ملتا ہے۔ زندگی جیسے گندگی ہے گزار دیتے ہیں ......" وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گئی۔ میں خاموش بیٹھا اس کی باتوں کو سنتا رہا۔ سوچتا رہا کہ وہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے اور یہ میری خود غرضی ہی تھی کہ میرے دل میں اس کے لئے کبھی بھی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اس نے خود کو سمیٹنا شروع کیا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ "میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہہ دی ... شاید تمہیں میری باتیں بری لگی ہیں۔ آخر مرد ہو نا۔" "نہیں نہیں۔ آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ مرد ہمیشہ خود غرض رہا ہے۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس وقت مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میں کتنا خود غرض ہوں۔ اپنی کینچلی کے اندر رہ کر مجھے کتنا سکون ملتا ہے۔ لعنت ہے مجھ پر۔

چچی آپا مجھے ایک سخت پہاڑ کی طرح نظر آئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ فیکٹری میں ملازم تھا۔ وہ مزدوروں کی یونین کا صدر تھا۔ اس نے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے سرمایہ دار طبقے سے ٹکر لی اور تمام عمر ایک آہنی دیوار بنا رہا۔ تمام مزدور اس کے اشاروں پر کام کرتے تھے۔ اس کے اشارے پر ملوں میں تالا بندی ہو جاتی تھی۔ وہ مزدوروں کے لئے حسین خواب دیکھتا تھا۔ سرمایہ دار طبقے نے اسے خریدنا چاہا لیکن اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا۔ اور پھر ایک دن اسے قتل کے کیس میں ملوث کر دیا گیا۔ ملک کی اعلیٰ عدالت میں اس پر مقدمہ چلا اور پھر اسے پھانسی دے دی گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی کہانی سنا چکنے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "کیوں روتی ہو۔ رونے سے کوئی واپس تو نہیں آ جاتا۔" میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں اس کی موت پر نہیں روتی۔ اس نے ایک عظیم مقصد کے لئے جان دی۔ میں روتی اس لئے ہوں کہ ظالم سرمایہ دار طبقے نے مجھے اس کی صورت بھی نہ دیکھنے دی۔ "ظالم سرمایہ دار" . . . .
اس نے یہ کہا اور سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔ "تم میرا ساتھ دو گے۔ . . . میرے ساتھ چلو گے؟ آؤ اس تحریک کو دوبارہ زندہ کریں۔ اسے تازہ لہو کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا۔ میں خاموش رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے ہونٹ سی دیئے گئے ہوں۔ طرح طرح کی زنجیریں مجھے اپنے پاؤں کے گرد نظر آئیں۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے کہا "نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں مجبور ہوں۔ میں بک چکا ہوں۔" اور اس وقت مجھے اپنے جسم کا ہر ایک عضو علیحدہ علیحدہ نظر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ جا چکی تھی۔ فرش پر جگہ جگہ تھوک پڑا تھا۔

کئی روز چچی آپا نظر نہیں آئی۔ دفتر جاتے اور آتے وقت میری نگاہیں اسے تلاش کرتیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے تنہائی اختیار کر لی ہو۔ ویسے بھی وہ تنہا پسند تھی۔ تنہائی کا زہر اس کے جسم میں سرایت کر چکا تھا اور اب تنہائی ہی اس کے لئے تریاق کا کام کر رہی تھی۔ میں نے حویلی کے ملازم بشیرے سے پوچھا تو اس نے بتایا "صاحب جی۔ چچی آپا تو کئی دنوں سے بیمار ہے۔ بس ایک یا دو دن کی مہمان ہے۔ ہر وقت دروازے کی طرف تکتی رہتی ہے، جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔" مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کا سامنا کرتا۔ اسی طرح دو روز اور گزر گئے۔ بشیرے نے بتایا کہ ابھی ابھی ڈاکٹر چچی آپا کو دیکھنے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ چند منٹ اور زندہ رہے گی۔ میں بالائی منزل پر واقع چچی آپا کے کمرے کی طرف بھاگا۔ حویلی کے تمام مکین اسی کمرے میں جمع تھے۔ میں ہجوم کو چیرتا ہوا اس کے پلنگ کے پاس پہنچا۔ اس نے نفرت سے میری طرف دیکھا اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت میری طرف کر دی۔ جیسے لوگوں کو بتانا چاہتی ہو کہ اس کا قاتل میں ہوں۔ اس کے منہ سے خون کی پچکاری نکلی اور سر ڈھلک گیا۔ میں لوگوں کے نرغے میں ایک ایسے مجرم کی طرح کھڑا تھا جس پر اس کی موت کی فرد جرم عائد کر دی گئی ہو۔

فن اور شخصیت
تفصیلی مطالعے

ڈاکٹر وحید قریشی

"آئینہ ایام"..... ایک مطالعہ

"آئینہ ایام" کسی خاتون کی طبی ڈائری نہیں۔ کرنل غلام سرور کی آپ بیتی ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو جگ بیتی بھی ہے۔ انہوں نے اپنا کچا چٹھا، ہی بیان نہیں کیا دوسروں کے نفسیاتی تجزیے بلکہ پوسٹ مارٹم بھی کر دیئے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس عمل جراحی کے بعد ان لاشوں کو انہوں نے "مردہ خانے" میں نہیں پھینکا بلکہ ان کی نہایت اعلیٰ پیمانے پر تجہیز و تکفین بھی کی ہے۔ کفن دفن ان کا آبائی پیشہ نہیں۔ ان کے والد سکول کے استاد تھے۔ طب بھی ان کا مشغلہ نہیں تھا۔ اس لئے ان کا رشتہ ان کارآمد اور دولت خیز پیشوں سے نہیں ملتا، بلکہ دولت اور ثروت سے تو بالکل نہیں ملتا۔ نہ جانے کیوں ان میں جراح کی احتیاط نظر اور تشخیص کی مہارت فن پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی گورکنی کی ایک "شان تاج محلی" بھی ہے۔ وہ لفظوں کے نرم و ملائم سنگ مرمر سے حسین عمارت کی تعمیر کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ سختی اور نرمی کا امتزاج آئینہ ایام کے اسلوب کا امتیازی وصف بھی ہے۔ کوئی ماہر تعمیرات پتھروں کو موم کی سی نرمی دے کر جمالیاتی احساس کو بیدار کرتا ہے۔ اسی طرح ان کا یہ دھیما لیکن کھردرا اسلوب اپنی الگ شان رکھتا ہے۔ کہیں کہیں تو قاری کو یہ احساس ستانے لگتا ہے کہ ہو نہ ہو ان کے اجداد میں معماری کا کوئی نہ کوئی پیوند ضرور لگا ہے کیونکہ یہ اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے اصل بات کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ اور تھوڑی دیر ادھر ادھر بہک کر واپس منزل پر آ جاتے ہیں۔ ان میں اچھی نسل کے مویشیوں کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہی اپنے کھونٹے پر سر شام واپسی دوسرے اونچے اونچے درختوں یعنی قد آور شخصیتوں کے ساتھ تھوڑی چھیڑ خوانی یعنی منہ مار کر آگے نکل جانے کی عادت، تیسرے اپنی برادری یعنی ادیبوں کی نسل کے ہر جانور سے پیار اور چلتے چلتے زبان لطف سے اسے چاٹنے اور اس پر محبت نچھاور کرنے کی عادت، چوتھے اپنے سے بزرگ نسل خصوصاً استاد کی نسل سے والہانہ عشق۔ عشق بہرحال اندھا ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں کھرے کھوٹے کے فرق کو وہ زیادہ روا نہیں رکھتے۔ لیکن یہ ڈنڈی مار مروت، انہوں نے صرف اپنے استادوں تک محدود کر دی ہے۔ دوسروں کو معاف

نہیں کرتے۔ ان کی نرم گفتاری دوسروں کے پوست کندہ حال بیان کرنے میں خاص بے باک بلکہ بے رحم بھی ہے اور یہیں ان کے کمال فن کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا یہ دیہاتی پن ایک " بیلے جٹ " کی یاد دلاتا ہے جو ہمیشہ بکار خویشتن ہوشیار ہوتا ہے۔ پانچویں بعقت یہی بکار خویش والی ہے۔ یہاں بھی وہ نرے جٹ ' نکلے ہیں۔ یعنی اپنی ذات کی سنگار میز سجانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ خواہ مخواہ بقراط بننے کی کوشش نہیں کرتے، کھردرے اور دیہی لہجے کی مُبَنت سے انہوں نے صاف گوئی کا نیا طرز وضع کیا ہے۔ حلقہ یاراں میں اُن کی نرم مزاجی اور خلوص کو پسند کیا گیا۔ اور بزم اغیار میں بھی اُن کی صلح پسندی اور نرم گفتاری مقبول و محمود رہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں اگر بچے اور کھرے آدمی کو دشمن بھی برداشت کریں تو یہ سمجھو یہ شخص بڑا خوش نصیب ہے اور کسی نہ کسی دن منور اس کے دن پھر یں گے، اور کسی نہ کسی بڑے عہدے پر قابض ہو جائے گا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان میں بڑا آدمی بننے کے سارے لچھن موجود ہیں۔ ایسا آدمی دوستوں سے مار کھائے نہ کھائے دشمنوں سے کبھی مار نہیں کھاتا۔ اس کی نرم گفتار وہ دفاعی ہتھیار ہے جس کا استعمال کسی اجتماعی ضابطۂ تخفیف اسلحہ کی زد میں نہیں آتا۔ کرنل غلام سرور پیدائشی طور پر استاد اور پیشے کے اعتبار سے ایک فوجی ہیں۔ اعلیٰ نسل کے فوجی اور اعلیٰ نسل کے ادیب جس خطۂ جنت نشان سے آتے ہیں اسے جہلم کی وادی کہا جاتا ہے۔ اس میں مزاح نگاروں کی وہ " پیوند نسل " بھی ہے جس میں فوج اور ادب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ جفاکش ریاضت، نظم و ضبط کے ساتھ ساتھ حسِ مزاح کی موجودگی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اس اعتبار سے کرنل غلام سرور کے ہاں بھی ایک پورا نعمت خانہ موجود ہے۔ جہلمی مزاح نگاروں کے مزاح کی چستی کو وادی شاداب کا ثمر قرار دیتا ہوں۔ لیکن میرے ایک دوست اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ مزاح کا تعلق "جہلم" سے نہیں "بیگم" سے ہوتا ہے۔" اردو ادب پر بیگمات کے احسانات، کے موضوع پر ابھی کوئی تحقیقی مقالہ نہیں لکھا گیا، اس لئے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فی الحال حتمی طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کرنل محمد خان، میجر ضمیر جعفری اور دوسرے جہلمی پیوندی مزاح نگاروں کی مزاح نگاری کے محرکات میں بیویوں کے حقوق کا مسئلہ کبھی نہ کبھی آتا ضرور ہے۔ ہمارے یہ زیرک مزاح نگار اگر بیویوں کے بارے لب کشائی کر سکیں تو اصل محرکات بہ آسانی معلوم ہو سکتے ہیں۔ فی الحال تو ہم ان نیک بیبیوں کو سلام بھیجتے ہیں جن کی بدولت اردو مزاح نگاری کا بھرم قائم ہے۔ ہر اچھا مسلمان دوسرے مسلمان کے کام آتا ہے اور ان نیک بیگمات نے اپنے شوہروں پر جبر کر کے ادب پر جو احسان کیا ہے، اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس احسان کا بدل تو کوئی حکومت "خواتین ایوارڈ" دے کر پورا نہیں کر سکتی۔ نیک بیبیاں کو پتہ ہے کہ دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے اور گھروں کا حال ہمسایوں کو معلوم ہوتا ہے۔ کرنل غلام سرور اگر اپنے ادیب دوستوں کے گھریلو حالات پر روشنی ڈال سکیں تو یہ اردو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ ان میں شوہرانہ وفاداری کا وہ جوہر خاص موجود ہے، جس میں ہر اچھا سپاہی میدان جنگ میں برق و آہن بن جاتا ہے

ردِ بزم میں رہتی گھر کے اندر) قعرِ دریا سلسبیل و موجِ دریا آتش است کے مصداق جہلمی ادبا کی نجی زندگیاں ادب
ملامت اور مزاح کو حسنِ بیان کی جو نعمت دی گئی اس پہ ادب جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ باقی رہے ہمارے
نل غلام سرور تو جہاں انہوں نے آئینہ ایام میں اپنے بارے میں اتنا کھرا سچ بولا ہے اگر تھوڑا سا سچ دوسروں
ے بارے میں بھی بول دیں تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ ہم بھی اردو مزاح کے بارے میں کسی قدر
جہلم پسند" واقع ہوئے ہیں۔ اگرچہ ہمارا یا ہماری بیوی کا جہلم سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ
ردو ادب میں مزاح نگاری کا دورِ جدید ایک لحاظ سے جہلم کے ادبا کا دورِ جدید ہے۔ ادب کی جملہ ترقیاتی سکیموں
یا جہلم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وزارت سازی سے لے کر ادب سازی تک جملہ گھریلو صنعتیں جہلم ہی میں
بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ہمیں آغازِ جوانی کا تھوڑا سا زمانہ جہلم کی سیر کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ضمیر
جعفری نے جنگی نظموں کا مجموعہ "کارزار" شائع کیا تھا اور اس کے سہارے فوج میں بھرتی ہونے کی کوشش کر رہے تھے
ان میں اور مزاح نگاری میں ابھی کئی منزلوں کا فاصلہ تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ مزاح
ے کھکیڑ میں نہیں پڑے تھے۔ اس زمانے میں ایک شاعر نرالا، تخلیقی محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا۔ جو اپنے سر پر کاغذی اونچی دیوار کی ٹوپیا
سجاتا تھا جس پر کئی رنگ ہوتے۔ وہ اپنے مضحک لباس اور بے وزن اشعار سے شاعروں کو گرماتا تھا اور لوگ اس مزاح پہ
جان دیتے تھے۔ اصل میں اپنے آپ پر دوسروں کو ہنسا کر خوش ہونے کی روایت جہلم سے خاص تھی اور خاص حصہ میں آتی
ہے۔ نرالا کی دیوانگی میں کسی عورت کا ہاتھ تھا یا نہیں، اس کی اطلاع نہیں تھی۔ لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ مزاح کی
قدر دانی کا ایک خاص سلیقہ سرزمینِ جہلم کو حاصل ہے جو نرالا کی دیوانگی سے لے کر کرنل غلام سرور کے "بیلے پن" تک
کو برداشت ہی نہیں کرتی، اس کی قدر دانی بھی کرتی ہے۔ اور یہ مال دساور کو بھی بھیجا کرتی ہے۔ آج کل اس طرح کے مال کی
سب سے بڑی منڈی اسلام آباد ہے جہاں اکیڈمی آف لیٹرز سال میں ایک بار ادب کا میلۂ مویشیاں منعقد کرتی ہے اور عمدہ
"ہمارو" غیر ممالک کو نمائش کے لئے روانہ کرتی رہتی ہے۔ ادبائے جہلم کو قدرت کی طرف سے ملکۂ خاص حاصل ہے
کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ کرنل غلام سرور کو ہم نے "پھلتے اور میجر ضمیر جعفری کو "پھولتے" اپنی
آنکھوں سے دیکھا ہے۔

کرنل غلام سرور کی ادبی زرخیزی کا سبب ان کا قیام راولپنڈی ہے کسی دوسرے شہر میں ہوتے تو اتنے بارآور کبھی
نہ ہوتے۔ کیونکہ ان کے علم و فضل اور روانیِ قلم کے لئے آس پاس کی سرسبزی ضروری ہے۔ آس پاس اچھا ہو تو ان کا
قلم بھی برق رفتاری سے چلتا ہے۔ ڈیفنس لائبریری میں بیٹھ کر وہ انتظامی امور ہی نہیں نپٹاتے ادبی امور بھی
پہ سرعت ٹھکانے لگاتے رہتے ہیں۔ کتابیں ادیب کی مرغوب غذا ہیں، یہ غذا ان کی تندرستی کے لئے بہت ضروری
ہے۔ اگر کسی دوسرے شہر میں ہوتے جہاں دونوں لذتیں میسر نہ ہوتیں تو ان کی تخلیقی صلاحیتوں میں ضعف آ جاتا۔ ایسے

عض نصیب درخت کم ہوتے ہیں جو بہت فاصلے سے اپنی غذا کشید کر کے سدا بہار رہتے ہیں۔ بے دے کر
مارے اشفاق احمد بھی جن کا قیام لاہور میں اور جڑیں اسلام آباد میں ہیں وہ تن آور درخت بن گئے ہیں۔ اور ان کی
بی کارکردگی آس پاس کی پرورپرداخت کی محتاج نہیں رہی۔ غلام سرور کی زندگی نمود و نمائش سے خالی ہے، جہد مسلسل
زندگی ہے۔ انہوں نے اپنی قوتِ بازو سے اپنا مستقبل بنایا ہے اور اپنے ہی تیشے سے جوئے شیر نکالی ہے۔ جوش کی
طرح انہوں نے زندگی کی محرومیوں کا انتقام نہ اپنے آپ سے نہ معاشرے سے لیا ہے۔ آئینہ ایام میں تو آپ کو سترہ عشقیہ
استانوں کی طرز کا کوئی ایک معرکہ بھی نہیں ملے گا۔ وہ شاید اس میدان کے مرد ہی نہیں۔ اخلاقی قدریں کسی ہوٹی جیکیٹ
ن کر اگر انسانی روح کو پامال کرنے لگیں تو اس سے عشق کی اصلی اور فرضی داستانیں وجود میں آتی ہیں۔ لیکن اگر انسان کرنل
لام سرور کی طرح مطمئن مبنی زندگی بسر کر رہا ہو تو اخلاقی ضابطے روحانی غذا کا کام دیتے ہیں۔ غلام سرور کے ہاں حرارت
یمانی اور اطمینانِ قلب کی دولت کا ذخیرہ وافر موجود ہے۔ اس لئے احسان دانش کی طرح ان کی زندگی دوسروں کیلئے ایک
سبق بھی ہے اور جدوجہد کا پیغام بھی۔

ان کے ہاں مبلغین کا جوش و خروش نہیں، ایک دھیما پن ہے۔ استدلال میں مزاح کی ہلکی ہلکی آمیزش رکھتے ہیں۔
وہ اس گُر سے واقف ہیں کہ ہر واقع اور حقیقت کے درمیان فرق ہے۔ اور حقیقت نگاری تخیل کے عنصر سے خالی
نہیں ہوتی۔ اس لئے بعض تنقید نگاروں کی رائے ہے کہ اچھے ادب کے لئے تھوڑا سا جھوٹ بھی ضروری ہے۔ کرنل غلام
سرور واقعات کے بیان میں تخیل کی آمیزش کو شامل رکھتے ہیں اور یہ ان کے کمالِ فن کا ثبوت ہے۔ کتاب کا آغاز
انہوں نے اسی طرح کی افسانہ طرازی سے کیا ہے۔ بڑے بڑے آدمیوں کی پیدائش پر بشارتوں کا ظہور عموماً دیکھنے میں آیا
ہے۔ کرنل غلام سرور بڑائی کا دعویٰ تو نہیں کرتے۔ لیکن ان کی پیدائش کے سلسلے میں مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے۔

"اللہ بخشے خالہ جان ایک خواب کا ذکر مزے لے لے کر کرتی تھیں۔ یہ خواب اس جانب سے متعلق ہے آپ
بھی سن لیجئے۔ خالہ جان خواب میں کیا دیکھتی ہیں ایک باریش بزرگ سراپا سبز لباس میں ملبوس، ہاتھوں
میں کشکول لئے ہمارے گھر وارد ہوتے ہیں۔ اور با آوازِ بلند ابا جان سے راہِ خدا حسبِ توفیق نذر طلب
کرتے ہیں۔ ادھر والد صاحب کسی گہری سوچ میں غلطاں ہیں۔ انہیں درویش کی آمد کا علم ہی نہیں ہو پاتا
مگر جب درویش کی آواز میں شدت اور خفگی ابھرنے لگتی ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں اور حسبِ توفیق
درویش کو نذرانہ پیش کرنے کے بعد پھر گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ سائیں بابا والد صاحب کی پریشانی
کا سبب پوچھتے ہیں۔ ابو بہت لیت و لعل سے کام لیتے ہیں۔ مگر قبلہ کا اصرار غالب آ جاتا ہے۔ ناچار والد
صاحب اپنی داستانِ غم یوں بیان کرتے ہیں۔

اے اللہ کے نیک بندے تو نے میرے دل کے زخمی تاروں کو چھیڑ ہی دیا ہے تو سن، مجھے اللہ نے

دو بیٹے عطا کئے تھے۔ ایک تین سال کی عمر کو پہنچ کر مجھے داغ مفارقت دے گیا، دوسرا بچہ بن کھلے مرجھا گیا۔ پیدائش کی چند ساعتوں کے بعد اس نے آنکھیں موند لیں۔ اب میرے لئے دنیا اندھیر ہے بیٹوں کی جدائی مجھے نڈھال کئے ہوئے ہے۔ مرد درویش بڑے غور اور توجہ سے یہ باتیں سنتے ہیں۔ پھر معاً ان کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہی تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد یوں گویا ہوتے ہیں۔ بھائی فکر مت کر اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے صدقے اور نیک بندوں کی دعاؤں کے طفیل تجھے ایک بیٹا عطا کرے گا۔ جو بڑے نصیبوں والا ہوگا۔ وہ بڑا نیک اور سعادت مند ثابت ہوگا، اور تیرے خاندان کو چار چاند لگائے گا۔ جا اٹھ نماز پڑھ۔ اللہ کی راہ میں خیرات دے۔ تیرے نصیب جاگ اٹھے ہیں والد صاحب نے یہ باتیں سنیں تو ان کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھل اٹھی۔ طبیعت شاداب ہو گئی۔ جی میں آیا سائیں بابا کی کچھ خدمت کی جائے، آنکھ اٹھا کر دیکھا تو غائب تھے...... اور بزرگ کی بشارت کے مطابق ۱۳؍ ستمبر ۱۹۲۸ء کی رات ایک چاند کا ٹکڑا تشریف فرما ہوا۔"

کرنل صاحب کی خالہ نے سچ بولا تھا یا نہیں، مجھے اس سے سروکار نہیں۔ اس میں بنیادی صداقت یہی ہے کہ دیہات کے اس ہونہار لڑکے نے شہر میں آکر سبزی ترکاری بھی فروخت کی۔ اپنی محنت سے اپنی دنیا تخلیق کی اور جدوجہد اور عمل پیہم سے اس درجے تک پہنچا جس پر آج بھی اس کے گاؤں والے فخر کر سکتے ہیں۔ سعادت مند بیٹے کی سعادت مندی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ اس نے اپنے ماضی کو فراموش نہیں کیا اور اپنے دوستوں سے چھپایا بھی نہیں۔ اسے اپنی عزت پر ناز ہے اور اپنی ترقی کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا ایک ادنیٰ کرشمہ جانتا ہے۔ اس کی حوصلہ مندی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ بڑے بڑے طوفانوں میں اس نے اپنے اعصاب کو برقرار رکھا، اور منفی قوتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ صاف گوئی کا یہ عالم کہ مار بھی کھاتا ہے پھر بھی سچ سے باز نہیں آتا۔ لیکن اگر کسی کمزور ایمان کے آدمی کے بیٹے کو سچ بولتے دیکھتا ہے تو اسے اپنا حریف جان کر معاف بھی نہیں کرتا۔

"بات ہیڈ ماسٹر رؤف ہاشمی صاحب کی ہو رہی تھی...... ہاشمی صاحب باتوں کے بڑے دھنی تھے۔ بولتے تو محفل پر ان کی گھن گرج کا سکہ بیٹھ جاتا۔ اکثر اوقات صبح کی اسمبلی سے خطاب فرماتے۔ مجھے اس ضمن میں رمضان شریف کی ایک صبح کبھی نہیں بھولے گی، میں اپنے گھر سے نکل کر سکول آ رہا تھا کہ راستے میں ان کے صاحبزادے سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ میں نے پوچھا ابو کیا کر رہے ہیں، مصلحت کے تقاضوں سے بے نیاز معصوم بچہ بولا سر! ناشتہ کر رہے ہیں۔ ابو تھوڑی ہی دیر میں سکول آنے والے ہیں۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہاشمی صاحب کی تقریر دلپذیر یوں شروع

ہوتی ہے۔ پیارے بچو! اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر روزے فرض کئے ہیں جس
طرح پہلی امتوں پر فرض کئے گئے تھے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے یاد رکھو
روزے کا تارک جہنمی ہے۔ قیامت کے روز اسے سخت ترین عذاب سے
دوچار ہونا پڑے گا۔ ہاشمی کے ارشادات جاری تھے۔ ادھر میرے کانوں میں
ان کے بیٹے کی صدا گونج رہی تھی ...... ابو ناشتہ کر رہے ہیں۔

ابو کا ناشتہ کرنل صاحب کے مطالعۂ انسان کا مرکزی نقطہ ہے۔ انہوں نے آئینہ ایام میں اس طرح کی شخصیتوں کا نقشہ خوب خوب درج کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر انسانی نفسیات کی تصویر کشی کے ماہر ہیں۔ کتاب کا یہ جگ بیتی والا پہلو نمایاں ہے۔ انہوں نے تصویر کشی میں رعایت برتی ہے تو صرف اپنے ماں باپ کے بارے میں، ماں باپ بہن بھائی عتاب سے خارج ہیں۔ اور دوسرے لوگ ابو کا ناشتہ ہیں۔ ان پر بے دریغ ہاتھ صاف کیا جا سکتا ہے۔ بزرگوں میں عیب نکالنا سعادت مند بیٹوں کو زیب نہیں دیتا۔ ہاں استادوں پر اگر ایک آدھ ہاتھ اٹھا بھی پڑ جائے کچھ حرج نہیں۔ یہاں صاف گوئی زیب دیتی ہے۔

ع زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

غالب نے یہ بات ہیکی ٹولی کے بارے میں کہی تھی۔ کرنل صاحب نے اسے اپنے استادوں پر ڈال دیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف بی ایڈ کے زمانے میں ان کے استاد تھے۔ ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

موصوف کتابی باتیں ذرا کم ہی کرتے۔ اپنے تجربات زیادہ شرح و بسط کے
ساتھ بیان کرتے۔ تجربات سناتے وقت لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہ تھے
گاہے گاہے پاسبانِ دل کو تنہا چھوڑ دیتے۔

ان جملوں کی بلاغت کا اندازہ وہی جانتے ہیں جنہوں نے ڈاکٹر عبدالرؤف کو دیکھا ہے یا ان کے ملفوظات سنے ہیں۔ کرنل صاحب استادوں کے سامنے کسی قدر محتاط ہیں لیکن دوستوں کے سلسلے میں زیادہ "منہ پھٹ" واقع ہوئے ہیں۔ بریگیڈیئر اعجاز کے بارے میں ان کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

اعجاز صاحب کے مزاج میں بڑی بیقراری پائی جاتی ہے، جو کام سکون اور
حوصلے سے کیا جا سکتا ہو اس میں بھی اضطراری اور ہیجانی صورت کا مظاہرہ
کرتے ہیں۔ بڑے صاحب کی طرف سے بلاوا آجائے تو یہ اُن کی خدمت میں چل
کر حاضری دینے کے قائل نہیں۔ بھاگ کر آداب بجا لانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔
صاحب کی کسی بات سے اتفاق کرنا مقصود ہو اور وہ سو فی صد معاملوں میں

ہوتا ہے) تو ان کے بدن کا ہر عضو سراپا داد بن کر ابھرتا ہے، ان کی مہربانیوں کو ان اداؤں میں خوشامد کی بُو آتی ہے۔ ویسے حق یہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس طرح کی دلچسپ ادائیں تو ان کی شخصیت کا لازمہ ہیں۔ اعجاز صاحب کے مزاج کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ کام کرنے کے بعد اس کی تشہیر کا پورا پورا انتظام بھی کرتے ہیں۔ اس طرزِ عمل میں ذاتی نام و نمود کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ ان کی اصل خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی ان کی کارکردگی اور ان کی محنت اور ان کے جذبے کی لگن کے قائل ہو سکیں۔ افسوس ان کی یہ ادا بھی ہمارے کئی ساتھیوں کو نہیں بھاتی۔

آپ بیتی کا مرکزی زاویہ بھی کرداری مطالعہ ہے۔ پوری داستان میں جو شخصیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں ان میں ایک ہی مخصوص وضع ہے۔ ہر شخصیت کے دو چار نمایاں پہلو ہے کر انہیں اپنے نیم سنجیدہ پیرائے میں بیان کرتے جاتے ہیں، جس سے زندگی کی رنگا رنگی کا احساس بھی ہوتا ہے، اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ آپ بیتی لکھتے ہوئے صرف اپنے آپ کو مرکز کائنات ظاہر کرنے کی فکر میں نہیں، بلکہ آس پاس کی وسیع کائنات میں ان کی دلچسپیاں، معمولی واقعات میں نہاں حقائق کے بارے میں فلسفیانہ رویّہ، زندگی سے گہری دلچسپی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی بالادستی کا احساس، زندگی کو اوروں کے لئے قابلِ قبول بنانے کی مسلسل سعی اور دوسروں کے لئے قربانیاں دینے کا شعور، ان کی ذات کے وہ داخلی تار و پود ہیں، جن سے انہوں نے اس آپ بیتی کی دنیا سجائی ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں اس ہیولیٰ کی صورت دکھائی نہیں دیتے جس کے سینگ پر ساری کائنات کھڑی ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو اس وسیع کائنات میں ایک فرد کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جو سارے زمانے کی خوشیاں سمیٹ کر دوسروں کے حوالے کرتا ہے اور اپنے غم ہی اکیلے برداشت کرنے کی کوشش میں مبتلا رہتا ہے، وہ اپنی خامیوں سے بھی آگاہ ہے، اور انہیں چھپانے یا ان کی تاویل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز ہی سے صرف فراز ہی سامنے نہیں لاتا، نشیب کی باتیں بھی کرتا ہے۔ اپنے مذہبی اور سیاسی عقائد کے بارے میں جو تبدیلیاں اس کے ہاں آئیں ان کی روداد بڑی دلچسپ ہے۔ یہ دیہاتی جب ہیلی کے ڈی اے وی کالج میں داخلہ لے تو اسے خالہ جان ہی سے نہیں، لینن اور مارکسی ادیبوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ اس کی روداد اپنی زبانی سنئے

> آپ کو ہسٹری کے کلاس روم میں لے چلوں جہاں پروفیسر شرما صاحب اپنے طلبا کو کلاس ٹسٹ کے نتائج سے آگاہ کر رہے ہیں۔ لیجئے میرا نام پکارا جاتا ہے۔ اللہ خیر جانے پٹاری کھلنے پر کیا چیز برآمد ہوتی ہے۔ بدولت تو پوری کلاس میں اوّل آ گئے۔ کوئی فلوک (FLUKE) لگ گیا ہوگا۔ پروفیسر شرما مجھے انتہائی غور سے

دیکھتے ہیں۔ سراپے کا جائزہ لیتے ہیں۔ اور میرے پچکے ہوئے گالوں، زرد چہرے اور دھنسی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگاتے ہیں کہ فرسٹ آنے والا یہ لڑکا ضرور افلاس اور بدحالی کا شکار ہوگا۔ ان کا جذبۂ ترحم ابھرتا ہے جس کے نتیجے میں ہم ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ موصوف مجھے کالج سے وظیفہ دلوانے کے ساتھ ساتھ میری ذہنی نشوونما پر بھی خصوصی توجہ دینے لگتے ہیں۔ اور جب میرے مالی حالات کا صحیح صحیح علم ہوتا ہے تو وہ مجھے شہر میں واقع ایک لائبریری میں لے جاتے ہیں۔ پانچ دس روپے کی زرِ ضمانت اپنی جیبِ خاص سے ادا کرتے ہیں۔ اور ماہانہ چندہ کی رقم ایک سال کی یکمشت دے کر ہمیں اس لائبریری کا باضابطہ رکن بنوا ڈالتے ہیں۔ بہت بعد میں راز کھلتا ہے کہ پروفیسر شرما کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہیں اور جس لائبریری کا مجھے رکن بنایا گیا ہے وہ مقامی کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اہتمام چلتی ہے۔ میں باقاعدگی کے ساتھ لائبریری کا چکر لگایا کرتا وہاں ایک عمر رسیدہ انسان سے بڑی مڈبھیڑ ہوا کرتی جسے اس کے حلقہ بگوش دادا کہہ کر پکارتے۔ یہ دادا بڑا گرگِ باراں دیدہ تھا۔ ہر آنے جانے والے سے فوراً گھل مل جاتا۔ اور کسان مزدور کا غم بڑی دلسوزی اور غم گساری سے کھایا کرتا۔ بات کسان مزدور سے نکل کر ہیگل، مارکس اور لینن کے اردگرد گھومنے لگتی۔ یہ عمل بڑی تیزی سے دہرایا جاتا۔

دادا جان اپنے پوتے یعنی خاکسار پر خصوصی توجہ فرمایا کرتے۔ کمیونسٹ عام حال پاکر بہت شاد ہوتے۔ اس مال کو وہ مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ دادا جان اکثر کہا کرتے کامریڈ فکر مت کر کسان مزدور کو اب زیادہ دیر محکوم نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ ڈھیر سارے بھاری بھرکم الفاظ استعمال میں لاتے۔ بورژوا، پرولتاری، DIALACTICAL MATERIALIS اور اس طرح کے کئی بوجھل الفاظ میں سمجھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا دیتا۔ وہ سمجھتے شکار تیزی سے زیرِ دام آ رہا ہے۔ لیکچر ختم ہوتا تو چائے سے جس کے اوپر بالائی کی گہری تہیں جمی ہوتیں میری اور دیگر حاضرینِ مجلس کی تواضع کرتے۔ ہم سمجھتے سر جانے کے عوض اگر دودھ ملائی مل جائے تو یہ کون سا مہنگا سودا ہے۔ لوگ تو روٹی کپڑے کے جھانسے میں اپنا ایمان تک داؤ پر لگا ڈالتے ہیں۔

"جون ۱۹۴۷ء میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گاؤں چلا آیا تھا اسی دوران میں پاکستان خدا کے فضل سے وجود میں آ گیا۔ تین اگست کو میں گاؤں سے لوٹ کر آیا تو دیکھا گرڈن کالج ویرانے کا منظر پیش کر رہا ہے۔ میں سخت پریشان تھا۔ میں نے پروفیسر شرما کی وساطت سے دو نئی کتابیں دادا لائبریری سے مستعار لے رکھی تھیں۔ ایک دن انہیں لوٹانے لائبریری چلا گیا۔ دیکھا تو وہاں دادا غائب؟ اس کی کرسی پر ایک اور نوجوان براجمان ہے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا حال دل نوجوان کو کہہ سنایا۔ اور وہ میری باتیں بڑے غور سے سنتا رہا۔ آخر میں نوجوان یوں گویا ہوا۔ برخوردار میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ تم تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہو، تسلی رکھو تمہیں یہ موقع ضرور فراہم کیا جائے گا۔ تم کل صبح ۱۰ بجے گارڈن کالج پہنچ جاؤ، اور وہاں آ کر پروفیسر خواجہ مسعود کا پتہ کر لینا۔ میں آج اُن سے تمہارے بارے میں ذکر کر دوں گا۔ شدتِ جذبات سے کچھ یوں مغلوب ہوا کہ اپنے محسن کا نام پوچھنا بھول گیا۔ ٹھیک دس بجے میں کالج کے احاطے میں داخل ہو چکا تھا۔ چپڑاسی مجھے خواجہ مسعود کے کمرے میں لے گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ وہی صاحب جو کل دادا کی لائبریری میں میری ڈھارس بندھا رہے تھے، وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ خواجہ کی کرم فرمائی سے میرے داخلے کا مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہو گیا۔ ہوسٹل میں بھی سیٹ مل گئی، درسی کتابوں کا بنڈل بھی بلا معاوضہ مجھے فراہم کر دیا گیا۔ اور یہ کام چند گھنٹوں کے اندر اندر مکمل ہو گیا۔"

کرنل غلام سرور مسلم لیگی خیالات، احراری عقائد، مارکسی تصورات، پرویزی رجحانات اور جماعت اسلامی کے سیاسی و دینی مسلک کے بارے میں بہت کھل کر باتیں کہتے ہیں۔ یہیں سے اُن کے اور ان کے دوستوں کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ سعادی رضوی، انور راہ اور بعض دوسرے ساتھی اپنی اپنی راہوں پر نکل گئے۔ سرور کے عقائد زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر درویشی کی منزل تک جا پہنچے۔ اردو ادب کا مرد درویش نئے تجربات سے دوچار ہوا۔ واقعات کی بھٹی سے نکل کر انسان یا تو مومن ہو جاتا ہے یا پھر شیطان۔ کرنل سرور کے لئے کوئی درمیانی راہ اختیار کرنی مشکل ہی نہیں ممکن بھی نہ تھی۔ کرنل غلام سرور مومن ہے یا ابلیس، ان سے پوچھا جائے تو وہ از راہ انکسار یا از راہ راست گوئی یہی کہیں گے میں تو گنہگار انسان ہوں۔ مجھ میں اتنی بلندی کہاں۔ راقم الحروف جو ان کی صاف گوئی کا قائل ہے وہ تو فوراً اس راست بازی پر ایمان لے آئے گا لیکن دنیا کسی کے سچ کو سچ کب مانتی ہے۔ وہ انہیں مومن بنا کر چھوڑے گی۔ اور پھر ان کی پیدائش پر علماء نے بشارت بھی تو دی تھی۔

کتاب کا خالق اپنے پڑھنے والوں سے گواہی مانگتا ہے، کوئی ہے جو سلطانی گواہ بن کر ان کی عظمت کی گواہی دے سکے۔

ڈاکٹر انور سدید

صدیق سالک کی مزاح نگاری

اب تو اسے محض اتفاق کی بات کہنا شاید مناسب نہیں کہ پاکستانی ادب کے حالیہ دور میں جتنا اچھا مزاح
جیوں نے پیدا کیا ہے۔ اتنا مزاح زندگی کے دوسری شعبوں کے ادیب پیدا نہیں کر سکے۔ بلاشبہ فوج کی کرخت عملی زندگی
یقت کا ہموار تسلسل، صورتِ واقعہ پر مستقیم زاویئے سے دیکھنے کا انداز، میکانکی تربیت اور کرخت سنجیدگی پر ایک طویل عرصے تک
مگی کے دور کے تمام شعبے ہنستے مسکراتے اور طنز و مزاح سے لیس جملے کہتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس حلقے سے جو مخصوص قسم
زاح پیدا ہوا ہے بالعموم "وردی والوں کا مزاح" کہا جانے لگا اور بعض رسائل نے تو اسے نمایاں طور پر شائع کرنا بھی
شروع کر دیا۔ اس تسمیہ کے پس منظر سے بھی طنز کی جراحت نمایاں طور پر ابھرتی ہے۔ تاہم یہ اس دور کی بات ہے جب
طرہ پر سکون تھا اور فرد زندگی کی ناہمواریوں سے اکتا کر تنوع کا متلاشی تھا۔ اب معاشرہ بجلی کے تار پر سفر کر رہا ہے
بد ترین اضطراب کی زد پہ آیا ہوا ہے۔ فرد ہر لحہ کروٹ بدلتی اور مسائل میں الجھی ہوئی زندگی میں عافیت کے سانس کو
رہا ہے۔ اب اسے ہموار اور مستقیم زندگی گزارنے والوں پر نظر ڈالنے کی فرصت ملا تو کجا خود اپنی صعوبتوں کے بھارے
نکلنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے عصر اور معاصر کے بارے میں ہمدردانہ رویہ پیدا کرنے کے
لئے نہ صرف خود جراحتی کا شکار ہے۔ بلکہ معاشرے کو بھی خاردار جھاڑی کی طرح استعمال کر رہا ہے۔

اس دور میں معاشرتی اور سیاسی سطح پر جو پست درجے کا تصادم عمل میں آ رہا ہے اس نے بالعموم تحفظات کا
نا پیدا کیا ہے۔ فرد کسی محفوظ خول میں سمٹتا چلا جا رہا ہے وہ اس کمیں گاہ میں بیٹھ کر دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھ
ور طنز کی شدید ترین ہیئت سے نہ صرف کردار کشی کرتا ہے۔ بلکہ نفرت کی تبلیغ عام کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے
شرہ اب حالات کی جس نوعیت سے دوچار ہے۔ خود اس میں ناہمواریوں کی مقدار خاصی زیادہ ہو گئی ہے۔ اور
رل کو جنہوں نے طویل تربیت یافتہ زندگی گزاری ہے اور معاشرے کو ہموار نظر سے دیکھتا ہے تو محسوس کیا ہے کہ
شرے کی موجود ناہمواریوں کو ہدف بنائیں اور سماجی بحران کے اس دور میں فرد کو اپنی ہیئت کذائی دیکھنے اور اس

ہنسنے کا موقع دیں۔

صدیق سالک کی مزاح نگاری نے معاشرتی اضطراب کے مندرجہ بالا پس منظر سے ہی جنم لیا ہے۔ ان کا تعلق اسلوبیاتی طور پر اس طبقے سے ہے جو ایک طویل عرصے تک دنیا بھر کے مزاح نگاروں کو موضوعِ مزاح اور سامانِ انبساط فراہم کرتا رہا ہے۔ تاہم دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ صدیق سالک نے اپنے فن میں مزاح نگاری کی اس روش کے خلاف کسی طبقاتی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ گھٹن، جبریت اور ناہمواریوں کے اس دور میں انہوں نے مزاح لکھ کر فرد کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ چند لمحے مسکرا کر اپنے متورم پھیپھڑوں کو آکسیجن کی وافر مقدار فراہم کر دے۔ صدیق سالک کا ایقان ہے کہ "حالیہ مردم شماری سے پتہ چلا ہے کہ ملک میں فی مربع میل آبادی بڑھ گئی ہے لیکن ...... فی کس مسکراہٹیں کم ہو گئی ہیں" لہٰذا مسکراہٹوں کی افزائش ایک سماجی ضرورت تھی۔ جسے صدیق سالک نے قومی فریضہ سمجھ کر سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔ اور اس عمل میں انہوں نے ناراضگی کی تیوریوں کو اس خوبی سے زیرِ سطح رکھا ہے کہ یہ مسکراہٹوں کے سطح پر غالب نہیں آ سکیں اور جب فرمان ہے کہ جب آفریں مضامین پڑھ کر جاتی بوجھتی معنی خیز مسکراہٹ سے عاری ہو جاتا ہے تو قہقہہ دیوارِ وطن توڑ کر ممالکِ محصورہ میں داخل نہیں ہوتا۔ ان کے مزاح سے نہ صرف زندگی کے بعض گم شدہ زاویے ہی ابھر آتے ہیں بلکہ اکثر اوقات زندگی کے المیہ گوشوں کو بھی روشنی مل جاتی ہے اور یوں ان کا مزاح انبساط کی افزائش کا باعث بھی بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ "خالص مزاح کا فروغ سکون و عافیت کی فضا کے تابع ہوتا ہے۔" لیکن صدیق سالک کے ذیل میں دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے جس دور میں مزاح لکھا اس میں سکون و عافیت کے نقوش نسبتاً کم ہیں اور معاشرہ شدید ترین ذہنی تشنج اور قلبی آزار میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یہ تشنج بیشتر ان معاشی، معاشرتی اور سیاسی کرداروں کا پیدا کردہ ہے جن کی لغزشیں نہ صرف فکری بحران پیدا کرتی ہیں بلکہ احساس سطح پر بھی عامۃ الناس کو متاثر کرتی ہیں۔ صدیق سالک بھی اسی معاشرے کا فرد ہے۔ عامۃ الناس کے ساتھ وہ بھی سماجی اضطراب کی زد میں ہیں۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحت مند مزاح نگار کی حیثیت میں ان کے پاس ایک سیفٹی والو بھی موجود ہے۔ وہ اس والو سے نہ صرف معاشرے کا بخار ناپتے ہیں بلکہ اسے خارج کرنے کی کاوش بھی کرتے ہیں۔ مزاح نگار کے طور پر ان کے خارج کی دنیا اور داخل کی دنیا کے مابین ایک واضح حدِ امتیاز موجود ہے۔ انہوں نے اپنے ذہن کا دریچہ اوّل خارج کی دنیا میں کھول رکھا ہے چنانچہ وہ اضطراب کی وقتی کیفیت سے ہی گزرتے ہیں اور ان پر زیرِ خند کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں جن موضوعات نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچی ان میں مارشل بیوروکریسی، اقتدار، جمہوریت وغیرہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور ان موضوعات میں انہیں سماجی ناہمواریوں کی کثرت بے انداز نظر آتی ہے۔ وہ اس کثرت کو ناخیالی وحدت میں پرونے اور فرد اور معاشرے کو اس وحدت کے جوڑ توڑ کا مشورہ نہیں دیتے بلکہ ہوشیاری اور ہنرکاری سے ان موضوعات کے بطون

میں چھپے ہوئے مسکراتے گوشوں کو ابھار کر قاری کو ان کے فکری زاویوں پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات بالخصوص متاثر کرتی ہے کہ انہوں نے ایک کھڑکی اپنے اندر بھی کھول رکھی ہے اور جب وہ اندر کی دنیا کا نظارہ کرتے ہیں تو اضطراب اور تشنج کی کیفیت سے دوچار نہیں ہوتے بلکہ ایک ایسے مطمئن انسان نظر آتے ہیں جو معاشرے کی ناہمواریوں پر اپنے پیار کے پھاہے ان کے بہجت آفریں زاویوں کو ہمارے سامنے فخر و امتنان سے پیش کر سکتے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ صدیق سالک نے مزاح میں معاشرے کی بے شکلی کو تو موضوع بنایا ہے لیکن مزاح کو نکھارنے کے لئے چہرہ کو بگاڑنے کی کوشش نہیں کی اور صدیہ ہے کہ ان کے ہاں لفظ کی حرمت اور اس کا تقدس بھی مجروح نہیں ہوتا۔ رعایتِ لفظی سے فائدہ اٹھانے کا رجحان بھی ان کے ہاں مخفی صورت میں ہی ملتا ہے اور اس سے انہوں نے بلاشبہ فائدہ اٹھایا ہے لیکن وہ لفظ کو محض تفنن کے لئے منتخب نہیں کرتے بلکہ ہر لفظ کے گرد احساس کے موجود دائرے کو انداز دیگر کھولنے کی دعوت دیتے ہیں ان کا داخلی اطمینان ان کی کشادہ نظر کا مظہر ہے اور یوں انہوں نے اپنے مزاح سے انسان کو بداعتمادی سے بچانے کی سعی کی ہے مثال کے طور پر اس حقیقت کو دیکھئے کہ انہوں نے سیاست پر پابندی کے دور میں سیاست کو موضوع بنایا ہے لیکن اس چوکھٹے میں کہیں بھی سیاست دان کا چہرہ ابھرنے نہیں دیا۔ "مارشل لاء" اس دور کی موجود حقیقت ہے ایک ایسی حقیقت جس پر مارشل لاء لگوانے اور چلانے والے بھی محبت کی نظر نہیں ڈالتے لیکن جب ایک مطمئن مزاح نگار اس پر نگہ ڈالتا ہے تو وہ اسے بھی تحصیلِ مسرت کا وسیلہ بنا لیتا ہے اس ضمن میں مندرجہ اقتباسات ملاحظہ کیجئے جن میں موجود کو ایک نئی کروٹ دے کر مسکراہٹ کو ابھارنے کی کامیاب کاوش کی گئی ہے۔

مارشل لاء ایک ایسا مہمان ہے جو کبھی بن بلائے نہیں آتا۔ کبھی حالات شور مچا مچا کر اسے آواز دیتے ہیں اور کبھی باہر والے اسے ٹیلی فون کرتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ یہ مہمان در و دیوار سے پوری طرح مانوس بھی نہیں ہو پاتا کہ اسے ترکِ کرنے کو کہا جاتا ہے یہ سراسر مہمان کی ناقدری ہے۔ ناقدری کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ مہمان بطور مہمان ہی قابلِ احترام ہے جب یہ گھر کا مالک بننا چاہیے تو خود بخود احترام کھو بیٹھتا ہے۔"

"مارشل لاء پاکستان جیسے ملک کے لئے بہت اچھی چیز ہے اس کے استعمال سے وقتاً فوقتاً پتہ چلتا ہے کہ یہاں ایک مارشل ریس (MARTIAL RACE) بستی ہے یہ سچ ہے کہ بعض کمزور دل قومیں مارشل لاء کے نام سے کانپ اٹھتی ہیں کیونکہ سمجھتی ہیں کہ وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں لیکن ہم اس بوجھ کو بوجھ نہیں احسان سمجھ کر بار بار اٹھاتے ہیں اور اس کے لئے ہمیشہ زیرِ بار رہتے ہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ ان اقتباسات میں ایک بے ساختہ کیفیت موجود ہے۔ صدیق سالک نے موضوع کو کچھ کا کچھ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی اس کے برعکس انہوں نے موضوع کو خلوص کی سان پر چڑھایا ہے اور اس کی لطافت

اجاگر کر دیا ہے، انہوں نے مارشل لا کو ایک ذی روح جان کی صورت میں پیش کر کے بظاہر اس کی توقیر میں اضافہ کرنے کی سعی کی ہے لیکن در حقیقت اس لہر کو گرفت میں لیا ہے جو معنویت کی زیریں سطح پر موجود ہے اور ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے صدیق سالک نے سوچ کی اس کیفیت میں بشاشت کی پھل جھڑیاں چھوڑی ہیں اور قاری کو ایک مدار سے نکل کر دوسرے مدار میں سفر کرنے کی دعوت دی ہے اس کی ایک اور دلچسپ مثال ان کا مضمون "بیوروکریسی" ہے جس میں انہوں نے بیوروکریسی کے مزاج کو گرفت میں لینے اور معنی کی نئی گرہ کو کھولنے کی کاوش کی ہے۔

"بعض لوگ اسے (بیوروکریسی کو) کچھوے سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس کی تین وجوہات بتاتے ہیں ایک یہ کہ بیوروکریسی کچھوے کی طرح جانتی ہے کہ سازگار فضا میں کب گردن آگے بڑھانی ہے اور کب ناموافق حالات میں گردن اندر کھینچ لیتی ہے دوسری وجہ عوامی شکایات سے اس کی بے حسی بتائی جاتی ہے اور اس پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ اس کی پیٹھ کچھوے کی طرح سخت ہوتی ہے جس پر عوامی شکایات کا پتھراؤ کوئی اثر نہیں کرتا اور تیسری یہ کہ کئی حکمران طرح طرح کے عزائم لے کر برسر اقتدار آتے ہیں اور ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرنے لگتے ہیں۔ لیکن اس دوڑ میں فتح بیوروکریسی کی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ کچھوے کا خصوصیت رکھتی ہے"

صدیق سالک نے بیوروکریسی کا یہ تجزیہ "افکارِ دیگراں" کے حوالے سے کیا ہے تاہم بیوروکریسی کے بارے میں ان کا اپنا موقف بھی کچھ غیر دلچسپ نہیں اور یہ بھی تمثیل کی ایک نئی فکری جہت کو سامنے لاتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

"یہ تینوں الزامات بے بنیاد ہیں۔ کیونکہ بیوروکریسی پیٹ کے بل رینگنے والا کیڑا یا جانور نہیں آزاد فضاؤں میں اڑنے والا عقاب ہے اس کی عقابی نگاہیں آنے والے طوفان اور جانے والے حکمران کا بخوبی اندازہ لگا لیتی ہیں اور مزید پرواز کا تعین اسی اندازے کے مطابق کرتی ہیں.......... یہ بحث آج تک ختم نہیں ہو سکی کہ حکومت بیوروکریسی کو چلاتی ہے یا بیوروکریسی حکومت کو یا اصل میں دونوں ایک ہیں اور حکومتوں کا آنا جانا صرف سانپ کی کینچلی بدلنا ہے"

ان اقتباسات میں بے ریا سچائی کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ صدیق سالک نے حقائق کو طنز مسلوب صورت میں پیش کیا ہے تاہم انہوں نے حقیقت کے المیہ زاویے کو بشاشت آمیز کرنے کی سعی زیادہ کی ہے چنانچہ ان کے ہاں مزاح صرف بہت کے احساس کو ہی جنم نہیں دیتا۔ بلکہ یہ فرد کے داخل سے آنسوؤں کو اُبال کر انہیں پلکوں تک آنے کا راستہ بھی دکھاتا ہے اور اکثر اوقات یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ صدیق سالک مزاح کے حیلے سے ہماری فکر کو ہی مہمیز لگا رہے ہیں ان کا مزاح ایک ایسی قوت ہے جو جلد حواسِ خمسہ کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور دل پر مستقل نقش لگاتی ہے یہ ایک ایسی خوشبو ہے جو سوچ کی بلکہ ایک ایسی فضا مرتب کرتی ہے جس میں فرد آزادی سے سوچ سکتا ہے۔

خالص مزاح کے زاویئے سے صدیق سالک کی نسبت پطرس بخاری سے بھی قائم کی جاسکتی ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ معاشرتی اضطراب کے حالیہ دور میں وہ مجھے غالب کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں غالب نے بھی اپنے عہد کا المیہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اور اس کے آگے گردن ڈال دینے کے بجائے کمال زندہ دلی سے مسکراتا رہا تھا۔ صدیق سالک بھی ایک ایسے ہی دور سے گزر رہے ہیں۔ جب "لذت خواب سحر" معدوم ہو چکی ہے لیکن فرد سحر خواب ماضی سے نکلنے کا حوصلہ پیدا نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ بھی غالب کے انداز میں ہی معاشرے کی نم آلود پلکوں پر مسکراہٹوں کے چراغ روشن کر رہے ہیں اور روشنی کو تیز کرنے کے لئے روغن دل فراوانی سے پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان کے ہاں جو ناشن سو فٹ جیسی تیکھی کیفیت ابھرتی تھی لیکن ان کا مجموعی مزاج ای کاک اللہ ہاؤس اور جیروم کے جیروم سے مشابہ ہے اور وہ مارک ٹوین کے ہمنوا نظر آتے ہیں جس نے لکھا تھا کہ "مزاح تو صرف ایک خوشبودار آرائش کا نام ہے"۔

صدیق سالک کے مزاح میں تیکھا پن طنز کی کٹیلی نشتریت میں تبدیل نہیں ہوتا۔ لیکن ان کے ہاں زہر خند کی چٹیلی کیفیت سے بچنا ممکن نہیں انہوں نے چونکہ ناحال کوئی قابل ذکر مزاحیہ کردار تخلیق نہیں کیا اس لئے ان کے ہاں شخصی طنز کا پست زاویہ بھی نہیں ابھرا ان کا مزاح بلیشتر اجتماعی نوعیت کا ہے وہ پورے معاشرے کو اپنا معمول بناتے ہیں اور اس پر طائرانہ نظر ڈال کر اپنا شوخ و شنگ تبصرہ بکھیرتے جاتے ہیں۔ اس عمل میں مزاح نگار منظر سے غائب نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ایک ایسے مبصر کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ جس نے اپنی کمر سے کیمرہ اتار کر آنکھوں کے ساتھ لگا رکھا ہے اور کھلے ہوئے شٹر سے نہ صرف تمام ہمواریوں کو دیکھ رہا ہے بلکہ روشنیوں اور سایوں کے امتزاج سے اس کا عکس کاغذ پر بھی اتار رہا ہے صدیق سالک کی یہ معاشرتی تصویریں ساکن نہیں بلکہ متحرک ہیں۔ ان تصویروں پر چونکہ صدیق سالک کا تبصرہ بھی دستیاب ہے۔ اس لئے یہ ہمیں ان کے ردعمل سے بھی آگہی عطا کرتی ہیں۔ چنانچہ زہر خند کی وہ کیفیت جسے نمایاں کرنے کے لئے صدیق سالک نے مزاح کو سخن کا پردہ کر رکھا ہے سطح پر آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس زاویئے سے دیکھئے تو صدیق سالک کا مزاح مضحک نگاری کے بجائے حقیقت نگاری کا ہی ایک زاویہ ہے۔ وہ اشیا کو محدب شیشے سے دیکھنے کے بجائے ایک بڑے ایک نمبری عینک سے دیکھتے ہیں اور فرد کو عقل و خرد کی دنیا میں سرگرم سفر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں عملی مذاق یا صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کا انداز نظر نہیں آتا۔ انہوں نے جزو پر نظر ڈالنے کے بجائے کل کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے اور بیشتر ایسی آرا کا اظہار بھی کیا ہے جو فرد کے بجائے پورے معاشرے کو اپنی زد میں لیتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زندگی کے ساتھ ان کا رویہ ایک ثقہ فوجی جیسا نہیں بلکہ ایک زیرک چھوٹے دریا خبر صحافی جیسا ہے۔ تاہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے فرد کا مخبر بننے کے بجائے معاشرے کا ترجمان بننا پسند کیا اور جب معاشرے کو زد میں لیا ہے تو اس پر کوڑے برسانے کے بجائے انسانی عظمت و وقار کا احترام بھی پیدا کیا ہے اور اس عمل میں اپنی ذات کو معاشرے میں منہا نہیں کیا۔

صدیق سالک کا یہ صحت مند رویہ ان کے بیشتر مزاح پاروں میں موجود ہے لیکن اس کی ایک نسبتاً نمایاں صورت ان

کی ادبی حیثیت تقریبوں میں سلسلہ آئی ہے یہ تقریریں جن کا طریق استعمال بھی صدیق سالک نے بتادیا ہے بظاہر اس فن لطیف کی
اور مضحکہ خیز کیفیت پہ ایک معنی خیز زہرخند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاہم یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ صدیق سالک نے مقرروں کی مشکل آسان
کی بلکہ ان کی راہ میں کانٹے بچھا کر انہیں اس آگہی سے سرفراز کیا ہے کہ ان کی بیاکمیت نے ایک مضحک صورت پیدا کردی ہے۔
سالک نے یہاں خطیبانہ پیرومرشدی کو آزمانے کے بجائے زندگی کے ایک پہلو سے عمل کی تحریک کی ہے اور ہمدردانہ متوازن لہجے میں مع
کی ان گنت خرابیوں پر آزاد اور رواں تبصرہ کردیا ہے اس ضمن میں مندرجہ ذیل اقتباسات بے محل نہ ہوں گے۔

• ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے مطابق مرغیوں کی تعداد اور ان کے معیار زندگی میں اضافہ کرنا ضروری ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آ
ہند کے وقت پاکستان کے حصے میں صرف چار ہزار ایک سو دس مرغیاں آئی تھیں جن میں سے اکثر آزادی کی تقریبات میں کام آ
جو مرغیاں اس وقت قومی خدمت سے محروم رہیں ان میں سے بھی بیشتر مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر راہی ملک عدم ہو گئیں
کیونکہ ان کی رہائش اور دیکھ بھال کا خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ ان دنوں ملک کی ساری مشینری مہاجرین کی دیکھ بھ
میں لگی ہوئی تھی۔"

(مرکز مرغ بانی کا افتتاح)

خواتین و حضرات! ہسپتال صرف مریضوں کے لئے علاج گاہ اور مجبوروں کے لئے آرامگاہ ہی نہیں بلکہ بہت -
متاثرین اور ان کے لواحقین کے لئے اسٹیٹس سمبل بھی ہے۔ مرنے کو تو انسان ڈاکٹروں کی فیس اور آپریشن کی اذیت کے بغیر
اپنے گھر میں مر سکتا ہے لیکن ہسپتال آنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لواحقین تعزیت کرنے والوں کو بتا سکیں کہ ہمارے والد صا
سینٹ پال ہسپتال میں ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے ڈاکٹر آئی ایچ سمتھ کی زیر نگرانی مرے اور مرنے سے پہلے ان کے ٹیسٹ ا
لیبارٹری لندن سے کرائے گئے اور ڈاکٹروں کے پانچ رکنی پینل نے بہت زور لگایا لیکن وہ جمعہ کی صبح کو EXPIRE

(ہسپتال کا افتتاح)

چودھری صاحب کی ترقی کا راز ان کی دیانتداری میں ہے۔ بعض لوگ ہوٹلوں سے تو چمچ یا خلال بلا قیمت اٹھا
اور واپس نہیں کرتے۔ چودھری صاحب ہمیشہ خلال لوٹا دیا کرتے تھے البتہ بڑھاپے میں حافظہ کمزور ہونے کی وجہ سے کئی
سرکاری سامان لوٹانا بھول جایا کرتے تھے جو گھر میں ان کے زیر استعمال رہتا تھا۔ آخر بندہ بشر ہے۔

(آخری ریٹائرمنٹ پر)

صدیق سالک نے مزاح کی مندرجہ بالا صورتیں اندرون ملک تلاش کی ہیں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جب بیرون ملک
[illegible] ناہمواریاں وہاں بھی ان کی دامن کش نظر ہوتی ہیں لیکن اب وطن ان کے لئے مثالی حیثیت رکھتا ہے اور بیرو

اس مثال کی زد پر آتا ہے تو اپنا بھرم قائم نہیں رہ سکتا۔ منظر نیویارک کا ہے۔ میزبان نے ۵۰ ویں منزل پر فلیٹ نمبر ۱۱۳۲
ز کھول دیا ہے۔ صدیق سالک اندر پہنچے ہیں۔ جہاں دنیا کی ہر نعمت بند ہے۔ اشیائے خورونوش، اعلیٰ فرنیچر، تازہ پھل، تتلیاں
، دو پھولوں سے ننھے بچے، بیگم کی بنارسی ساڑھی اور مسکراہٹ لیکن صدیق سالک کو اس بند فضا میں گھٹن محسوس ہو رہا
ا سے اپنا بچپن یاد آ رہا ہے۔ جس میں وہ شہتوت کا درخت تھا۔ بیری کا بور تھا۔ چڑیوں اور چوزوں کی چہچہاہٹ تھی، للد
ے تھا کورے گھڑے کا ٹھنڈا پانی تھا۔ منی پلانٹ کی جگہ جنگلی بیلیں تھیں جو دیکھتے دیکھتے منڈیر تک پہنچ جاتی تھیں۔ ان میں
گھونسلے بناتی تھیں اور وہ ان کے انڈے چوری کرتے تھے۔ چچا چچی تھے، تایا تائی تھے، تائی تقریباً ہر روز دوپہر کے وقت
روٹی خاص طور پر تنور میں رہنے دیتی تھی جو وہیں پک کر خستہ ہو جاتی تھی اور وہ اس گرم گرم روٹی کے ٹکڑے مزے لے
تے تھے اور خوش ہوتے تھے اور کسی شرارت پہ پٹائی ہونے لگتی تو لمبی گلیوں اور کھلے کھیتوں میں بھاگ جاتے تھے
ملونے دے کر کوئی قید نہیں کرتا تھا۔" اس منظر میں بظاہر افسردگی زیادہ جاگتی ہے تاہم جب مغربی معاشرے کا کھوکھلاپن
آتا ہے تو یہ حقیقت بھی کھل جاتی ہے کہ صدیق سالک "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" والی خودکفیل صورت
رہے ہیں۔ وہ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے جو انہیں ایک نسبتاً پڑھے لکھے پاکستانی نے لندن کے مضافات میں
اور وطن کی صورتِ حالات پر مدلل تبصرہ کر ڈالا تھا۔ زہرخندکی اس کیفیت کو صدیق سالک کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے
سالک حکومت پاکستان کا نمائندہ ہے اور لندن میں آباد پاکستانیوں کے مسائل دریافت کر رہا ہے۔ جانت
کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔

یہاں ہمیں دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے"
یہاں کا معاشرہ ہمیں قبول نہیں کرتا۔ ہم سے نفرت کی جاتی ہے"
ہمارے خلاف نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ بچوں کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں"
ری حکومت ہمارے لئے کچھ نہیں کرتی۔ ہماری ایمبسی بے کار ہے"

لموں کی اس بوچھاڑ میں صدیق سالک کہتے ہیں۔

"یہ سب کچھ درست ہے تو آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو اپنے ملک میں آزادی راس نہیں آئی یا آپ
تاج برطانیہ کے سائے تلے زندگی گزارنا قابلِ فخر سمجھتے ہیں۔ آئیے اپنے گھر چلیں، آدھی کھائیں اور
سے سوئیں"

ں آباد پاکستانی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ مگر ایک جو نسبتاً پڑھا لکھا ہے کہتا ہے۔

یہاں جتنے پاکستانی رہتے ہیں انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو بھوکے ہیں اور پیٹ بھرتا
ہے دوسرے وہ جو سیر شکم ہیں اور بھونکنے کی آزادی چاہتے ہیں۔ دونوں کی ضروریات یہاں کسی نہ کسی طرح پوری

ہوجاتی ہیں۔ آپ وہاں نہ سیر شکمی کا تسلی بخش انتظام کرتے ہیں اور نہ بھونکنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ہم یہاں اچھے ہیں۔۔ پاکستان ہمارا وطن ہے۔ اسے ہماری طرف سے سلام کہنا پاکستان۔۔۔۔۔۔۔۔ پائندہ باد" یہاں صورتِ حال کا ہمدردانہ شعور موجود ہے۔ بات خاصی سنجیدگی سے اٹھائی گئی ہے لیکن دیکھیئے صدیق نے یہاں حسبِ ضرورت مطلب نکالنے کے لئے بیٹھنے کو تھوڑا سا ٹیڑھا کر دیا ہے۔ چنانچہ دو چیزوں کی مشابہت ہی سامنے نہیں آئی بلکہ ان کا تضاد بھی نمایاں ہو گیا ہے مشابہت آزادی کی لگن اور شکم سیر ہونے کی خواہش ہے۔ لیکن تضاد ان چیزوں کے فقدان سے نمایاں ہے۔ نتیجتہً وہ زہر خند پیدا ہوا ہے جو اپنے اندر صورتِ حالات کی تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے اور یہاں ہمیں صدیق سالک کی انگلیوں میں ایسا قلم نظر آتا ہے جو بار بار پاکستانی تاریخ اور سیاست کی طرف کڑوی کسیلی سیاہی کے چھینٹے اچھال رہا ہے

واضح رہے کہ صدیق سالک نے جب بیرونِ وطن نظر دوڑائی تو دستیاب تضاد سے مغربی معاشرے کی نفی نہیں کی بلکہ اس وسیلے سے بھی مشرقی معاشرے کی ناہمواریوں کو ہی اجاگر کیا ہے اور اس سے جو مضحک صورت پیدا ہوئی ہے اس پر ہمیں مسکرانے کا موقعہ دیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

خاتون کا وعظ سن کر مجھے اپنا گاؤں یاد آگیا جس کی چھت پر میں ساری گرمیاں لمبی تانے اور کئی مرتبہ کچھ تانے بغیر پہروں بے فکر سویا کرتا تھا۔ دیہاتی مکانوں کی چھتوں کی منڈیر نہ ہونے کے برابر تھی جس کی وجہ سے ہر کوئی دوسرے کے اندرونی حالات سے باخبر رہ سکتا تھا اور یہاں دیکھئے، ہوٹل کی انیسویں منزل پر کمرے کے اندر بھی پابندیاں، پھر بھی کہتے ہیں کہ امریکہ آزاد ملک ہے"۔

"رفیق نے بتایا کہ یہاں کے لوگ امریکی لوگوں اور امریکی اقدار سے نفرت کرتے ہیں لیکن امریکی اشیا پسند کرتے ہیں۔ آپ یہاں گاڑیاں دیکھ لیں۔ ائیر کنڈیشنز دیکھ لیں۔ ٹی وی سیٹ دیکھ لیں۔ کئی ایک امریکی ساخت کے ملیں گے

"کیا امریکہ اور کیوبا کے درمیان تجارتی تعلقات ہیں ؟

"ہاں۔ ہیں۔ کیوبا والے امریکہ کو گالیاں ایکسپورٹ کرتے ہیں اور وہاں کی مصنوعات بلا لائسنس امپورٹ کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

تھوڑا سا فاصلہ تو ہے یہاں سے ایڑیاں اٹھا کر گالی دی جائے تو ساحلِ امریکہ پر سنی جا سکتی ہے"۔

"صوفی صاحب! بغداد پسند آیا؟

"جی ہاں، شہر تو بہت صاف ستھرا ہے لیکن لوگ بڑے گندے ہیں!"

"کیوں۔ کیا ہوا ؟"

"جی۔ نہ موقعہ دیکھتے ہیں اور نہ جگہ لڑکے لڑکیاں سڑک پر ہی عید ملنے لگتے ہیں۔ حالانکہ سنا ہے کہ حال ہی میں

ان کے قائداعظم کا انتقال ہوا ہے۔ انہیں تو سوگ پر چھوڑی بیٹھنا چاہیئے تھا۔ یہ الٹا بے حیائی کر رہے ہیں۔ انہیں ذرا بھی سلام کا خیال نہیں اب تو صاحب واپسی پر عمرہ ضروری ہو گیا ہے"!

مندرجہ بالا اقتباسات سے ایک یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ صدیق سالک ہموار اور نسبتاً طویل بیانیہ سے مزاح پیدا کرتے ہیں، چنانچہ ان کے ہاں غبارے میں ہوا بھرنے کا عمل بہت کم ظہور پذیر ہوا ہے۔ وہ مزاح کی ایک مخصوص فضا مرتب کرتے ہیں۔ اور پورے ماحول کو اس کی مسرت سے معطر کر ڈالتے ہیں۔ ان کے جملے میں چبتی کا خیطر عنصر موجود ہے اس کی رگوں میں لفظوں کی جوالا بہتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہ نوکیلے تیر کی طرح پیوستہ بہ دل بھی ہو جاتا ہے لیکن انہوں نے کرنل محمد خان کی طرح شاعری سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ انہوں شفیق الرحمان کی طرح لطیفے سے بیانیہ ہیئت پیدا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ان کا مزاح شوریدہ ندی کی طرح پتھروں سے سر نہیں ٹپکتا بلکہ یہ ایک ایسی موج تیز گام ہے جو عمودی سمت میں لپکتی ہے اور پھر ایک مخصوص بلندی پر پہنچ کر افق کے چاروں سمت پھوار بن کر بکھر جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لطیفے کے استعمال فراماں سے تشنج کو نجات نہیں دیتے۔ بلکہ زندگی سے رابطے کے عمل کو بحال کرتے ہیں اور اس رابطے کے حصول کے لئے انہوں نے لفظوں کے متوازن کومل ترنم اور قافیہ بندی کے لطیف تخلیقی آہنگ سے بھی نمایاں کام لیا ہے اس آہنگ میں جب تاریخ کے تیور بھی شامل ہو جاتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ صدیق سالک نے اپنے فن کی سمفنی مکمل کر دی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں سماجی مشاہدہ تاریخ کی انگلی پکڑ کر مزاح کو ابھار رہا ہے۔

"یونیورسٹیاں، جیلیں، ہسپتال، فیکٹریاں سب پاکستان کے دم سے ہیں۔ لہذا پاکستان کی سلامتی اور استحکام سبھی اہل وطن کو عزیز ہے لیکن اس کی زیادہ فکر کرسی والوں کو رہتی ہے۔ ان میں ایک طبقہ ایسا بھی گزرا ہے جو اپنی کرسی کی مضبوطی کو ملک کی استحکام کے لئے ناگزیر سمجھتا تھا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ملک کو زیادہ تر نقصان مضبوط کرسیوں سے ہی پہنچا ہے"

"جغرافیہ کی متلون مزاجی کا اثر آبادی پر بھی پڑا جو وقتاً فوقتاً جمع تفریق ہوتی رہی، اس نے سات کروڑ سے آغاز کیا اور دیسی کھاد اور ولایتی گولیوں کے زور پر جلد ہی تیرہ کروڑ تک پہنچ گئی۔ ہم نے آبادی کے اس روز افزوں رجحان کو روکنے کے لئے تمام روایتی طریقے آزمائے لیکن اس کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ بالآخر ۱۹۷۱ء میں تنگ آ کر اس کی آدھی آبادی یکمشت ختم کر دی اور برسا کے قریب آدھا جغرافیہ، آدھی آبادی اور پوری حیثیت چھوڑ کر یہاں مقیم ہو گئے۔

اور اب چند معنی خیز جملے جن میں تفریح کے علاوہ فکر کی موج رواں بھی موجود ہے۔

"ذہن باڑوں اور رجواڑوں میں بٹ جائے تو زمین خود بخود کیاریوں میں بٹ جاتی ہے"

متلون مزاج جغرافیہ ہو یا بیوی، دونوں پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے"

میں نے کہا "قبرعاً ہر طرح کی چھیڑ منع ہے، نظری، لفظی، دستی! آگے تمہاری مرضی"۔

"یہاں دکانیں اور عورتیں ذرا دیر سے کھلتی ہیں۔ بس کوئی آدھ گھنٹہ صبر کرنا پڑے گا"

"سیکرٹری حکومت کا رازدان اور حاکموں کا حرزِ جان ہوتا ہے۔ اگر یہ ہر شے سرخ فیتے والی فائلوں لوہے کی الماریوں اور بیوروکریسی کے کواڑوں میں بند نہ رکھے تو حکومت کے سارے راز چھلک کر سڑک پر آجائیں"

"اگر لوگوں سے نظریاتی آزادی چھیننی ہے تو انہیں سماجی آزادی کے دو پیگ زیادہ دے دو"

"لندن فطرتاً ایک شریف النفس شہر ہے جس میں ہر نفس کے انسان بستے ہیں۔ ان میں سیاست کے مغرور بھی ہیں اور دولت کے مغرور بھی۔ ان میں معرفت کے مخمور بھی ہیں اور شراب سے چور بھی"

صدیق سالک کے ہاں جو اسلوب کی شگفتگی ہے اس کے سوتے ذہانت کی کھلی اور کشادہ فضا سے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایک مخصوص قسم کی معصومیت موجود ہے اور بڑی سادگی سے بادشاہ سلامت کو یہ یاد کرانے کا سلیقہ رکھتے ہیں کہ "حضور! آپ ننگے ہیں"۔ انہوں نے اخلاقی اقدار کے ایک مخصوص سانچے میں زندگی بسر کی ہے وہ زندگی کی ہر نہج کو قدروں کے اس پیمانے سے ناپتے ہیں اور ذہنی وسعت اور کشادہ نظری سے اس کے بوقلموں اور مسرت افزا زاویوں کو دریافت کرتے ہیں۔ صدیق سالک نے مزاح کے وسیلے سے زندگی کے متعدد اور متنوع گوشوں کو محیط کیا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کا قاری ان کے ساتھ دور تک چلنے میں مسرت محسوس کرتا ہے اور کسی مقام پر بھی اکتاتا نہیں۔ تاہم اس مسرت کے پسِ پشت درد کی ایک لہر بھی موجود ہے شاید اس لہر کو اجاگر کرنا ہی صدیق سالک کا فنی مقصد ہے انہیں تفصیل سے پڑھیں اور لفظوں کی نیت میں جھانکیں تو یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ وہ متذکرہ مقصد کے حصول میں ناکام نہیں ہوتے۔

انور جمال

وزیر آغا کی طویل نظم

آدھی صدی کے بعد

نفسیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ فرد کے ذہن کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے مختلف طریقوں میں سے ایک دروں بینی "Introspection" بھی ہے جسے اُردو اصطلاح میں مطالعۂ باطن بھی کہا جاتا ہے۔ کانٹ نے اسے INNER SENSE کہا ہے۔ مطالعہ کرنے والا اپنے دل و دماغ، قلب و روح پر کسی ہیجان کے تاثرات کو ہیجان گزر جانے کے بعد قلم بند کرتا ہے۔ برٹرنڈ رسل نے اسے "ذاتی حسی" تمثالیوں کی بازیافت کا نام دیا ہے۔ مشکل عمل ہے جسے کمسن بچے، عوام الناس اور نچلے لوگ نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ذات کے سمندر میں غوطہ زن ہونا پڑتا ہے اور روح کی منجدھار سے گزرے بغیر دریا کی حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا۔ بقول مجید امجد ـــ

انہیں حقیقتِ دریا کی کیا خبر امجد
جو اپنی روح کی منجدھار سے نہیں گزرے

مطالعۂ باطن کے اس مشکل اور قدرے پیچیدہ عمل سے گزرنے والوں کی دریافت بھی [illegible] کرتی ہے۔ ہر شخص کا ایک اپنا اندازِ فکر ہے۔ اس کے جذبات کی پرورش ایک مخصوص ماحول میں ہوتی ہے۔ اس کی روح کی تہوں میں پیدا ہونے والے زیر و بم کی کیفیتیں مختلف ہیں۔ علاوہ ازیں کوئی فرد محض ایک ہیجان کے اثرات کی بازیافت پر قادر ہوتا ہے۔ کوئی بحیثیت مجموعی جملہ وارداتِ روح و قلب اور بحرِ ذات کے تمام گرداب اور تمام ہلچل کا مطالعہ کر کے اس کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ذات اور روح پر گزری ہوئی واردات کا جائزہ لینے کے لئے ذہن کو (Reverse Gear) لگانا پڑتا ہے اور یہی ایک دشوار مہم ہے جسے وزیر آغا نے سر کیا ہے۔

وزیر آغا "آدھی صدی کے بعد" ـــ میں ذات کے بحرِ مواج کے پیچ و خم کو خارجی حوالوں سے بیان کرتے ہیں۔ عمرِ رفتہ کے سلسلوں کی ان تنابوں کو وزیر آغا کو کئی بار ڑکنا پڑا۔ عہدِ گزشتہ کے مطالعہ کا یہ دائرہ چار قوسوں سے مکمل ہوتا ہے ـــ ایک وہ قوس ہے جو دھنک رنگ بچپن، جوانی اور گزشتہ شاموں کا امین ہے۔ یہاں جھرنے بڑی لاپروائی اور بے فکری سے مست خرام ہیں ـــ وہ رنگا رنگ کھلونوں سے بہلتا ہے۔ محبتوں اور مسرتوں کے سنہری لمحوں میں سانس لیتا ہے۔ ماں کی میٹھی شہد بھری گداز محبت آنکھوں اور ہونٹوں میں سمٹ آتی ہے۔ دادا کی کھانسی داستانیاں [illegible] تہوں میں رہ جاتی ہیں۔ اس قوس کے رنگ بڑے شوخ و شنگ ہیں۔ دھوپ اس عہدِ نیلیں کا سائبان ہے اور گاچی کے پانی میں مردہ لفظوں کے زندہ جذبات مچھلیوں کی طرح تیرتے ہیں۔ جامنوں اور شہتوتوں کی سوندھی خوشبو دار اور ٹھنڈی چھاؤں میں تتلیوں کا تعاقب کر کے ان کو پکڑنے کی مہمیں سر کی جاتی ہیں ـــ یہ شاعر

..... جب شاعر پچاس سال ادھر سے لوٹا تو دنیا مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی،
مگر راہگزرِ حیات پر بچپن کا کارواں اسی طرح رواں دواں ہے اور رفتارِ وقت پر خندہ زن ہے

جھرنا کھلکھلاتا ہنستا نرم و گداز چٹانوں میں آگے بڑھتا ہوا ندی کا روپ دھار لیتا ہے۔ بچپن کی طبعی عمر میں اضافے کے ساتھ یہ دھنک رنگ قوسِ قزح شوخ اور کم چمکدار ہو کر آگے کی طرف سرکتی ہے۔ یہ شاعر کا لڑکپن اور نوجوانی ہے۔ یہاں چیزوں کے وقوف اور سمجھنے کا عمل پہلے کی نسبت زیادہ واضح ہے۔ یہاں شاعر کے حواس "صورتِ اشیاء" کو بغیر استفسار اور جواز کے قبول کرنے پر تیار نہیں ہے۔ وہ زندگی اور زندگی کے متعلقات پر نہ صرف غور کرتا بلکہ ایک (SOLILOQUY) کے کربناک عمل سے دوچار ہے۔ خود سے سوال کرتا ہے مگر جواب نہیں پاتا۔

اس حصۂ نظم میں جذباتیت جو لڑکپن اور جوانی کا عضلاتی اور ذہنی خاصا ہوتی ہے۔ موجود ہے گلی سے گزرتے ہوئے کسی چق کی لرزش سے جذبات میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ جسم تیز خوشبو کی طرح بازار میں مشتہر ہے۔ آنکھوں میں نشہ ہے اور ہر جمالی پیکر کو چھونے بلکہ چومنے کی بے نام خواہش کروٹ لیتی ہے۔ سینے میں سمندر سہانے سپنا نگڑائیاں لیتے ہیں۔ یہاں "خودنگری اور خود کلامی" کا امتزاج ایک لحاظ سے یہ گزشتہ اور آئندہ کا نقطۂ اتصال

یہ قوس جو ایک نرم باریک مگر شوخ لکیر سے شروع ہوتی ہے اور راستے میں ذرا لرزیدہ تحیّر سے ہم کلام ہوتی ہیں۔ تیقّن سے ذرا ہٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ جوانی کا پُرشور زمانہ شباب کی پوری توانائی، مضبوط عضلات اور توانا فکر کے ساتھ اپنے گرد و پیش کی خارجی دنیا کے رشتوں اور تعلقوں کی فض یہ اس کی فکری اور شعوری سطح ہے۔ یہ ذمہ داری اور جذباتی —— ملا جلا عہد ہے۔ وقت اور ماحول کو اس سے بے شمار امیدیں وابستہ ہیں۔ کبھی کبھی اس نرم کیفیت طاری ہوتی ہیں۔ مگر سحر کی تازہ دم ہوا اسے پر مار کر —— اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتی ہے۔ یہاں شاعر کی بصیرت میں گہرائی پیدا ہو چیزوں کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے —— ہر شے اعلانِ ذات کرتی دکھائی دیتی ہے۔

فکری اور فنی طور پر —— یہ —— اور اس سے سابقہ (ندی والا حصہ) بڑا جاندار اور نفسیاتی نوعیت کا ہے۔ دریا ایک ذخیرۂ آب ہے۔ جو پیہم رواں ہے۔ اس کا فیض جاری و ساری ہے —— لوگ اس سے خالی مشکیزے، کوزے اور کشکول بھر بھر لے جاتے ہیں۔ اس کی طبیعت میں بخل نہیں اور نہ ہی اس کی فیض رسانی میں کمی واقع ہوتی ہے —— پانی حاصل کرنے والے چونکہ خود خالی تھے۔ اس لئے خود دریا کا وجود دریا نہ بن سکے۔ وہ ٹھہرے ہوئے پانی کے جوہڑ تھے۔ جو تعفّن پیدا ہو گیا تھا۔ اب اسے اپنی عظمت کا احساس ہوتا ہے کہ پانی چلتا رہے ہے —— ورنہ ایک اندھا کنواں ہے ——

پھر شاعر کی شعوری اور فکری پختہ زندگی کا وہ لمحہ آیا جب اس فیاضی اور شوکت کے بہاؤ پر "پریم راج" دیوی حسد کرنے لگی اور اس کی پرچھ مستقل طور پر اسے ختم کرنے کے درپے ہو گئی۔ اس نے کئی موقعوں پر حملے کئے مگر ناکام رہی اور دریا اپنی پوری جولانی سے بہتا رہا۔ حتیٰ کہ سمندر بن گیا —— یوں اس کی گہرائی اور فیاضی میں اضافہ ہو گیا۔

نظم کی آخری قوس جو دائرے کو مکمل کرتی ہے "سمندر" کے نام سے معنون کی گئی ہے۔ اس حصۂ نظم میں اپنے ہونے کا عرفان ہے۔ جو نے
یاں اور دریا جو وہ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ وہ ان تمام لہراتے پانیوں کو اپنے آئینے میں دیکھتا ہے۔ پھر اُسے دُنیا کی ہر شے کا ارتکاز دھرتی کے سینے میں
مائی دیتا ہے۔ جہاں آج خشک صحرا ہے وہاں کسی روز ____ ایک بڑ کا درخت تھا وہ اپنے آپ کو پائندہ اور باقی و لافانی کہتا تھا۔ مگر آخر فی وہ صحرا
ں گم ہو گیا۔ آج شاعر کا وجود خود ایک عظیم چھتنار لیے ہوئے بڑ کا درخت ہے۔ اس حصۂ نظم میں شاعر نے زندگی کے اس بنیادی سوال کا جواب شاعرانہ
تیز سے دیا ہے کہ دھرتی وہ عظیم مصدر ہے۔ جس سے چیزوں کا اخراج ہوتا ہے۔ پھر چیزیں اسی میں جذب ہو جاتی ہیں۔ تمام چیزوں کی جڑیں
یک ہی جڑ سے منسلک ہوتی ہیں۔ چلنے کے باوجود ساکت ہیں اور جامد ہونے کے باوجود متحرک ہیں۔

نظم کے قاری کے ذہن میں فوری طور پر جو تاثرات مرتب ہوتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) حیات کے سفر میں متحرک عمل میں شاعر کا وجود اس قافلہ کا حصہ ہے۔ جو ابگذرِ حیات پر رواں دواں ہے۔ مگر کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ وہ حیات کے
ں نہ رکنے والے سفر کی گذری ہوئی منزلوں کی فصیلوں میں موجود دروزوں اور شگافوں میں سے جھانک سکے۔ مگر شاعر نے لمحہ بھر کے لئے ہی سہی اس
روانِ ہستی میں اپنی حیثیت کا تعین کیا ہے۔ اپنی ذات کی حقیقت کا عرفان اسے اسوقت ہوا جب اس نے دیکھا کہ "دریا" حقیقت میں دریا ہے۔ اس
ں دوسروں کی پیاس بجھانے کی صلاحیت موجود ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی کے جوہڑ دریا نہیں بن سکتے۔ یہاں شاعر کی حیثیت ایک چراغ کی سی ہے۔ جو
ندھیروں میں۔ خود جلتا ہے ____ دوسروں کو روشن کرتا ہے۔ تاکہ ماحول کا اندھاپن ختم ہو سکے۔ اور تاریکی کی جڑیں مستنیر ہو سکیں ____ اس نے کئی
راغ جلائے۔ ____ کلیوں کے خالی کوزے بھرے۔

(۲) وزیر آغا کی اس نظم کے نفسیاتی پہلو بڑے توانا ہیں۔ اگرچہ یہ خالصتاً شاعرانہ اور فنی نوعیت کا تجربہ ہے۔ تاہم غیر محسوس طور پر داخلی نفسیاتی فضا بھی
یدا ہو گئی ہے۔ خاص طور پر نظم کے پہلے اور دوسرے حصے میں یہ فضا حیرت انگیز حد تک موجود ہے۔ جو عام نظموں میں نہیں ہوتی۔ جھرنے سے سمندر تک کے
نظر میں جو TEMPORAL CONTIGUITY پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ نظم تخلیق کے اعلیٰ معیار کو چھوتی دکھائی دیتی ہے۔ پہلے حصے میں بچپن اور
ں کے حوالوں کو ایک نفسیاتی TREATMENT دیا گیا ہے۔ ہر انسان اگر اپنے دریچوں میں سے جھانکے تو اسی قسم کی پرچھائیں سے تعارف حاصل کرے۔ دوسرا حصہ
لڑکپن اور جوانی ہے ____ جذبات آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ تعقیلی RATIONALIZATION کی طرف بھی مائل ہے۔ یوں نظم میں تخلیقی ارفعیت پیدا ہو گئی ہے۔

(۳) ہمارے شعری ادب میں جتنے تجربے نظم میں ہوئے ہیں اور جتنی کروٹیں اس صنف نے لی ہیں۔ کسی دوسری صنف کو نصیب نہیں ہو سکیں۔ میرا جی ____ اور
م۔ راشد کے ہاں اسلوب کی تازگی ملتی ہے۔ مجید امجد نے انفرادی لہجہ اختیار کیا اور نظم کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

وزیر آغا کی یہ طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" ____ اظہار کا ایک ترو تازہ اور جدید ترین تجربہ ہے۔ اس کی لائنوں میں ایک بہاؤ ہے
سکے میٹر میں ہرنی کی سی پھرتی ہے۔ تیزی اور سُرعت اس نظم کی داخلی کیفیت بھی ہے۔

(۴) اُردو ادب میں یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو اس سے پہلے نہیں کیا گیا۔ یہ نظم "اسلوب" اور موضوع کے اعتبار سے بالکل اچھوتی ہے جو شاعر کی فکری بلند
فتی مشاقی پر دال ہے۔ "آدھی صدی کے بعد" کو محتاط انداز سے بھی اس عہد کی شاہکار نظم کہا جا سکتا ہے۔ یہ اُردو کے شعری اور فکری سرمائے میں گرانقدر
ضافہ ہے۔

شمیم حیات سیال

بجنگ آمد و بسلامت رفت

کچھ عرصے سے کئی فوجی جوان ادب کے میدان میں مورچے بنانے میں مصروف ہیں شفیق الرحمان، ضمیر جعفری، سید جعفر طاہر مرحوم، رحمٰن کیانی، صدیق سالک، رشید قیصرانی، نیاض محمود، وغیرہ طنز و مزاح کے میدان میں ضمیر جعفری اور شفیق الرحمٰن کے ساتھ ساتھ ایک نو وارد کرنل محمد خان ہیں جن کی دو کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد خان نے بچپن میں کہیں سے سعدیؒ کا جملہ سن لیا تھا کہ بسلامت روی و باز آئی —
یہ جملہ ان کے ذہن میں رہا لیکن چونکہ فوجیوں کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے سلامتی کی بجائے جنگ جوئی غالب رہی۔ چنانچہ ان کی پہلی کتاب "بجنگ آمد" ۱۹۶۶ء میں معرض وجود میں آئی۔ یہ ان یادداشتوں پر مشتمل ہے جن کا تعلق فوج کی سروس سے ہے۔

دیباچوں کے سلسلے میں کرنل صاحب نے شفیق الرحمٰن کی پیروی نہیں کی (شفیق الرحمٰن دیباچہ لکھنے کا تکلف نہیں کرتے) بلکہ طویل دیباچے لکھ دیے ہیں۔ "بجنگ آمد" اردو کے مزاحیہ ادب میں حسین اضافہ ہے۔ جیسا کہ کرنل محمد خان نے دیباچہ میں وضاحت کی ہے۔ یہ مختلف مضامین ہیں جو پاکستان آرمی کے پرچے "ہلال" میں شائع ہوئے۔ پھر انہوں نے ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کرا دیے چنانچہ "بجنگ آمد" میں جو بے تکلف اور آزادہ روی کی جو فضا ہے وہ دیباچے میں قائم نہ رہ سکی۔

کتاب کا تعارف جناب ضمیر جعفری نے "حناء سر ناخن" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس کے بعد طویل مقدمہ ہے جو آٹھ صفوں پر پھیلا ہوا ہے۔ احمد جمال پاشا اور فرقت کاکوروی وغیرہ نے بھی طویل دیباچے لکھے ہیں لیکن وہ ہر جگہ پھلجھڑیاں بکھیرتے جاتے ہیں لیکن ان کے برعکس اس مقدمے پر تکلف اور سنجیدگی کی فضا حاوی ہے۔ اس کا

وجہ یہ ہے کہ کرنل صاحب کے احباب نے انہیں اس قدر مشورے دیے کہ وہ اپنا سٹائل قائم نہ رکھ سکے اور مسودہ ٹائپ کرنے والے سے لے کر اپنے استاد ڈاکٹر غلام جیلانی برق تک پہنچ گئے لیکن یہاں بھی لفٹین محمد خان درمیان میں آ دھمکتا ہے اور چٹکلے چھوڑ جاتا ہے۔ مقدمے کی ابتداء اس جملے سے ہوئی ہے۔ "یہ کوئی معرکہ آراء کتاب نہیں کہ اس پر مقدمہ دائر کیا جائے" لیکن پھر اس مقدمے کی پیروی میں آٹھ صفحے خرچ کر دیتے ہیں ـــــ

کرنل صاحب نے یہ کتاب چھپوا کر واقعی پریشان لوگوں کی مسکراہٹوں میں اضافہ کیا ہے اور یہ بڑی نیکی ہے۔ "یہ کتاب ایک لفٹین کی آپ بیتی ہے اس میں تصوف، فقہ یا علم کلام پر دیدہ دانستہ کوئی بحث نہیں کی گئی۔" ص۱۴ "آپ جب چاہیں یہ کتاب بے کھٹکے پڑھ سکتے ہیں انشاءاللہ آپ بحیرین کے امتحان میں کوئی سوال ایسا نہ پائیں گے جو سلیبس سے باہر ہو"

"خود اس خاکسار نے بزرگوں کی لکھی ہوئی کتابیں شروع کیں مگر دیباچے سے آگے نہ گزر سکا"

"غیر آزمودہ کتابیں پڑھنا ٹھیک نہیں"

"اگر دیباچوں پر یقین کیا جائے تو شاذ ہی کوئی کتاب ایسی ہوگی جسے مصنف نے برضا و رغبت چھپوایا ہو" اگرچہ دیباچوں کے سکتہ بند جملوں سے پرہیز کا دعویٰ کیا ہے لیکن سکہ بند جملے موجود ہیں۔

چھٹے ایڈیشن میں مقدمہ ثانی ہے جو تقریباً ڈیڑھ صفحے کا ہے لیکن یہ آٹھ صفحوں والے مقدمے سے بھاری ہے بیگم بھٹی کا خط ملاحظہ کیجیے۔ "محترم کرنل صاحب۔ آپ نے بجنگ آمد لکھ کر بڑا احسان کیا ہے۔ میرا بیٹا جاوید جو کسی کتاب کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا اب ہر وقت بجنگ آمد میں محو رہتا ہے۔ جاوید ماشاءاللہ بڑا قابل بچہ ہے۔ اس سال چوتھی جماعت کا امتحان دے رہا ہے"

اور آخری جملہ میں درخواست کی ہے کہ "اب دوسری ماؤں سے بھی درخواست ہے کہ اپنے ہونہار بچوں سے مشورہ کر کے اس خاکسار کے حق میں دعائے خیر کریں اور مناسب ہدایات جاری فرمائیں کہ اگلی کتاب لکھنے کا اہتمام کیا جائے"

ان دو تین جملوں میں وہ لطف موجود ہے جو پطرس کے دیباچے میں ہے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ کرنل صاحب کی کتابوں سے مقدمہ ثانی کا انتظار کرنا چاہیئے کیوں کہ نقش ثانی اصل مقدمہ ہوتا ہے۔

کرنل محمد خان کی دوسری کتاب "بسلامت روی" ریٹائرمنٹ کے بعد منصۂ شہود پر آئی۔ یہ وہ دور ہے جب کرنل جنگ جوئی سے تنگ آ کر سلامت روی کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ "بسلامت روی" ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت میرے پاس وہ جلد ہے جو کرنل محمد خان صاحب نے ابا جان کو بھیجی تھی۔ ابتدائی صفحے پر یہ الفاظ درج ہیں:

"بسلامت روی کی پہلی سطر کے" پروفیسر محمد حیات خان سیال کی خدمت میں
"محمد خان: بلکسر ۹ جنوری ۱۹۷۶ء"

دراصل جب انٹرمیڈیٹ کے لیے نئی کتاب مرقع ادب (اردو لازمی) مقرر کی گئی تو اس میں بجنگ ایک باب "لقیتین بغداد میں" کے نام سے کتاب میں شامل کیا گیا اور تعارف کے طور پر کرنل محمد خان نامکمل اور غلط حالات درج تھے۔ اس سلسلے میں ابا جان نے کرنل صاحب کو خط لکھا تھا جس کا آپ نے "ترکی بہ ترکی" جواب دیا۔ اس زمانے میں میں خود انٹر کی طالبہ تھی اور اب یہی کتاب طالبات کو پڑھا رہی ہوں۔ کرنل صاحب نے "بسلامت روی" کی ابتداء انہی جملوں سے کی ہے اور اس کے بعد "دکتاب انیست" کے عنوان سے کتاب کا تعارف کرایا ہے اور دلچسپ انداز میں چند وضاحتیں کی ہیں۔ اس حصے میں لکھتے ہیں:

"کتاب لکھنے سے پہلے ہمیں بارہا اپنے سفر کی ہلکی پھلکی روداد اپنے بے تکلف دوستوں کی مجلس میں بیان کا اتفاق ہوا" اس کے بعد شکریہ ادا کرتے ہوئے اسمٰعیل صدیقی کا نام بھی لیا جنہوں نے "فرنٹل اٹیک FRONTAL ATTACK" کے دوران کئی پیرے اور فٹ نوٹ ناپسندیدہ قرار دا دیکر تہ تیغ کر ڈالے۔ ان جملوں سے انداز ہے کہ مصنف نے سامان رسد بندھوانے میں کتنے لوگوں سے مدد لی اور ہر ایک نے اپنے انداز میں کئی گرہ لگائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں بے تکلفی اور شگفتگی کی وہ فضا موجود نہیں، جو بجنگ آمد میں ہے۔ مگر اس کی وجہ ادبیت و شعریت کے علاوہ موضوع کا انتخاب ہو۔

اس کے مقدمہ میں کرنل صاحب کا رنگ نمایاں ہے کئی جملے بڑے پرلطف ہیں۔

"آجکل ہر دوسرا یا تیسرا قاری یا تو خود ایک سفرنامے کا مصنف ہے یا مصنف سے زیادہ دنیا دیکھ چکا ہے"

"یہ کتاب سفرنامہ سے زیادہ آدمی نامہ ہے"

"کتاب کے غیر ملکی کرداروں سے ہماری باتیں زیادہ تر انگریزی زبان میں ہوئیں لیکن کتاب اردو میں ہے اس لیے ان کے منہ میں بھی اردو زبان رکھنا پڑی"

کرنل محمد خان صاحب کے یہ دونوں دیباچے دلچسپ ضرور ہیں اور ان سطور کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کرنل صاحب آئندہ کتاب مقدمہ کے بغیر شائع کرائیں یا پہلے مقدمہ ثانی لکھیں اور اگلے اڈیشن میں اصل لائیں۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ "اختصار wit کی روح ہے"

انجم عثمانی

کرنل محمد خان

انسان کو حیوانِ ضاحک کہا گیا ہے۔ اپنی نصف حقیقت کے باوصف یہ مقولہ ایک مسلم انسانی خصوصیت اور ادبی ہمہ گیری کا عکاس ہے۔ چنانچہ ادب میں انسان کے تمام دماغی اوصاف اور اس کے سارے حواس بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ مزاح بھی انسانی خصوصیت ہے، اور زندگی کا ترجمان ہے۔ اس لئے ادب میں اس کا وجود بھی ناگزیر ہے۔ اور سچا مزاح نگار اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے یہ ترجمانی اس طرح کرتا ہے کہ اس کا رنگ چوکھا ہو جاتا ہے۔ کرنل محمد خان بھی ان صاحب طرز ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے فطرت اور سماج کی ناہمواریوں اور تلخیوں کو مزاح کے شیریں انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ بیک وقت سینکڑوں سنجیدہ مسکراہٹوں کے پھولوں سے قاری کا دامن بھر جاتا ہے۔

کرنل محمد خان مزاح نگار ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کے توسط سے مزاح نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جو عہدِ جدید سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اور جس نسل میں شفیق الرحمان، مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ اور ابنِ انشاء[1] وغیرہ پاکستان میں، رشید احمد صدیقی، پطرس[2]، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی اور ذرا آگے چل کر مجتبیٰ حسین وغیرہ ہندوستان میں شامل ہیں۔

کرنل محمد خان اپنی نسل کے مزاح نگاروں میں اس لحاظ سے بھی ممتاز ہیں کہ انہوں نے اپنی مزاح نگاری کا موضوع سماج کے ایک ایسے طبقے کو چنا جس سے بظاہر مسکراہٹیں کم اور دھماکے زیادہ منسوب ہیں۔ یعنی فوجی زندگی، جس سے وہ خود وابستہ ہیں، اور اپنے پیرہن میں بھر کر ہنستے ہنساتے "بجنگ آمد" کا کارزار سجاتے ہوئے "بسلامت روی" تک آ پہنچے ہیں۔ خان صاحب اپنی پہلی کتاب "بجنگ آمد" کے ذریعے ۱۹۶۶ء میں قارئین کے سامنے آئے۔ اور بلا شبہ قارئین کے دلوں پر چھا گئے۔ "بجنگ آمد" گو کر ان کی فوجی زندگی کے آغاز کی داستان ہے مگر یہ ذاتی داستان ان

---

[1] حیرت ہے کہ فاضل مضمون نگار نے سید ضمیر جعفری اور محمد خالد اختر جیسے جید مزاح نگاروں کا ذکر نہیں کیا

[2] پطرس بخاری ہر طرح پاکستانی ادیب اور مزاح نگار ہیں۔ ([illegible])

اندازِ بیان کے معجزے اور اندازِ نظر کی بوقلمونی کی وجہ سے حکایت لطیف تر و شیریں ترین ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ء اور ان کی دوسری کتاب " بسلامت روی " شائع ہوئی۔ یہ کتاب اگرچہ ان کا سفرنامہ ہے لیکن اپنے مخصوص " محمد خانی اندازِ بیان " کی وجہ سے ایسی مزاح نگاری کے ضمن میں آتی ہے جسے فنِ لطیف کی اعلیٰ قسم کہا جا سکے۔ آئیے دیکھیں کہ خان صاحب اپنے سفر کا آغاز کن لفظوں میں کرتے ہیں۔

" ..... ساڑھے تین بجے سہ پہر ہمارا جہاز کراچی روانہ ہونا تھا۔ ہم پورے تین بجے چک لالہ ائرپورٹ پر پہنچ گئے، پنڈی سے ہمیں پیار ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اس کے نام میں نسائیت ہے، لاہور اور پشاور بہت مذکر کاٹھ کے شہر ہیں، لیکن پنڈی کی ادائے دلبری صرف تانیث تک ہی محدود نہیں، نام کے لحاظ سے کراچی بھی اتنی ہی مونث ہے، بلکہ ایک شادی شدہ کیفیت بھی رکھتی ہے، یعنی عروس البلاد کہلاتی ہے۔ لیکن جو شیرہ ترکانہ دوشیزہ پنڈی کا ہے وہ اس عروس ہزار داماد کا نہیں " بسلامت روی صہ۲۱

اب جہاز پر سوار ہوئے ہیں تو ائرہوسٹس کی قسموں کے بارے میں بھی خان صاحب کی معلومات سے استفادہ کر لیجئے کہ مبادا آپ کو بھی کبھی جہاز میں سفر کرنا پڑے تو سند رہے۔ اور وقت ضرورت کام آئے۔ خانصاحب کا تجزیہ یہ ہے کہ:۔

" ..... ہوسٹس دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ارضی و سماوی۔ ارضی یعنی گراؤنڈ ہوسٹسیں نمازی شکل و صورت کی ہوتی ہیں۔ یعنی نماز پڑھیں نہ پڑھیں پرہیزگار لگتی ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے دل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ دنیا فانی معلوم ہوتی ہے اور ان کی صحبت میں ہوائی جہاز کے بجائے نزدیک ترین مسجد کو بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ سماوی ہوسٹسیں ہوائی جہاز میں پائی جاتی ہیں۔ اور ان کی تاثیر بالکل مختلف ہے، ان کی ہمسفری سے یادِ الٰہی میں تو نمایاں کمی آ جاتی ہے۔ البتہ ان کے قرب سے تولید خون میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے ..... "

(بسلامت روی صہ۲۳)

اس سے پہلے کہ خان صاحب ہمیں اپنے سفرنامے اڑیں یا ارضی ہوسٹسیں " تنگ آمد بجنگ آمد " پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیں۔ آئیے اس پہلو پر بھی غور کر لیں کہ ضلع جہلم کی سنگلاخ اور محمد خانوں سے پُر سرزمین پر پیدا ہونے والے کرنل محمد خان

اپنی تمام تر کرنیلی اور خانیت کے باوصف مسکراہٹوں کے چمن کھلانے میں کیوں اور کس طرح کامیاب ہوئے۔ اس پہلو پر "بجنگ آمد" کے دیباچے میں "عناصرِ ناخن" کے عنوان سے سید ضمیر جعفری صاحب نے اچھی روشنی ڈالی ہے۔ جعفری صاحب کے الفاظ میں:

"...... ماحول یا ورثہ کے اعتبار سے محمد خان کے "ادیب" بننے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مگر وہ جو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی۔ تو ہمارے دوست محمد خان کی شخصیت کی تشکیل کو فطرت کی حنا بندی کا معجزہ سمجھنا چاہیئے...:

(مقدمہ بجنگ آمد)

جعفری صاحب ان کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں

"...... چنانچہ ان کی ذات میں دو الگ الگ لیکن اپنی جگہ بھرپور شخصیتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہی ہل اور تلوار والا محمد خان، کم سخن ...... کم آمیز ...... نہ ادائے کافرانہ، نہ تراش آذرانہ ......
کھیت میں جُت جائے تو چٹانوں سے جوئے شیر کھینچ لائے۔ تلوار اٹھا لے تو ممنگوں کے نشیمن تہ و بالا کر دے، وطن کا مان، ملت کی آبرو۔ دوسرا محمد خان وہ ہے جو نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو چمن مشرب، بہار ایجاد ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں محمد خان ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کو کمک پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کی جڑیں ایک ہی مٹی میں پیوست ہیں ..... دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو علاقہ دھنی کا یہ نیم لیفٹین اپنی روایات کے مطابق فوج کی صفوں میں شامل ہو گیا۔ لیکن یونیورسٹی کی اپنی تمامتر تعلیم کے باوجود ہنوز ہل اور تلوار والا محمد خان ہی تھا۔ ایک مدت تک بصرہ، شام، بغداد اور قاہرہ وغیرہ گھومنے کے بعد جب وہ اپنے وطن واپس آیا تو محمد خان کے جسم پر تمغوں کی قطار بھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سپاہیانہ صلابت کا وقار اور بانکپن روشن تھا۔ یہ وہ محمد خان تھا جو اب کرنیلی کی وردی میں نظر آتا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں اس کے اندر ادیب محمد خان بیدار ہو کر بالغ ہو چکا تھا۔ ادیب محمد خان الف لیلا کی

لکھنؤ اور مصر کے بازاروں اور شام و کیارہ کے صحراؤں سے ایک بھرپور
سانولی سلونی اجنبی زندگی کے موتی رول دیا تھا۔ خواب، رنگ، روشنیاں
ستارے اور مسکراہٹیں ایک سیلاب بہار جس میں:

رند جو ظرف اُٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

(مقدمہ بجنگ آمد)

اس میں کوئی شک نہیں کہ کرنل محمد خان کے قلم نے اردو ادب کو مزاح کے ایک بالکل نئے افق کی کشادہ فضا اور تازہ ہوا سے روشناس کیا ہے۔ کرنل محمد خان کو ظرافت تک پہنچنے کے لئے کسی تمہید کا پُل نہیں باندھنا پڑتا۔ اور نہ وہ قہقہوں کے جزیرے آباد کرتے ہیں۔ اور نہ واقعات کی گردن میں لطیفوں کی گھنٹیاں آویزاں کرتے ہیں بلکہ ان کا لطیف اور لچکیلا مزاج انکے اسلوب تحریر کا بنیادی لاینفک ہے، ان کے نقطۂ نظر کی پیداوار ہے، ان کی ظرافت کی دلآویزی خیاباں میں ملتی، مسکراتی، گنگناتی ہوئی ندی کی طرح بہتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اور اپنے بہاؤ کے طلسم میں کناروں کو بھی اپنے ساتھ بہائے جاتی ہے۔ خان صاحب کے اسلوب نگارش کے بہاؤ کا طلسم لفظی بازی گری سے عبارت نہیں، بلکہ ایک ایسا ہی دلنشین اسلوب ہے جو مشاہدے، مطالعے، تجربے اور احساس کی شدت و لطافت سے وجود میں آتا ہے۔ دیکھئے ایک مخصوص قوم کے مزاج اور عادتوں پر کس انداز سے تبصرہ فرماتے ہیں۔

"...... اگر غالب انگلستان کا چکر لگا آتے تو کبھی کوہکن کو یہ طعنہ نہ دیتے کہ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا۔ بیچارہ فرہاد تو فقط تیشہ بغیر نہ مر سکا
تھا۔ انگریز تیشہ کھانے کے بعد بھی اس وقت تک نہیں مرتا جب تک ٹائی
نہ لگا لے۔ اور ملک الموت کے نام کا تعارفی کارڈ حاصل نہ کر لے۔۔"

(بسلامت روی ص ۱۲۶)

خان صاحب کے فن کی جڑیں سماج میں دور تک اُترتی چلی گئی ہیں اور جب کسی فن کار کا مشاہدہ سماجی زندگی کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا ہے تو دیکھئے دیکھئے کیسے کیسے موتی رول لاتا ہے۔ ان اَن گنت موتیوں میں سے خان صاحب کا چنا ہوا موتی آپ بھی پرکھئے۔ فرماتے ہیں

"..... ہر گھر کا ایک ماحول ہوتا ہے جو سیتھے یا مچھر ہر یا یوں کہئے کہ
جنت اور جہنم مختلف مقداروں سے ترکیب پاتا ہے۔ مبارک ہیں وہ گھر
جن میں جنت کا عنصر غالب ہوتا ہے، لیکن خرابی یہ ہے کہ ایسے مبارک
گھر بہت کم ہوتے ہیں۔ اکثر گھر کیمیائی تجزیہ پر جہنم کے جراثیم کا بڑا

منشیات رسی ایکشن دیتے ہیں۔ ایسے گھروں میں مہمان کے آنے پر کچھ اس قسم کی افراتفری مچتی ہے جیسے ہوائی حملہ ہو گیا ہو۔ کئی گھروں میں میزبان کو تکلف سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بیچ میں کچن سے ہوتے شیر گھود کر ڈرائینگ روم میں لائی جا رہی ہے اور اسی راستے سے کھانے کے کمرے تک جائیگی۔۔۔"

(بسلامت روی صفحہ ۲۰۵)

لذت بیان کے ساتھ اگر فکر کی گہرائی اور سوچ کی بلند سطح بھی موجود ہو تو لذت برائے لذت نہیں رہ جاتی بلکہ حکمت کے ان تحفوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہو جاتی ہے جو ہر ایسے غیرے کی گردن میں آویزاں نہیں کیے جا سکتے۔ کرنل محمد خان کی تحریروں میں سلاست و شگفتگی کے ساتھ فکر کی وہ حکیمانہ گہرائی پائی جاتی ہے جو بوجھل و دانشورانہ نہ ہو کر فرحت افزا اور معلومات بخش کہی جا سکے ایک مثال دیکھیے کہتے ہیں ۔

"۔۔۔۔۔ ہمارا تجربہ ہے کہ زندگی کا لطف تماشا بن کر نہیں تماشائی بن کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مرکز توجہ بننے کے لئے یا تو بہت بڑے کردار کی ضرورت ہے یا بہت بڑے مداری بن کی ۔۔۔۔۔

(بسلامت روی صفحہ ۱۱۳)

ایک مختصر سی مثال اور۔

"۔۔۔۔ جنگ میں زخمیوں اور مردوں کی تعداد کا بڑی احتیاط سے ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ لیکن ان دلوں کا شمار نہیں کیا جاتا جو طویل جدائیوں اور ازلی شلث کے کرشموں کی وجہ سے ٹوٹتے ہیں۔

(بسلامت روی صفحہ ۱۹۰)

اعلیٰ اور سچے فنکار کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ آشوب آگہی میں مبتلا نہ ہو کر خود شناس اور اسلوبیاتی تہداری کا حامل ہوتا ہے اور معمولی سے معمولی بات یا واقعہ اس کے قلم سے نکل کر فن پارے میں ڈھل جاتا ہے کرنل محمد خان کے ہاں یہ سارے عناصر اپنی اعلیٰ حالت میں موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے یہ ایک فوجی کرنیل کے بنگلے کا بیان اور پیرایہ بیان ہے۔

"۔۔۔۔ الغرض ہمارے بنگلے کا مزاج ہر زاویے سے امیرانہ تھا مقابلہ میں ہمارے اثاثہ کے تیور ہر چند کہ خاکسارانہ تھے تاہم اپنے مکان کی شان کے پیش نظر ہم نے جوں توں کر کے ہر کمرے کیلئے ایک قالین یا دری پیدا کر لی۔ ہر چند کہ ان کا ۔۔ غیر کا ۔ بیشتر ادھر مقامی کبڑیے

کو ملا۔ علاوہ بریں مناسب فرنیچر بھی حاصل کرلیا۔ کھانے کے کمرے میں کرایہ کا ریفریجریٹر بھی رکھ دیا۔ جو خریدے ہوئے ریفریجریٹروں سے کسی طرح مختلف نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ ضعف پیری سے اس کا ذوقِ برودت کسی قدر سست ہوگیا تھا اور شاید اسی لئے مدی کو ذرا تیزی میں پڑھتا تھا۔ بہرحال یہ ہمارا اور ریفریجریٹر کا اندرونی معاملہ تھا۔ شہر میں ٹیلی ویژن آیا تو ہم ایک ٹیلی ویژن سیٹ بھی لے آئے جسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ قسطوں پر خرید اگیا ہے۔ الغرض ہمیں تو نہیں ہمارے ملنے والوں کو ہماری فارغ البالی کا رشک اور احساس ہوتا تھا۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے اس احساس کے پیچھے بقول ڈاکٹر محمد حسن کیسی خود شناسی، کیسا کرب آمیز مزاح اور کیسی اسلوبیاتی تہداری پوشیدہ ہے اور تحریر کی یہ اسلوبیاتی تہداری اور اندازِ نظر کی یہی بوقلمونی، احساس کی یہی رنگارنگی، فکر کی گہرائی اور بیان کی یہی لطافت اور شائستگی کرنل محمد خان کو اچھا بڑا، قابلِ توجہ فنکار بناتی ہے اور ان کی تحریروں کے پیشِ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے ہمعصر مزاح نگاروں میں کرنل محمد خان بہتوں سے آگے ہیں۔

شفقت آرا

"غم رائیگاں"

ایک ذاتی تاثر

بات تو بڑی مشکل ہے کہ منصور صاحب کی شاعری پر تبصرہ کیا جائے۔ اس لئے کہ میں نہ تو تبصرہ نگار ہوں اور نہ فن شاعری
میرا کوئی سروکار۔ میرا اگر شاعری سے کوئی واسطہ ہے تو صرف پڑھنے کی حد تک۔ اور میرا خیال ہے کہ ایک اوسط ذہانت
ص بھی شاعری سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ شاعری حساس دلوں کو چھوتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو آخر احساس
ذہانت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

بہر حال میں جو کچھ کہوں گی اسے نہ تبصرہ سمجھا جائے نہ تنقید وہ صرف میرا ذاتی تاثر ہے۔

میں منصور صاحب کو ایک اچھے پرنسپل، اچھے انسان، ایک عاشق قائد اعظم و شیدائے اقبال کی حیثیت ہی سے
تی تھی، اور یقیناً علم کے اس بحر ذخار سے متاثر تھی۔ مگر جب معلوم ہوا کہ موصوف شاعری بھی کرتے ہیں تو خوشگوار
حیرت ہوئی۔ پھر گاہے گاہے چند ادبی نشستوں میں تبرک کے طور پر کلام سننے کو ملا۔ مگر زیادہ موقع نہ مل سکا شاید
سلسلے میں منصور صاحب عام شاعروں کے برعکس کچھ زیادہ ہی گریز پسند واقع ہوئے ہیں۔ اس سے برعکس صورت
یک مثال پیش کرتی ہوں۔ میں نے حال ہی میں اے حمید کی ایک خوبصورت کتاب پڑھی ہے۔ اس میں ایک مشہور
ر کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دن ہم کافی ہاؤس گئے۔ ان شاعر صاحب نے اپنا کلام سنا سنا کر لوگوں کو بے حال کر
قدرت خدا کی اچانک بجلی چلی گئی۔ شاعر صاحب نے ماچس کی تیلیاں جلا جلا کر شعر پڑھنے شروع کر دیئے۔ کافی دیر
د بجلی آئی تو انہوں نے دیکھا کہ محفل میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ خیر یہ واقعہ تو یونہی برسبیل تذکرہ زبان قلم
یا۔ کہنا یہ چاہتی ہوں کہ جب منصور صاحب کی خوبصورت کتاب ہاتھ میں آئی تو بہت خوشی ہوئی۔ چند غزلیں
ھنے کے بعد بے اختیار منہ سے نکلا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مجھے شام کا وقت بہت پسند ہے۔ شاید اس کی خاموشی، شاید اس کی اداسی یا شاید اس کی پُر اسراریت۔ مگر ہمیشہ

یہ حقیقت میری کمزوری رہا ہے۔ اس دن بھی شام ہی کا وقت تھا کہ ظلم رائیگاں کے پردے سے اُداس اُداس روشنی چھن چھن کر فضا میں اور اُداسیاں گھولنے لگی۔ سچ کہتے ہیں پروفیسر محمود کنور صاحب کہ ان کے یہاں غم کی چلچلاتی دھوپ نہیں ہے۔ دکھ کی اُداس گہری شام ہے۔ جہاں ہم تمام خوشیاں بھول کر کچھ لمحوں کے لئے اُداس ہو جانا چاہتے ہیں۔ شاید اسی لئے منصور صاحب کی شاعری میرے دل کو چھوتی چلی گئی اور بعض اشعار تو دل کے اندر پیوست ہو گئے شاعری کا سوز اس کی جان ہے۔ یہ سوز ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ کتاب جناب منصور صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کی بھرپور شہادت دیتی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ کتاب میرے لئے ایک نئے جمالیاتی تجربے کی حیثیت رکھتی ہے ان کی شاعری میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی اور یہ یقیناً شدتِ احساس کا معجزہ ہے۔ مگر اس کے باوجود جذبات کی میانہ روی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سنئے وہ کیا کہتے ہیں۔

بڑی آس لے کے جو آئے تھے وہ لہو میں یوں تو نہا چلے
مگر ایک رنگ جما چلے، تیری انجمن کو رُلا چلے

یہ شعر بھی سنئے

دھیمی ہو جو آواز تو ہوتی ہے دل آویز
احساس کا اظہار بھی کلیوں کی چٹک ہے

شاعری کا یقیناً کوئی نہ کوئی پس منظر ہوتا ہے۔ یعنی شاعر کسی تجربے سے گزر کر ہی شاعر بن سکتا ہے۔ اس کے بغیر اگر کوئی شاعر بن بھی جائے تو اس میں جذبے کی دل آویزی پیدا ہونا ممکن نہیں۔ وہ بجا فرماتے ہیں۔

الفاظ سے آتی نہیں تاثیر غزل میں
یہ دل کی ہے بو باس یہ سینے کی کھٹک ہے

غم تو یقیناً ان کا اپنا ہے۔ مگر کیا خوبصورت اندازِ بیان ہے کہ بقول غالب

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ آشنائے غم ہیں اور انہیں یہ غم قبول ہیں۔ اس لئے کہ ان کا اصولِ زندگی، زندگی سے محبت ہے، جو غموں کے باوصف سراپا حسن ہے۔ ؎

غم ملے ہیں مجھ کو دنیا سے ملیں گے اور بھی
پھر بھی میرا دل یہ کہتا ہے کہ دنیا حسن ہے

منصور صاحب کے یہاں الفاظ کا چناؤ ایسا ہے جو تصویری اور صوتی کیفیتوں کے حامل ہیں۔ ان کے شعول

سادگی اور معصومیت ہے مثلاً ملاحظہ کیجئے۔

ہوئے اُداس سر رہگذر جا بیٹھے
کوئی تو بات فقیروں کے اختیار میں ہے

کیا سادگی سے فرماتے ہیں۔

میں جاؤں تیری بزم سے کس کام کے لئے
مجھ کو سوا تیرے دید کوئی کام بھی تو ہو

اشعار میں جذبات کی پاکیزگی اور خلوص کی آب وتاب بہت نمایاں ہے۔ اگر شباب کی کیفیت کا کچھ حصہ ہے تو پس منظر میں ہے۔

زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں اور یقیناً پُر تاثیر ہیں۔ اشعار بظاہر بہت سادہ ہیں۔ مگر اس سادگی کے باوجود اظہار و ابلاغ کا کمال، درجہ کمال پر نظر آتا ہے۔ فصاحت کا اعلیٰ معیار قائم رہتا ہے۔ رنگینیٔ مضمون کی بھی کمی نہیں۔ تخیل و وجدان کی برق وش روشنی ہی میں یہ خوبصورت اور پُر تاثیر اشعار تخلیق کئے جا سکتے ہیں۔

کچھ لوگ گئے ہیں جو پلٹ کر نہیں آئے
آؤ نہ چلیں دیکھئے رستہ تو یہی ہے

منصور صاحب ضبط اور بُردباری پر ایمان رکھتے ہیں

سب ہیں مظلوم اور سب ظالم
کس سے کس کا گلہ کرے کوئی

یا

اُن سے ملنے دیا نہ دنیا نے
ان کو دل سے جدا کرے کوئی

ان کی شاعری میں درد بھی ہے، سوز اور گداز بھی۔ حرماں کا تاثر بھی ہے۔ مگر اس حرماں نصیبی یا محرومی میں ایک عجیب لذت ہے۔

بات جاتی ہے کہنے سے
اور کہنے کو بات ہی کیا ہے

منصور صاحب کے زیادہ تر اشعار کسی سدا سلگتے رہنے والے غم کو آشکارا کرتے ہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ ان غم انگیز اشعار کو پڑھ کر طبیعت کند نہیں ہوتی۔ ان کا غم کچھ پُر لطف و پُر کیف معلوم ہوتا ہے ان کے غم میں شریک ہونے کو جی چاہتا ہے۔ اور کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ ان کا غم ہمارا غم ہے۔ اور وہ ہمارے

غم میں اپنے مزاج کے مطابق پورے خلوص سے شامل ہیں۔ یوں کہیے ان کی شاعری سب غم پسند انسانوں کی شاعری ہے ان کا اندازِ بیان منفرد ہے۔ وہ ہجوم میں گم ہو کر خود کو کھونا نہیں چاہتے۔ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے کھلے بندوں اعلان کرتے ہیں۔

شامل نہ اس میں ہوئیے اک بھیڑ جانئے

انبوہِ عام بہرِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

میں نے جو کچھ محسوس کیا کہہ دیا۔ شاید میں نے یہ بھی غلط ہی کہا ہے، کیونکہ میرے قلم کی گرفت میں وہ خوبصورت احساس نہیں آسکا ہے جو منصور صاحب کو پڑھ کر میرے دل میں جاگزیں ہوا۔ بس اب یہی کہوں گی کہ شاید مجھے بھی اس کتاب کا مدت سے انتظار تھا۔ کتاب پڑھنے والا نہ جانے کب سے کسی پسند آنے والی کتاب کا منتظر ہوتا ہے جب کوئی ایسی کتاب اچانک سامنے آتی ہے تو دل کے سارے تار تھرتھرانے لگتے ہیں کہ ہائیں، یہ کتاب کہاں چھپی رہی، مجھے تو اسی کا انتظار تھا۔ غمِ رائیگاں سب غم پسندوں اور سب زندگی سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک ایسی ہی کتاب ہے یہ دو متضاد کیفیتیں اس کتاب میں رل مل کر یک جان ہو گئی ہیں۔ اس کتاب کا ایک پیغام ہے جس کی روح اس شعر میں پوری طرح جلوہ گر ہے ؎ آنکھوں میں ایک اشک بھی چمکے نہ رات کو

اتنا بھی زندگی میں اندھیرا نہ کیجئے

پروفیسر نجمی صدیقی
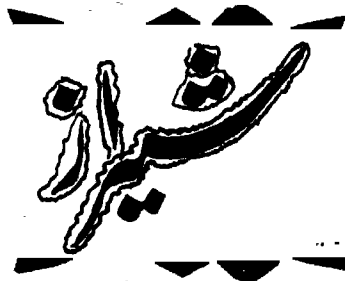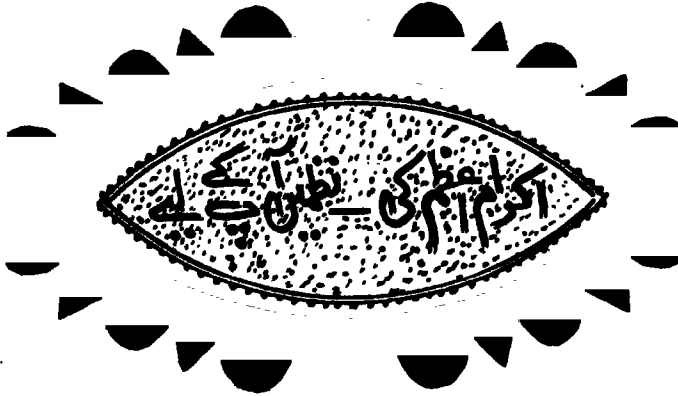
دُنیا کی تمام چھوٹی بڑی زبانیں اصل میں ظروف ہیں جن میں انسانی روح کا مَن وسلوا کم یا زیادہ مقدار میں ضرور موجو
یتا ہے۔ اور اُس کی گونج بعض اوقات صدیوں تک مسلسل سنائی دیتی رہتی ہے۔ اس کی تازگی میں وقت کے گزرنے
ے باوجود کوئی کمی نہیں آتی۔ خالی برتن کو اگر کوئی چٹکی سے بجا بھی دے تو وُہ صرف اُس وقت تک بجتا رہے گا جب
ک کوئی اُس پر اپنا ہاتھ نہ رکھ دے۔ انسانی زبانوں کے ظروف خالی نہیں وُہ اپنے اندر بے پناہ مواد لیے ہوئے ہیں
ا کی پہچان صرف اُس وقت ہوتی ہے جب ہم ایسے فن پاروں سے دوچار ہوتے ہیں جو لباس میں ایک دوسرے سے
لف مگر پیکر ایک جیسے لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ذیل میں درج اشعار گو مختلف زبانوں میں کہے گئے ہیں مگر ان میں جو مضمو
ن ہوا ہے ایک ہے۔

خاصاں دی گل عاماں اگے نئیں مناسب کرنی
مِٹھی کھیر پکا محمد کُتیاں اگے دھرنی

میاں محمد بخش

Strange fits of Passion Have I Known
And I will dare to Tell,
But in the Lover's ear alone.

William Wordsworth

نہیں ملتا کوئی محرم جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

الطاف حسین حالی

سینہ خواہم شرح شرح از فراق
تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

مولانا رومؔ

ہم دیکھتے ہیں کہ ان مختلف اشعار میں مفہوم کا شہد اور مضمون کا رس ایک ہے۔ یہ کیفیت جہاں بھی موجود اور جن حالات میں دستیاب ہو انسانی نسل کی میراث ہے اور اس کا حصول طلب کی معراج۔ پیاسے کو پانی ملے تو اسے بھی پی لیتا ہے۔ پیاسا رہنا مگر مٹی کے آبخورے سے پانی نہ پینا اپنے وسائل کو محدود کر لینے کے مترادف ہے۔ شا اسی وجہ سے اکرام اعظم نے اپنی علاقائی یا مشرقی زبانوں کی بجائے انگریزی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ میرے خ میں اُسے ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا وجہ یہ ہے کہ اُس کے کلام کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس کرتے میں زیادہ دیر نہیں گ وہ انگریزی زبان کا مزاج دان ہے۔

اکرام اعظم اور انگریزی زبان کا ساتھ کسی طرح بھی ناجنس کا ساتھ نہیں لگتا۔ اور جہاں تک اُس کے مطالب کا ت ہے، وہ شہد کی ایسی بوندیں ہیں جن کے ذائقہ پر زبان کے ظرف کا اثر اتنا ہی ہے جتنا کسی شخصیت پر اُس کے لباس کا۔

اکرام اعظم کی ہر سانس شاعری ہے۔ وہ اپنے مطالب کو جو لباس بھی پہنا دیتا ہے جچتا ہے۔ اُس کی رباعیا ہی کو لیجیے جو ایسے آبگینے ہیں جن کی چمک قاری کے ذہن میں مطالب کی چکا چوند پیدا کر دیتی ہے۔ اکرام اعظم کے کلام "Poems for you" کے شروع میں اُس کی "رباعیات" ہیں اُس نے ان مختصر نظموں کو رباعیات کا نا اس لیے دیا ہے کہ وہ چار چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ اُردو، فارسی شاعری میں تو رباعی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو د اصناف سے الگ ایک ڈھنگ اور آہنگ کے علاوہ اوزان بھی مخصوص رکھتی ہے۔ رباعی کے چار مصرعے مختلف میں بھی ہو سکتے ہیں۔

اساتذہ نے رباعی کے چوبیس اوزان قائم کئے ہیں۔ ان میں سے بارہ "مفعول" سے شروع ہوتے ہیں جنہیں ا کہتے ہیں۔ اور "مفعولن" سے شروع ہونے والوں کو "اخرم"۔ انگریزی میں ایسی نظمیں ملتی ہیں، جو کئی قطعہ بندوں پر ہیں۔ شیلے کی ایک مشہور نظم "Hellas" کا ایک بند یوں ہے۔

Worlds on worlds are rolling ever

From creation to decay,
Like the bubbles on a river,
Sparkling bursting leave away.

اس میں قوافی بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ پہلی اور تیسری لائن ہم قافیہ ہیں جبکہ دوسری اور چوتھی ہم قافیہ ہیں۔ ہر لائن کے سات سات "syllables" ہیں اور چاروں مصرع ہم وزن ہیں۔ اس طرح Shakespeare کے اس شعر کے دونوں مصرع ہم وزن ہیں اور مقفٰی بھی۔

Imperious Caesar, dead and turned to clay
Might stop a hole to keep the wind away.

بہرحال رباعی کا فن اور مزاج خالصتاً مشرقی ہے مغربی ادب میں اس کا تصور تک موجود نہیں۔ اکرام اعظم کی رباعیات اپنی نوعیت میں نئی چیز ہیں۔ اُس کی رباعیات اور نظموں میں کوئی Rhyme سکیم نہیں اور مصرعوں کے اوزان مقرر نہیں۔ اکرام نے (Free verse) نظم آزاد کو اپنے لیے متبادل خیال کیا ہے اور وہ اس میں اپنے فن کی بلندی پر دکھائی دیتا ہے۔ اُس نے ردم (Rhythm) کو اس عمدگی سے نبھایا ہے کہ ہر نظم کو پڑھتے ہوئے موسیقیت کا لطیف احساس ہوتا ہے۔ معنا ئیم ذہن کو روشنی دیتے ہیں اور ردم قاری کی جمالیاتی حس کو محظوظ کرتے ہوئے ذہن کی تہوں میں جذب ہوتا چلا جاتا ہے۔ اکرام اعظم نے رباعیات کو عنوانات بھی دیئے ہیں جن سے اُن کے مطالب اور زیادہ واضح ہو گئے ہیں۔

Unfulfilled

What if we live or die
Quite unfulfilled
How many are there at all
Whose dreams come true?

زندگی میں خواہشیں ہمیشہ خاطر خواہ طریقہ سے پوری نہیں ہوتی ہیں۔ اور ہم اس محرومی میں اُسی کے ساتھ ہیں۔

Change

We may despair a million times
That we will not change
The truth is
All else changes, save constant change

"ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"

Ignorance

How little we know of ourselves
How less self mastered
Then why be blamed for the human
psycho - chemistry
that no man knows too well so far?

ہماری ذات میں ایک ناقابلِ پیمائش گہرائی موجود ہے جس کا عرفان انسانی بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے اکثر اعمال کی نفسیاتی تحریکات سے نا آشنا ہی رہتے ہیں۔

Inscrutable

When we have such scant knowledge of
or control over ourselves
How can we hope to tame others or
taunt - life or fate
or know His ways?

اکرام اعظم کی شاعری اس کی شخصیت سے منعکس ہوتی ہوئی زندگی ہے۔ اس کے اشعار اکثر تخیل کی عمد پیش کرتے ہیں۔ اس نے "The crucifix" میں حضرت عیسیٰ کی مصلوب شبیہ کے حوالے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا اعتراف کرنے سے ہمارے جسم و جان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا مجرم بھی اپنے آپ کو الزام نہیں دیتا۔ جرائم پیشہ جو اپنے کئے کی لمبی سزائیں بھگت رہے ہیں پرچھنے پر اپنے آپ کو بے گناہ اور معصوم ہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس طرح جن کی بے راہ غلط کاریوں کے نتیجہ میں "عیسیٰ" مصلوب ہوتے رہتے ہیں اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے۔

The crucifix

Whose is that halter?
I had only helped to raise the scaffold!
For whom is the crown of thorns?
We had only hewn the crucifix!

کوئی تختۂ دار ہم نے نہیں تیار کیا اور نہ ہی اس میں مدد کی لیکن اُس کو تیار ہوتے ہوئے خاموشی سے دیکھتے، بھی تو قابلِ معافی نہیں۔ کانٹوں کے تاج اور صلیبوں کی تراش و تعمیر کسی کے لیے ہی کیوں نہ ہو ہم غیر ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ ہر خاموشی معصومیت نہیں ہوتی اور اگر کچھ کرنا جرم ہوتا ہے تو بعض حالات میں کچھ نہ کرنا بھی جرم ہوتا ہے۔ کچھ غیر شعوری حرکات بھی ہمیں انفرادی نہیں تو بہت سے اجتماعی جرائم میں ملوث کر دیتی ہیں۔ لیکن اس کا اعتراف کڑوا گھونٹ ہے۔ جسے نگلنا بڑی جسارت کا کام ہے۔

اکرام اعظم کی نظمیں ایسی پہلو دار سطح رکھتی ہیں۔ جن سے وہ ثقافت روایات، ذوق اور اقدار مترشح ہوتی ہیں جن کے درمیان وہ اپنے فن کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف ہے۔ اُس کی نظمیں ایسے پھول ہیں جن میں باغیچہ کی خوشبو اور ایسے پھولوں کے پاکیزہ رنگ ہیں جو مشرقین و مغربین میں ہمیشہ پائے جاتے ہیں۔ اُس کے اشعار اُس کے دل کی دھڑکن کے موتی ہیں جو اُس کی خاموشیوں نے رو لے ہیں۔ اور ہمارے لیے یکجا کر دیئے ہیں۔ اُس کی معصوم دعا کی تہہ میں پاکیزہ جذبات کی لطیف سرسراہٹ موجود ہے۔

God

If we are as helpless as we are
At our own hands and each other's
Why not to make peace with our lot
And submit to Him alone?

"So Many Mes" ایک ایسا نفسیاتی تجربہ اور احساسِ محبت لئے ہوئے ہے جس کی تشریح پھول کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اُس کی نازک پتیوں کو مسل کر بکھیر دینے کے مترادف ہے۔

Sometimes I think we are as many mes
As moments in infinity as thoughts in the mind —
—— And to know the rest will take many
more lives
—— Even so
I'd love all the you in you
With or without knowing them!

جذبۂ محبت اور محبوب کے ساتھ تعلق کی جن اتھاہ گہرائیوں کی طرف لطیف اشارہ ان سطور میں موجود ہے محض یا
نہ ہی محض بیانیہ انداز میں اظہار پا سکتا تھا۔ اکرام نے یہاں ایک ایسے داخلی احساس کا اظہار کیا ہے جو محسوس تو کیا
مگر اس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

اس طرح اُس کی "Mekkah - Madina Meditations" ایک ایسی نظم
میں اکرام نے اپنی عقیدت کے پھول کھلائے ہیں۔ اُس کی نظموں کی ابتدا ہی کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ پڑھنے
کا وجدان اُس کی لذت اور نفسِ مضمون کے تقدس میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

> Here at the House of God
> There at His prophet - Muhammad's
> Where sinner and saint alike and
> humanity itself
> Converge from all over the world -
> seeking forgiveness, salvation and new life -

نظم کی آخری سطور میں ایک بے بسی ایک اُمید اور یقین بھری التجا ہے جو دل کی گہرائیوں کی خبر لاتی ہے۔

> O Prophet !
> Come to our rescue, grant us sanctuary
> Or we are doomed for good !
> Come Light ! Come Life !
> Succour and sustain humanity !

اکرام اعظم کی نظموں کے مفاہیم و مطالب کے مناظر گہرے ہیں اور اُن کی خاموش تہہ میں them
کا چاپ ایک دل گداز نغمگی لئے ہوئے ہمارے دل کی دھڑکن میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ ہم شاعر کے ذہن کے کینوس
جمالیاتی ہیولے اور شاعرانہ تخیل کی بنتی سنورتی تصویریں دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ اکرام اعظم کی شاعری جمالیاتی خطوط
تاثرات کے ساتھ ساتھ بھرپور داخلی اور خارجی تجربات کا مجموعہ ہے اُس کی نظموں میں قافیہ اور ردیف کا التزام
رکھا گیا لیکن یہ کمی کسی وقت بھی واضح طور پر محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ "Rhythm" کی جھنکار اور مطالب
ندرت اور ہمہ گیری قاری کے ذہن کو کسی دوسری طرف جانے ہی نہیں دیتے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین

بزم آرائیاں

بزم آرائیاں کرنل محمد خان کی تیسری کتاب ہے۔ کرنل صاحب کی تصنیفات میں کچھ سفرنامے کچھ حیاتنا [illegible] اور کچھ پندنامے قسم کی کیفیات، واقعات اور رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ان کی کتابوں کو پڑھ لینا ان سے [illegible] لینا ہے۔ یوں تو کسی کی بھی کتاب ہو، اس میں مصنف سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی ہے۔ مگر اتنی ذاتی اور قدرے مفق[illegible] شاید ہی کسی مصنف اور بالخصوص مزاح نگار سے اس کی کتاب میں ہوتی ہو۔ جتنی کتابوں کی وساطت سے ان سے [illegible]

کرنل صاحب نے ہر چند دیباچے میں لکھ دیا ہے "میرا نام محمد خان ہے لیکن ادبی حلقوں خصوصاً ناشروں نے میرے عہدے کو بھی میرے نام کا حصہ بنا دیا ہے، تاہم حصہ نام کے طور پر میں اس سے علیحدگی چاہتا ہوں۔ اس[illegible] کے لئے آپ کے تعاون کا خواستگار ہوں۔" لیکن اس کو کیا کہیئے کہ لیڈی الاڈی کی طرح محمد خان صاحب کے نام کا جز ضروری کرنل بن چکا ہے۔ جہاں تک ہم پڑھنے والوں کا تعلق ہے، ہم محمد خان صاحب کے ساتھ ہر طرح تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر — شکایت کے طور پر نہیں بلکہ امر حقیقت کے طور پر — اس اظہار کے لئے مجبور ہیں کہ خود محمد خان صاحب اپنی تحریروں میں ہم سے اس سلسلے میں تعاون نہیں فرماتے۔ عہدے کے یہاں تو خیر افادیت بدلنے نام بھی نہیں ملتی [illegible] بزم آرائیاں کے مصنف کے یہاں کرنل اور محمد خان دونوں برابر ملتے رہتے ہیں۔ مصنف کی تحریروں اور اس کے مزاج کی [illegible] اور کمزوری دونوں اسی ہم رشتگی سے پیدا اور اسی میں پنہاں ہیں۔

کرنل محمد خان کے مزاج میں بے فکری اور فکرمندی دونوں اسی وجہ سے پائی جاتی ہیں۔ بعض باتیں وہ کھل کر کہتے [illegible] اور بعض جگہ خاموشی مصلحت کوشی بن جاتی ہے۔ کرنل صاحب کے مزاج میں جڑواں بچوں کی سی "ہم طبعی" پائی جاتی [illegible] ہے ان کے منصب اور ان کی مزاح نگاری میں خوشگوار تعاون ہے۔ مثال کے طور پر شرابی کبابی، خیالات پریشا[illegible] ضرورت ہے ایک خوشامدی کی، یہ بڑے لوگ، ریٹائرمنٹ کا ذائقہ پڑھ لیجئے۔ مصنف کے نام کے جنہوں کو ملیں گے [illegible] کرنل محمد خان کی تصانیف پڑھ کر ہم انہیں جاننے اور پہچاننے لگتے ہیں، اور ایک خوشگوار تجربہ ہوتا ہے، ایک [illegible]

ملنسار اور با اعتبار آدمی سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ہر قسم کے موضوع پر کھلے دل سے بات کرتے ہیں۔ اس کی باتوں میں داستان سرائی کا انداز ہے۔ فقروں میں ذہانت، جملوں میں تازگی، لہجے میں غمگساری اور اسی کے ساتھ شگفتگی ہے۔ "وہ خوش رہنا اور خوش رکھنا چاہتا ہے"۔ "میری کوشش فقط یہ ہوتی ہے کہ تحریر میں پیوست نہ آنے پائے۔ ہو سکے تو کچھ بشاشت ہو، کچھ شگفتگی ہو، کچھ رونق ہو۔ کچھ بلا گُلا ہو۔ طبعاً میرا جی غم، غلاظت، غبار اور رونے دھونے سے بیزار ہے۔ ایسے مضامین ذہن میں آتے ہیں نہ نوکِ قلم پر۔"

بڑے نیک خیالات ہیں مگر سوال یہ ہے کہ خوش رہنے اور خوش رکھنے کی مہم سر کیسے ہوئی۔ بات شاید اتنی آسان نہیں۔ دورِ حاضر کے مزاح نگار کو آج جس قدر سوچ بچار کی ضرورت ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔ وہ کیا چیز ہے۔ آدمی کے کلیجے کو مسلتی رہتی ہے اور وہ کیا چیز ہے جو آدمی کو اس کے باوجود مسکرانے یا ہنسنے کی توفیق اور توانائی دیتی ہے اور اسے با اخلاق بناتی ہے (اچھی مزاح نگاری کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ پڑھنے والے کو با اخلاق بنائے) جب ہم ایک "وہ" سے دوسرے "وہ" تک کے سفر کے بارے میں غور کریں گے تو چراغ کے جلنے اور روشنی کے چھپنے کا رشتہ شاید کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے۔

کرنل محمد خاں اُدھر نہیں جاتے جدھر غلاظت ہے۔ یہ نفاست کا تقاضا اور ثبوت ہے۔ مگر اور اس کی طرف بھی دھیان دینے میں چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ ممکن ہے اس سے مزاح نگاری میں کچھ اور "جلوہ" پیدا ہو جائے۔ غالباً اسی افتادِ طبع کی وجہ سے "شاعر اور شاعریاں" پر لکھتے ہوئے انہوں نے چند اشعار اپنے مخصوص انداز میں رائے دی ہے۔ جن اشعار کا انہوں نے انتخاب کیا ہے اُن میں کوئی خاص بات نہیں ہے معمولی شعر ہیں، مگر جس انداز سے انہوں نے ان کو تمسخر کا ہدف بنایا ہے وہ مناسب یا غیر مناسب ہونے کی بات نہیں ہے، یہ اندازِ گفتگو برائے گفتگو معلوم ہوتا ہے۔ کرنل صاحب نے یہ اشعار ہمیں سنا دیئے۔ اب ہم انہیں معذرت کے ساتھ یہ اشعار پھر سناتے ہیں۔

دامنِ گل چاک ہے ویراں ہے تزئینِ چمن　　　یہ بہاریں ہیں کہ جن سے دل کو بہلاتے ہیں ہم

دوسرا شعر ہے۔

ابھی تو فصلِ گل کی ابتدا تھی　　　نہ جانے پھول کیوں مرجھا گئے ہیں

اور تیسرا شعر تو ہم سب کو یاد ہوگا۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں　　　تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

کیا یہ اشعار آج کے دور میں کوئی معنویت نہیں رکھتے؟ کسی قسم کی؟ واقعی!!؟ ہر لکھنے والے کی خو مزاح نگار ہو یا طنز نگار، اپنی پسند ہوتی ہے۔ مگر اسے صرف قاری کو اپنی پسند کا اسیر بنانا چاہیئے

مزاح نگار تو بڑے حوصلے کا آدمی ہوتا ہے۔ وہ غیر کو بھی اپنا سمجھتا ہے۔ اپنا بناتا ہے۔ دوستی میں جتنی پاکیزگی ہے اتنی ہی خالص مزاح نگاری میں بھی ہوتی ہے۔ دوستی مشروط نہیں ہوتی۔ مطالبہ نہیں کرتی۔

کرنل محمد خان صاحب بڑے حوصلے کے آدمی ہیں، ان کی تحریر میں کینہ اور کشیدگی نہیں ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ دوستی کے معاملے میں ایک مخصوص حلقے کے قائل ہیں اس حلقے کو توڑ دینے کی ان کے یہاں کوشش بھی ہے مگر بھرپور کوشش نہیں۔ بزم آرائیاں میں صرف ایک مرتبہ وہ کامیاب ہوئے ہیں "قدرِ ایاز" میں محمد خان نے پہلی بار اپنے "کرنل" کو گھیر لیا ہے۔

یہ عجیب مضمون - قدرِ ایاز - قصہ، داستان، افسانہ، حکایت ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ قدرِ ایاز کو کیا نام دیا جائے۔ قدر ایاز آنسو اور تبسم، خاموشی اور تکلم کے درمیان سے گزرتا ہوا، دھیمی، پرسوز، پروقار اور بے ریا انداز میں بتاتا ہے کہ دنیا سے زیادہ دلوں میں گنجائش ہوتی ہے، تہذیب نہ قدیم ہوتی ہے نہ جدید۔ یہ اعتباری پیمانے ہیں۔ پیمانہ صرف آدمی ہے۔ قدر ایاز میں کالوں کے الاؤ اور بنگلوں کے آتشدان ایک ہوگئے ہیں۔ قدر ایاز کے بارے میں صرف سبحان اللہ کہا جاسکتا ہے۔

"بزم آرائیاں" میں کاش اس قسم کی چند اور چیزیں ہوتیں تو ہم ان سے نام کے سلسلے میں آسانی سے تعاون کر لیتے۔ کتاب بہر حال دلچسپ ہے۔ اس کی دلچسپی ایک ایسی چیز ہے جو کتاب پڑھنے کا صلہ بن جاتی ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں کچھ چٹکلے ہیں، اپنے سے، اپنوں سے اور دوسروں سے۔ آخر میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ محمد خان صاحب۔ اگر آپ اس کتاب کو غیر مصنف بن کر پڑھئیے تو آپ مصنف کو ضرور یہ مشورہ دیں گے کہ یہ اس کی آخری کتاب نہیں ہونی چاہیئے۔ خوش طبعی اور دیانتداری کا میل کم ہی پایا جاتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف میں یہ خصوصیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس نے مزاح نگاری میں ایک نوع کی رومانیت بھی داخل کی ہے مگر یہ اس کی اپنی رومانیت ہے۔ اس کے علاوہ جو شخص، تھوڑی ہی سہی، خوشی بانٹنے نکلتا ہے، اسے ہاتھ بھی کھینچ لینا چاہیئے۔ وہ بڑی دولت رکھتا ہے۔ یہ ایک تبسم بھی کیسے ملتا ہے؟

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ)

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

جدید اُردو افسانہ ۔ شہزاد منظر

" جدید اردو افسانہ " شہزاد منظر کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۲ء کے دوران لکھے گئے ۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک حصّہ اردو افسانے میں ترقی پسندی ، جدیدیت اور علامتی رجحانات سے متعلق ہے اور جدید اردو افسانے کی ساخت اور اس کے فنی پہلوؤں سے بحث کرتا ہے ۔ دوسرے حصّے میں جو مضامین ہیں ان کا تعلق گو جدید اردو افسانے سے نہیں لیکن چند اہم افسانہ نگاروں کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ۔ اس کتاب میں پریم چند ، کرشن چندر ، عزیز احمد ، ممتاز شیریں اور ابراہیم جلیس جیسے عظیم قلمکاروں کے بارے میں مضامین شامل ہیں ۔ ان مضامین میں ادیب اور ادب کے بارے میں جتنی تفصیل اور دیانتداری سے بحث کی گئی ہے کسی اور کتاب میں نہیں ملتی ۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۲ء کے دوران لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے اس لئے ادب کے تغیر پذیر رجحانات کی وجہ سے قاری کو اس میں کچھ تضادات ضرور نظر آئیں گے ۔ اس بات کا احساس خود شہزاد منظر کو شدت سے ہے اور شاید اسی لئے لکھتے ہیں " یہ مقالات بیس سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے جدید افسانے کے بارے میں میرے خیالات مختلف اور متضاد نظر آئیں ۔ اسے تضاد کی بجائے فکری تبدیلی سمجھنا درست ہے ۔ انسانی فکر جامد نہیں ہوتی ۔ معاشرے کی طرح انسانی ذہن کا ارتقاء جاری رہتا ہے " جدید اردو افسانے کے مقالات کو پڑھتے وقت قاری کو اس دور میں جھانکنا پڑے گا جس دور میں زیر مطالعہ مقالہ تحریر ہوا اور اس دور میں مروج رجحانات کو بہ وقت دھیان میں رکھنا ہوگا ۔ کتنا ہی بہتر ہوتا کہ شہزاد منظر ہر مضمون کے آخر میں اس کی تحریر کا سن بھی درج کر دیتے ، اس طرح کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا ۔ ان مضامین کو کتابی شکل دیکر شہزاد منظر نے اردو افسانے کے میدان میں تنقید نگاروں کے اس خلاء کو کافی حد تک پُر کر دیا ہے ، جو

وقار عظیم، ڈاکٹر احسن فاروقی اور ممتاز شیریں کے بعد پیدا ہوا۔ وقار عظیم کے بعد اردو افسانے کے بارے میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھا تو گیا مگر اردو افسانے میں جدید رجحانات پر بہت کچھ نہیں لکھا گیا ہو سکتا ہے کہ چند علامتی افسانہ نگار میری اس رائے سے اختلاف کریں کیونکہ میں جدید افسانے کے بارے میں علامت نگاروں کی رائے کو مستند تصور نہیں کرتا۔

اردو افسانے کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ نہیں۔ اس مختصر سے عرصے میں اردو افسانہ کئی تغیرات سے گزرا۔ فرانسیسی حقیقت نگاری کا اثر، ترقی پسندی کا دور، رومانوی تحریک، جدیدیت نگاری اور علامت نگاری وہ رجحانات ہیں جن سے افسانہ دوچار ہوا۔ منٹو کے بعد ترقی پسند تحریک زوال پذیر ہوئی اور جدیدیت کا رجحان ترقی پانے لگا۔ گویا روایتی افسانے سے لے کر علامتی افسانے تک (SYMBOLISM & CONVENTIONALISM تک) ایک سفر ہے جو اردو افسانے نے طے کیا ہے۔ شہزاد منظر نے ان تمام باتوں کو اپنے مقالات میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے چند مضامین مثلاً تجریدی افسانہ، اردو افسانے میں جدیدیت، اردو کا جدید تر افسانہ، اور مختصر افسانے کا زوال اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے قدرِ اول کے مضامین ہیں۔ گو مضامین کا پھیلاؤ زیادہ ہے اور تحقیق بہت گہری نہیں مگر پھر بھی "جدید اردو افسانہ" کے مضامین اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ایک بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ شہزاد منظر نے جدید افسانے کی تنقید لکھتے وقت اس فن کے بارے میں مستند نگاروں (پاکستانی یا مغربی) کے حوالے نہیں دیئے۔ بہتر ہوتا کہ وہ جدید افسانہ نگاروں کی رائے کو QUOTE کرنے کی بجائے اپنی ذاتی رائے سے قاری کو مطلع کرتے۔

کتاب کا دوسرا حصہ جس میں مشہور افسانہ نگاروں کے فن اور فن پاروں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے کم اہم نہیں ہے۔ شہزاد منظر کا کمال یہ ہے کہ زیر بحث افسانہ نگاروں کا نہایت غیر جانبداری سے جائزہ لیا ہے۔ اگر وہ پریم چند، کرشن چندر یا عزیز احمد کو عظیم افسانہ نگار تسلیم کرتا ہے تو ممتاز شیریں کو ایک اعلیٰ افسانہ نگار ماننے کے لئے اسے ایک عظیم تنقید نگار تسلیم کرتا ہے۔ سچ بات کہنا ایک عظیم ادبی جہاد ہے۔ مختصراً جدید اردو افسانہ میں بانیِ پاکستان سے لے کر علامتی افسانے کے آغاز تک یا یوں سمجھ لیجئے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک اردو افسانے نے جتنی کروٹیں لی ہیں شہزاد منظر نے ان کا تجزیہ نہایت عمدہ طریقے سے کیا ہے یہ ان کا منفرد اندازِ بیان ہے جس کی وجہ سے ان کے مقالات میں شگفتگی اور روانی ہے اور قاری بوریت محسوس نہیں کرتا۔ زیر تبصرہ کتاب اردو ادب کے شائقین کے لئے ایک سود مند تحفہ ہے۔ یہ کتاب ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ منظر پبلی کیشنز بلاک نمبر ۱ گلشن بل کراچی نے شائع کی ہے۔ کتاب کی قیمت صرف ۲۵ روپے ہے

طاہر مختار

"نو پوئمز" صلاح الدین پرویز

"نو پوئمز" بادی النظر میں کسی شوقین امیرزادے کی شعر گوئی اور اس کے اظہار کا شاخسانہ محسوس ہوتی ہیں فی الحقیقت ایسا قصہ نہیں۔ یہ نظمیں نئے شعری رویے اور ونڈوم کی شناخت اور اردو نظم کا نیا تناظر کرتی ہیں۔ اس تناظر میں مشرق کی جبلی مگر قدرے مسخ شدہ تہذیب کے نقوش مغرب کی انسان دوستی کے عکس اور اسلامی تمدن کے آثار نمایاں ہیں۔

صلاح الدین پرویز تکنیک، ہئیت اور شعری دروبست کو نئے ذہن کی عینک سے دیکھنا اور برتتا اور اسی طرح جب اپنی معنوی بصیرت کو زبان کے سانچے میں قید ہوتا دیکھتا ہے تو دوسری زبان کے وہ لفظ اور استعارے استعمال کرتا ہے جن کا لمس اور قرب ہمیں بیگانہ نہیں لگتا۔ بظاہر اجنبی لفظ کڈھب بے موقع محسوس ہوتے ہیں، مگر جب آپ اس کی نظموں کی اندرونی روؤں کے ساتھ سفر کریں تو یہ اجنبی دیدہ و دل بھی وا کرتے ہیں اور بانہیں کھول کر استقبال بھی کرتے ہیں۔

آج جبکہ شعری مجموعوں اور شعر کہنے والوں کا حشر بپا ہے، یہ مختصر مجموعہ نئی نظم کے وجود کا انتہا ایک بالکل علیحدہ اسلوب کی شہادت کے طور پر سامنے آیا ہے، صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔

ہم اپنی آنکھیں کتابوں میں رکھ کے بھول گئے
سُنی جو تھاپ تو گھبرا کے چمن سے لوٹ گئے
ہمیں نہ چھیڑو کہ پھر نیند بھی نہ آئے گی
ہمارے جگنے سے آواز لوٹ جائے گی

(قصہ عجیب دنوں کا ص۱۱)

کتاب امریکہ میں چھپے یا منڈو آدم کے معمولی چھاپہ خانے میں، دیکھنا یہ ہے کہ اس میں ہے کیا۔؟ ہمارے ہاں یہ مختصر مگر وقیع مجموعہ اردو نظم کے ترقی پذیر سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے سے شاندار امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

سلطان رشک

"آتے جاتے" (افسانے)، تقی حسین خسرو

"آتے جاتے" تقی حسین خسرو کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں کل پندرہ افسانے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ جیسے ایسی کہانیاں پہلی بار ہی پڑھی ہوں۔ ہر کہانی نیا موضوع، نئی سوچ فکر لئے ہوئے ہے۔ بقول عتیق احمد "وہ اپنی ہر کہانی میں اپنے مخصوص اسلوب کی تازگی کے ساتھ

ب کی روزمرہ کی دیکھی بھالی دنیا سے ایک نئی بات، کچھ نئے تاثرات اور نئے تجربات سے کرا تے ہیں اور ہم چونک
لھتے ہیں کہ اچھا! یہ بھی اسی دنیا کی بات ہے۔ تقی حسین خسرو کے افسانوں میں مخصوص انفرادیت پائی جاتی ہے۔ یہی
ن کی اپنی ادبی شخصیت کی شناخت ہے، اس کتاب کے افسانوں کا مواد آج کے عہد اور ماحول سے لیا گیا ہے
صنف نے بعض ایسی باتوں کو افسانوی رنگ دے دیا ہے جن کے بارے میں لوگ بہت کم سوچتے ہیں۔ ایسے
فسانے پڑھنے کے بعد قاری خود کو ایک نئی دنیا میں محسوس کرتا ہے، حالانکہ اس کا ہمارے اپنے معاشرے اور
ردگرد کے ماحول سے بہت ہی قریبی تعلق ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ سب اس TREATMENT کی وجہ سے
ہے جو تقی حسین خسرو سے مختص ہے۔

"آتے جاتے" کے افسانے وہ تاثر نہیں چھوڑتے جو مصنف اور قاری کو ایک رشتے میں پرو دیتا ہے۔ قاری
ر مصنف کے درمیان فاصلہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ "آتے جاتے" کے موضوعات میں مقصدیت کی پیوندکاری
ہماری رائے میں شعور کی کوشش ہے اور شاید اسی وجہ سے کہیں کہیں REPEATION محسوس ہوتی ہے مگر یہ صرف موضوع
کی ضرورت کے تحت کیا گیا ہے اس سے افسانوں کا مجموعی TOTALITY یا کلیت متاثر نہیں ہوتی افسانوں کا آغاز نہایت عمدہ اور دلچسپ
ہے۔ انہیں یہ قدرت حاصل ہے کہ افسانے کا آغاز جس طرح چاہیں کردیں۔ واقعات کا بیان اس طرح کرتے ہیں
جیسے کوئی کہانی بیان کر رہے ہوں۔ کہیں کہیں طنز سے بھی کام لیا ہے۔ ان افسانوں کے کردار وہ لوگ ہیں جنہوں
نے اپنے اوپر کئی خول چڑھا رکھے ہیں اور جو دولت کے نشے میں اپنی اصلیت بھول جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں
حیرت و استعجاب کا جو پہلو ہے وہ انہیں معاشرے کی پیچیدہ سطح سے نیچے اس کی پاتال تک لے جاتا ہے۔
معاشرے کو سمجھنے اور حقیقت کو آشکارا کرنے کی خواہش ان کے افسانوں سے عیاں ہے۔ یہ کتاب اردو ادب
میں ایک نیا تجربہ ہے اور مفید اضافہ۔

یہ کتاب ادارہ نوائے سروش اے ۱۷ بلاک ۱ شاہ فیصل کالونی کراچی نمبر ۲۵ نے شائع کی ہے۔ ۱۷۶ صفحات کی
کتاب کی قیمت صرف ۲۵ روپے ہے۔

طاہر مختار

اوراق (بہار نمبر)

مدیران : ڈاکٹر وزیر آغا۔ سجاد نقوی

"اوراق" جدید ذہن کی علامت اور فکری تحریک کا استعارہ ہے۔ جس کے عقب میں ڈاکٹر وزیر آغا
کی گمبھیر شخصیت مطالعے کی وسعت، اظہار کی ندرت اور نئے اسلوب کو لے کر موجود ہے۔

ہماری موجودہ صدی ادبی تحریکوں کی صدی ہے۔ لیکن "اوراق" کی اشاعت نے ادب کے ارتقا
اور تحریکات کی رفتار میں اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ اوراق نے جدید ذہن کے ساتھ ساتھ جدید نسل بھی پیدا کی ہے جس
نے دور رس اثرات مرتب کئے ہیں۔

زیرِ نظر شمارے میں عقیدت کے اظہار کے لئے حمد، نعت اور منقبت سے ابتداء کی گئی ہے۔ اس صنف میں محمد ابن الحسن، عبدالعزیز خالد، انجم نیازی اور رفعت سلطان جیسے صاحبِ دل شعراء شریک ہیں۔ "طنزیہ مزاح" کے ذیل میں اکلوتا مضمون ہے جب کہ انشائیوں کی صنف خاصی حوصلہ افزا ہے نظموں اور غزلوں کی فہرست پر نظر ڈالتے ہی قاری کا ذہن مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ برِ صغیر کی علمی و ادبی صورتِ حال سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔

"مقالات" اوراق کا ایک ایسا گوشہ ہے جسے پڑھے بغیر قاری آگے نہیں پڑھ سکتا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا مرزا ہجرت اور جگندر پال کا مضمون "اردو افسانہ" ہندو پاک کی ادبی تحریکوں کے خصوصی حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ تاہم جدید نثر کے مسئلے کے ساتھ جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحریر کیا ہے۔ چند شخصیات پر مضامین مثلاً جعفر طاہر (ڈاکٹر انور سدید) شاد عارفی (ڈاکٹر مظفر حنفی) یلدرم (شمیم حنفی) پر خصوصی مقالے اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ برِ صغیر کے اُن مشاہیر کو بھی یاد رکھا جائے جنہیں لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔

"اوراق" کے افسانے پڑھ کر ایک بات ذہن میں کروٹیں لینے لگتی ہے کہ تہذیبوں کی جغرافیائی حدود ختم ہو رہی ہیں۔ پوری دنیا ایک کلچر کی اکائی میں سمٹ رہی ہے، مگر "اوراق" کا آدرش یہ ہے کہ "فرد" کو سائنس اور غیبات کی جبریت سے نجات دلائی جائے تاکہ "فرد" اقدار کی بنیاد پر زندہ رہے۔ چنانچہ افسانے پڑھ کر فرد کی اہمیت کا احساس بڑھ جاتا ہے اور ایک واضح کلچر بھی اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے، جہاں فرد معاشرے کی قربان گاہ سے الگ اپنی حیثیت میں آپ زندہ ہے۔ اس ضمن میں ممتاز مفتی، رام لعل، غلام الثقلین نقوی، فرما اصغر، مشتاق قمر اور ہرچرن چاولہ کا نام ہی ضمانت کے لئے کافی ہے

رشید نثار

سلطان رشک، پروین میلہ، مسیاں، اور اختر

ہنستے کھیلتے — صحت مند بچے وڈوارڈس "گرائپ واٹر" کی بدولت!
بچہ صحت مند ہو، تو ہمیشہ ہنستا کھیلتا رہتا ہے۔ ہاضمے
کی خرابی، ریاحی درد یا دانت نکلنے کے دنوں میں پیٹ کی
تکلیف جب بچے کو بے چین کر دے تو وڈوارڈس
گرائپ واٹر کا ایک ہی چمچہ، نرمی سے اثر کر کے فوری
آرام لاتا ہے۔
آپ کا جانا پہچانا اور آزمودہ
وڈوارڈس کو ۱۲۰ سال کا تجربہ حاصل ہے۔
ڈبلیو وڈوارڈ (پاکستان) لمیٹڈ
پوسٹ بکس ۷۸۸۶۔ کراچی
IMPORTANT TO MOTHERS

ایس آفتاب
فوڈ پروڈکٹس راولپنڈی پاکستان
کے تیار کردہ انٹرنیشنل مصالحے
استعمال کریں
کھانے میں اعلیٰ ۔ خوش ذائقہ ، اور خوشبودار
انٹرنیشنل مصالحہ جات
سرخ مرچ
ہلدی
دھنیا
کری پوڈر
چاٹ مصالحہ
راولپنڈی اسلام آباد کے لئے
ہمارا نمائندہ ۔ مسٹر گل بہار
ایس آفتاب۔ فوڈ پروڈکٹس
راولپنڈی کینٹ
مسٹر گل بہار

سمرکوئین